بین المذہبی تناظر میں

روحانیت اور حسینیت



تحقیق: عالیہ جواد، مولانا فرحت کاظمی

بین المذہبی تناظر میں

روحانیت اور حسینیت

مصنفین

عالیہ جواد

مولانا فرحت عباس کاظمی

ناشر

سوہنی پبلی کیشنز

کراچی۔لاہور

1689 RAH 900 2021 khi

نام کتاب	....	بین المذہبی تناظر میں روحانیت اور حسینیت
مصنف	....	عالیہ جواد ، مولانا فرحت عباس کاظمی
ناشر	....	سوہنی پبلی کیشنز' کراچی۔ لاہور
اشاعت	....	2021ء (اوّل)
صفحات	....	440
قیمت	....	(پاکستان) 900 روپے
		(بیرون ممالک) 35 امریکی ڈالر

کتاب ملنے کے پتے

قلمکار کلب' پاکستان

اردو بازار' کراچی

تقسیم کار

روبی پبلی کیشنز' الحمد مارکیٹ' اردو بازار' لاہور

ویلکم بک پورٹ' اردو بازار' کراچی

اشرف بک ایجنسی' کمیٹی چوک' راولپنڈی

QCP

Order & Review on Book, mail to:

QALAMKAR_CLUB@YAHOO.COM

فہرست موضوعات

(حصہ دوم: مجالس امام حسینؑ)

انتساب

تعریف ہے اس پاک و پاکیزہ رب کی جو واحد، احد، لم یلد اورلم یولد ہے۔ حضرت محمد صلعم اس کے بندے اور آخری رسول ہیں۔ ان بنیادی کلمات کے بعد ہم اپنی اس ادنیٰ کاوش کو امام العصر جناب ابا صالح عجل اللہ فرجہ، بقیہ اللہ فی الارض کے نام کرتے ہیں، جن کا معطر وجود زمانے کے لئے نعمت اور جن کے ہاتھ زمانے کی مدد کے لئے بلند ہیں۔ ان کے بعد یہ کتاب اپنی قوم کے نوجوانوں کے نام کرتے ہیں جن کی صالح تربیت امام العصر کے مشن میں اولین اہمیت کی حامل ہے۔ ہم خصوصی ذکر کریں گے ان یتیموں کا جن کی کفالت وقت کے امامؑ کے ذمے ہے اور جو عین عرش الٰہی کے سائے میں پروان چڑھ رہے ہیں۔

اظہار تشکر

ہم اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کے شکر گزار ہیں، جس نے ہمیں روحانیت جیسے نازک موضوع پر قلم اٹھانے کی توفیق عطا کی۔ درود وسلام محمدؐ و آل محمدؐ کی ذات پر، جن کی پاک و پاکیزہ تعلیمات انسانوں کی روحانی بالیدگی کا سبب بنیں۔ ہمارا سلام ہو وقت کے امامؑ کے حضور، جن کی ذات گرامی کے بغیر یہ کرہ ارض دوام حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد ہم ان تمام شرکاء کے شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود اس تحقیق میں شمولیت اختیار کی۔

ہم خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں اس تحقیق کے معاونین کا جنھوں نے ہمارا پیغام دیگر افراد تک پہنچایا اور ان کے جوابات ہمیں ارسال کیئے۔ ان معاونین میں معلمہ سیدہ منیبہ بتول، اسسٹنٹ پروفیسر تنظیم اختر اور صفیہ شہر یار کے نام آتے ہیں۔ ہم ان خواتین و حضرات کے بھی خصوصی شکر گزار ہیں جنھوں نے اس تحریر کے پہلے حصے کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس کے متن کی بہتری کے لئے تجاویز پیش کیں۔ آخر الذکر میں محترم ڈاکٹر جاوید اقبال سابق ڈین آف سوشل سائنسز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، اور ہماری ایک عیسائی عزیزہ سابق اسسٹنٹ پروفیسر کے نام آتے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس کتاب پر اپنی آرا سے بھی نوازا۔ وہ پاکستان کے جانے پہچانے پروفیسر اور محقق ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالے قومی اور بین الاقوامی جریدوں کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر آنے والی مشی گان یونیورسٹی کی پی ایچ ڈی ڈگری ہولڈر اور ہائی ایجوکیشن کمیشن اسلام آباد کی سند یافتہ سپر وائزر ہیں۔ انہوں نے کئی ایک پی ایچ ڈی اور ایم فل تھیسز سپر وائز کیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے قومی اور بین الاقوامی کانفرنسز میں شرکت کی اور مختلف جرائد میں تحقیقی مقالے شائع کیئے۔ لیکن بعض ذاتی وجوہات کی بنا پر وہ اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتیں۔

عرض ناشر

ڈاکٹر عالیہ جواد درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ ایک استاد کو اگر مذہب سے لگاؤ ہو تو اس طرز کی شاہکار تحقیق وتحریر وجود میں آتی ہے۔

انہوں نے روحانیت جیسے نازک موضوع پر قلم اٹھانے کی بھرپور کوشش کی اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنے استاد ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کافی عرصہ بے شمار شرکاء کے کے ساتھ اس تحقیق میں گزارا۔

اسلام کی روح کو سمجھنے کے لیے پیغمبر آخرالزماں اور اہل بیت اطہارؑ کی حیاتِ مبارکہ کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ جن کی پاکیزہ تعلیمات انسانوں کی روحانی بالیدگی کا سبب بنیں۔ اس کے لیے ڈاکٹر عالیہ جواد صاحبہ نے مختلف شعبوں اور طرز فکر رکھنے والے لوگوں کے خیالات و مشاہدات جمع کیے اور انہیں ایک مجموعے کی شکل میں پیش کر دیا۔

یقیناً یہ مشکل کام تھا مگر باری تعالیٰ ایسے کاموں کے لیے بندوں کا انتخاب کر ہی لیتا ہے۔ اس کتاب کے متن میں آپ کو ہر جگہ نبی کریم ﷺ اور اہل بیتؑ سے محبت وعقیدت نظر آئے گی۔

صابر علی ہاشمی

ایڈیٹر: ماہنامہ رابطہ

حصہ اول: چھٹی حس اور روحانیت

پہلا باب

تعارف

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے Covid-19 کے دنوں میں لکھی گئی۔ایک ایسا وقت جب انسان اپنی ہی نوع سے خوفزدہ تھا اور عوام گھروں کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وسوسے کوڑیوں کے بھاؤ بکتے تھے، کاروبار معطل تھیا ور اجتماعات پر پابندی تھی۔اُن اداس دنوں میں ہم نے اپنی یاداشتیں تحریر کرنی شروع کیں۔ یوں تو یہ موضوع ایک عرصے سے ذہن میں تھا لیکن اب ذہن کے دریچوں پر رکھی کتاب نے عملی شکل اختیار کرلی۔ گویا کہ انگریزی مقولے "بظاہر نظر آنے والی مصیبت میں چھپی رحمت" کے تحت کورونا-19 کی بیکاری ایک با مقصد مصروفیت میں بدل گئی۔

چوں کہ ہمارا موضوع روحانیت ہے اس لیے ہم عرض کریں گے کہ تمام مذاہب عالم کے مطابق انسانی جسم جدید، جبکہ روح قدیم ہے۔ پاک پروردگار نے عالم لاہوت میں روح کو خلق کیا اور اسے حقیقت سے روشناس کروایا۔ جب اس نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی تو جسم کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے بنایا اور اس کے جسم میں روح پھونکی تا کہ وہ زندہ ہو جائے۔ اس کے بعد اس کو چند کلمات سکھائے تو اس کا مرتبہ فرشتوں سے بالاتر ہو گیا۔فرشتوں نے حکم ربی کے تحت حضرت انسان کو سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جو اپنے گھمنڈ کی وجہ سے راندہ درگاہ ٹھہرا۔اس ملعون نے خدائے بزرگ و برتر سے قیامت تک کے لئے مہلت مانگی تا کہ وہ انسان کو گمراہ کر سکے۔اس کے بعد وہ اسی رب کے در پر بیٹھ گیا۔ارشاد الٰہی ہوا کہ تیرے مذموم ہتھکنڈے میرے نیک بندوں کو صراط مستقیم سے بھٹکا نہ پائیں گے۔اس مہربان رب نے انسان کی رہنمائی کے لئے ایک مکمل نظام قائم کیا جس کے تحت پیغمبران دین، امام، اولیاء، علما اور دیگر صالحین کا انتظام فرمایا۔البتہ ہدایت کے اس سلسلے میں انسانی روح کو ایک درون خانہ رفیق اور رہنما کی حیثیت حاصل ہے۔

جب رب کریم نے حضرت آدمؑ اور اماں حواؑ کو اس وسیع و عریض کرہ ارض پر اتارا تو وہ دو

مختلف سروں پر حیراں پریشاں پھرتے تھے۔اس وقت بھی اس مہربان رب نے انہیں بے یارومددگار نہ چھوڑا۔ بلکہ مادی اور روحانی ساز و سامان کے ایک مکمل بستے سے آراستہ کیا۔ان کی جسمانی طاقت، حسیات، جذبات اور عقل وعلم نے مادی ماحول کو تسخیر کیا، جبکہ گریہ، دعاومناجات نہ صرف روحانی بالیدگی اور اطمینان نفس بلکہ اپنے خالق کے ساتھ قریبی رابطے کا باعث بھی بنے۔ ان کے لئے آسمان سے لے کر زمین تک مددگار فرشتوں کی آمدورفت قائم کی اور آخرکار حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے وحی کا انتظام کیا۔اس کے بعد حضرت آدمؑ کی جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کو اولاد آدم میں منتقل کیا اور انہیں جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی تعلیم دی۔لیکن انسان جلد باز ہے۔اس کے اعمال وافعال اور جذبات کا پلڑا کبھی ایک جانب جھک جاتا ہے اور کبھی دوسری جانب۔یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ میں کبھی روحانی ارتفاع اور کبھی اخلاقی انحطاط کے ادوار آتے رہے۔یادرہے کہ انسانی تاریخ روز اول سے ایک پہیے کی طرح گھومتی رہی ہے۔اسی لئے دور کی اصطلاح رائج ہوئی۔یعنی کہ گھومنے والی شے۔اخلاقی انحطاط کے ادوار میں اللہ تعالیٰ نے ڈرانے والے اور خوشخبری دینے والے پیامبر بھیجے۔ان پیامبروں نے مادی اور روحانی زندگی میں توازن برقرار رکھنے کی تعلیم دی تاکہ معاشی، معاشرتی اور دینی زندگی حق وانصاف کے تقاضوں کے ساتھ رائج ہو۔

قبل از اسلام انبیاء کے ادوار میں چند مخصوص برائیاں عام تھیں۔پیغمبروں کو ان برائیوں کے سدباب کے لئے بھیجا گیا اور ان کے مخصوص حالات کے مطابق معجزوں سے نوازا گیا۔البتہ خاتم نبوت حضور اکرم صلعم کے زمانے میں ہر قسم کی برائی عام تھی۔اس کے علاوہ آپؐ کا پیغام تمام انسانیت کے لئے، اور ان کی شریعت رہتی دنیا تک قائم رہنے والی ہے۔اس لئے انہیں رہتی دنیا تک قائم رہنے والا معجزہ قرآن پاک کی صورت میں عطا کیا گیا۔آپ کی ذات اقدس کسی ایک قوم کے لئے رحمت کا باعث نہیں بلکہ وہ رحمت للعالمین ہیں۔

فی زمانہ انسانیت ایسے دور سے گزر رہی ہے جس میں شیطان نے اپنے (تقریباً) تمام ہتھکنڈے ظاہر کردیئے ہیں اور درجہ بدرجہ ان کی ہولناکیوں میں اضافہ کررہا ہے۔ان حالات میں ہمیں ایک صالح رہبر کی ضرورت ہے اور اس انسان کامل کی دوری میں اپنی رُفیق جاں روح

کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ وہ رفیق جو ہمارے ہر خلیے کی مکین ہے، اور جب چھوڑے گی تو ہر خلیے کو چھوڑ دے گی۔ مادی وجود دوبارہ سے کھنکھناتی مٹی کا ڈھیر بن جائے گا اور روح اپنی حقیقت کی جانب پرواز کر جائے گی۔ اس فانی دنیا میں انسانی جسم اور روح لازم و ملزوم ہیں۔ یہ دونوں رفیق ایک دوسرے کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی نظر انداز ہو جائے تو انسان جسمانی اور ذہنی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا مطمع نظر ہے کہ ان دونوں کو غذا پہنچانا نہ صرف افراد بلکہ تعلیمی اداروں اور پورے معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ فخر رازی اپنے عارفانہ کلام میں کہتے ہیں کہ میں نے تن کی دنیا میں اپنے من کی دنیا کو نہیں دیکھا۔ پھر جب میں من کی دنیا میں جاؤں گا تو اسے وہاں کیسے دیکھ سکوں گا۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے یہیں دیکھ لیتا لیکن نہیں دیکھ سکا۔

اس کتاب کے حصہ اول کا موضوع چھٹی حس اور روحانیت کئی ایک جہتوں کا حامل ہے۔ جدید سائنس کی بنیاد حواس خمسہ پر ہے یعنی کہ وہ معلومات جو دیکھنے، بولنے، سننے، چھونے اور سونگھنے سے حاصل کی جاسکتی ہوں۔ تاہم تمام قدیم فلسفے اور ادیان پانچ سے زیادہ انسانی حواس کے قائل ہیں۔ چھٹی حس کا تصور قدیم یونانی فلسفے میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر افلاطون کے شاگرد ارسطو کا خیال تھا کہ انسانی حواس محض پانچ تک ہی محدود نہیں بلکہ اور بھی حواس پائے جاتے ہیں جن کا ادراک ہر انسان نہیں کر سکتا۔ بدھ مذہب کے بڑے بھکشوؤں کے مطابق انسان چھ سے لے کر آٹھ حسوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں سے پانچ تو ہر انسان میں پائی جاتی ہیں لیکن چھٹی، ساتویں اور آٹھویں حس نسبتاً کم لوگوں میں فعال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایرانی مصنف رسول خردمندی 'چھٹی حس کیا ہے' میں لکھتے ہیں کہ چھٹی حس اب کوئی اچھوتا خیال نہیں رہا۔ سائنس انسانی حواس کو پانچ حصوں میں تقسیم کرتی ہے لیکن نیشنل سائنس آرگنائزیشن چھٹی حس کو سوڈو سائنس کے طور پر متعارف کرواتی ہے۔ ایسے عوامل جنہیں سائنسی اعتبار سے ثابت نہ کیا جا سکے انہیں سوڈو سائنس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بعض فقہا اور صوفیا کے مطابق چھٹی حس الوہیت کا ایک ذریعہ ہے اور ماورائی دنیا فیوض و برکات کا ذریعہ ہے۔

ہمارے موضوع کا دوسرا حصہ روحانیت ہے۔ لفظ روح الریح سے نکلا ہے، جس کا مطلب

ہے ہوا۔ اسی طرح سے انگریزی کا لفظ سپیریچوئلٹی (spirituality) لاطینی زبان کے لفظ سپیریٹس (spiritus) سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب ہے سانس۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا تمام قدیم فلسفوں اور ادیان عالم میں روحانیت کا تصور موجود ہے۔ فلسفی افلاطون کے مطابق انسان میں دو طرح کی روحیں ہوتی ہیں۔ ایک عاقلہ جو ہمیشہ باقی رہتی ہے اور دوسری غیر عاقلہ جو انسان کی موت کے بعد فنا ہو جاتی ہے۔ غیر عاقلہ روح کی بھی دو اقسام ہوتی ہیں۔ ایک غضبی جو انسان کے سینے میں رہتی ہے اور دوسری شوہتی جو شکم میں پائی جاتی ہے۔ ارسطو کا نظریہ تھا کہ روح انسانی جسم کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔ انسان کا بدن جس وقت ماں کے شکم میں کامل ہو جاتا ہے تو اس میں روح پیدا ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ روح کا وجود جسم سے پہلے ہو۔ یونانی ڈی کرٹ (150 عیسوی) کے مطابق روح جسم سے الگ ہوتی ہے، روح اور جسم کی اپنی خصوصیات ہیں۔ البتہ روح کی اہم خصوصیت غور و فکر ہے (i)۔

اس کے علاوہ برگوس نے لیٹ اینٹی کویٹی [1] (284 ق م) میں غیر مذہبی روحانیت کا جائزہ لیا (دی برین آف اسلام)۔ جدید دور میں دوسری جنگ عظیم کے بعد ایسا ہی ایک اور مکتب فکر وجود میں آیا۔ انہوں نے زور دیا کہ روحانی اور جسمانی زندگی آپس میں متصل ہیں اور روحانیت کا تعلق مذہب سے نہیں۔ وہ لوگ مراقبے کے ذریعے روحانیت حاصل کرتے تھے۔ ان کا نعرہ تھا کہ وہ 'روحانی ہیں لیکن مذہبی نہیں'۔ ان کے نزدیک روحانیت کا مطلب انسانی اقدار کا احترام اور ذہنی سکون کا حصول تھا۔ آج بھی مغربی ممالک خصوصاً امریکہ اور جرمنی میں یہ مکتب فکر اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ گویا کہ روحانیت مذہب تک محدود نہیں لیکن مذہب روحانی صلاحیتوں کے استعمال کے لئے ایک مکمل نظام ترتیب دیتا ہے۔ وہ اس کے دائرہ کار کو بڑھاتا ہے اور اس کو خالق حقیقی سے ملاتا ہے۔ اسی لئے موجودہ تصنیف میں بار ہا مذہبی اقدار اور روایات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ہندوؤں کی قدیم کتاب رگ وید (ii) روح کی اہمیت کو کچھ اس طرح سے واضح کرتی ہے کہ۔ 'انسانی آواز بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ وہ ہماری کیفیات کو واضح کرتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کچھ

1۔ لیٹ اینٹی کویٹی یورپی تاریخ میں رومن تہذیب کے اختتام پر آغاز ہوا۔ یہ یورپی تاریخ کا سب سے زیادہ دلچسپ دور قرار دیا جاتا ہے جب مختلف سیاسی اور معاشرتی تحریکوں نے سر اٹھایا۔

اور بھی ہے اور وہ ہے سوچ۔ ہماری سوچ ہمارے افعال پر حاوی ہوتی ہے۔ سوچ سے بھی بڑی ایک چیز ہے اور وہ ہے آتما (روح)۔ ہمارے آگے پیچھے، اوپر نیچے، ہر جانب روح ہے۔ ہماری تمام صلاحیتیں روح کی مرہون منت ہیں'۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ 'جو شے تمہارے اندر سانس لیتی ہے وہ روح ہے۔ روح کے پاس تمام علوم موجود ہیں'۔ اور یہ کہ 'روح کیا ہے؟ برائی اور موت سے آزاد، غم اور بھوک پیاس سے دور، وہ حقیقت ہے۔ اسے خالص پیدا کیا گیا ہے'۔ پاکستان میں قدیم ٹیکسلا کے مقام پر 800 قبل از مسیح میں ہندومت کی ایک انقلابی شاخ اپنیشد ابھری۔ اپنیشد کے رشیوں کے مطابق اگر خدا کو جاننا چاہتے ہو تو اپنے اندر دیکھو اور اپنی روح کو پہچانو۔ عیسائیت کے مطابق 'روح کا پھل محبت، خوشی، اطمینان، تحمل، مہربانی، نیکی، ایمان داری، حلم اور پرہیز گاری ہے' (گلتیون 23-22)۔

دین اسلام انسانی زندگی کو ایک تکون کی شکل میں پیش کرتا ہے جس میں جسم، روح اور مذہب ایک ہی کل کے تین اٹوٹ حصے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی الگ کر دیا جائے تو انسان اپنے حقیقی مقصد حیات سے بھٹک جاتا ہے اور اس کی زندگی اعلیٰ مقاصد کے حصول کے بجائے فقط کھانے پینے اور سونے جاگنے کی حد تک محدود ہو جاتی ہے۔ گویا کہ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق 'ان کے دل اور دماغ ہیں لیکن وہ سوچتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر وہ سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپائیوں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غافل اور بے خبر ہیں' (الاعراف:179)۔

حضرت علیؑ نے فرمایا کہ انبیاء اور آئمہ میں روح کی پانچ اقسام پائی جاتی ہیں یعنی کہ 'روح الحیات' جس کے ذریعے زندگی کے کام انجام دیئے جاتے ہیں، 'روح القوہ' جس کے ذریعے سخت کام انجام دیئے جاتے ہیں، 'روح الشھوۃ' جس کے ذریعے خوراک اور دوسرے تعلقات نبھائے جاتے ہیں، 'روح الایمان' جس کے ذریعے انصاف اور ایمان قائم کیا جاتا ہےاور آخری 'روح القدس' جو پیمبروں اور اماموں پر نازل ہوتی ہے۔ خدا پر یقین رکھنے والوں میں چار اور خدا پر یقین نہ رکھنے والوں میں تین اقسام پائی جاتی ہیں (iii)۔

امام جعفر صادقؑ کے مطابق انسان ایسی مخلوق ہے جس کا سرچشمہ فکر ہے۔ جبکہ جمادات

اور نباتات ناقابل تسخیر قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ایک اور مقام پر امام نے جابر بن حیان کے ساتھ اپنے ایک مکالمے میں فرمایا کہ اس فانی دنیا میں جسم اور روح ایک دوسرے کی مرہون منت ہیں۔روحانیت انسان کو انسانیت کے درجے تک پہنچاتی ہے۔جب بھی ہم سوچتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے اور کہاں جانا ہے تو درحقیقت ہم اپنی روح کے تقاضے پورے کر رہے ہوتے ہیں۔

تحف العقول میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ خدا کے پاس انسانوں کے لئے دو دلائل ہیں، ایک بیرونی اور دوسرا اندرونی۔ بیرونی دلائل پیغمبران خدا، اور اندرونی دلیل عقل ہے۔ عقل تو یہ ہے کہ ہم خدا کا شکرادا کریں۔اگر کوئی اپنی نفسانی خواہشوں پر قابو پالیتا ہے تو اس کی عقل شہ زور ہے۔اس کے علاوہ امام کا یہ فرمان بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو عزت دینا چاہتا ہے تو اس کی روح کو اتنا تابع دار بنا دیتا ہے کہ وہ نیکی کو قبول کرتا ہے اور برائی سے دور ہو جاتا ہے۔

علامہ محمد باقر مجلسیؒ اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'سیرت رسولؐ میں امام جعفر صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب روح کو خلق کیا تو اس سے فرمایا کہ قریب آ۔وہ قریب آ گئی۔ فرمایا دور چلی جا تو وہ دور چلی گئی۔رب ذوالجلال نے فرمایا کہ میں نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو مجھے تجھ سے زیادہ عزیز ہو۔اس کے نو حصے محمد مصطفیؐ کو عطا کئے اور دسواں حصہ تمام مخلوق میں تقسیم کر دیا۔امام جعفر صادقؑ سے مزید منقول ہے کہ تمہیں تمہارے نفس پر طبیب بنا دیا گیا ہے، دوا بتا دی گئی ہے، شفا کی علامات دکھا دی گئی ہیں اور ہدایات دے دی گئی ہیں۔اب یہ تم پر ہے کہ تم اپنے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے ہو(الکافی)۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روحانی بالیدگی حاصل کس طرح ہوتی ہے؟ مذاہب عالم کے مطابق روحانی بالیدگی نفس کی اصلاح کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔اس سلسلے میں شیخ صدوقؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ روح جسم کی جنس سے نہیں ہے۔نفس وہ روح ہے جس پر زندگی قائم ہے۔اور یہی سب سے پہلی مخلوق ہے(حیات القلوب۔حصہ 2)۔جو شخص احساسات میں قوی ہوتا ہے اس کی روح بھی قوی ہوتی ہے۔شیخ سعدی کے مطابق (تن آدمی شریف است بہ جان آدمیت) ترجمہ: انسان کا بدن اس کی روح کی وجہ سے قابل قدر ہے۔

دور جدید کے لحاظ سے بیسویں صدی روحانی علوم اور تجربات کے لئے اہم سمجھی جاتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نفسیات اور روحانیت پر واضح توجہ دی گئی۔ علم کی یہ دوشاخیں انسانیت کی نجات اور بیمار معاشرے کے لئے مرہم کا کام کرتی ہیں۔ دور جدید کے مشہور ماہر نفسیات فرینکل (1997) کے مطابق انسان روحانیت میں اپنا مقصد حیات تلاش کرتا ہے۔ یہ تلاش اس کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ اگر انسان اپنے مقصد حیات کو سمجھ نہ پائے تو اس کے اندر ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جو مایوسی اور ناامیدی کا باعث بنتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا واسطہ ایسے نفسیاتی مریضوں سے پڑا جن کے سامنے مقصد حیات واضح نہیں تھا۔ اگر کسی شخص کے پاس بنیادی سوالوں کے جواب نہ ہوں، مثلاً ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ کرہ ارض اور کائنات کا خالق کون ہے؟ وغیرہ تو عین ممکن ہے کہ وہ شناختی بحران کا شکار ہو جائے۔ علاوہ ازیں امریکی نفسیات دان میک کارل (2005) نے کہا کہ انسان کا روحانیت کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ البتہ مختلف اوقات میں مختلف کلچر اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ روحانیت کے مختلف معنیٰ اخذ کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ ایک ہی شخص کے نظریات زندگی کے مختلف ادوار میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ روحانی کیفیات کسی خاص عمر کی محتاج نہیں ہوتیں۔ جیسے ایک ادھیڑ عمر یا بزرگ شخص میں روحانی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں بالکل اسی طرح سے ایک نوجوان حتیٰ کہ ایک بچہ بھی روحانی بالیدگی کا حامل ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں روحانیت پر کسی خاص جنس کا غلبہ بھی نہیں۔ عورت ہو یا مرد، کوئی بھی روحانیت کے اعلیٰ درجات پر پہنچ سکتا ہے۔ البتہ بعض لوگ اپنی خداداد روحانی صلاحیتوں پر توجہ دیتے ہیں اور بعض انہیں پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ بعض کی صلاحیتیں کسی خاص حالات کے تحت صیقل ہوتی ہیں اور بعض کی کسی خاص عمر میں۔ کچھ لوگوں کی صلاحیتیں دوسروں پر ظاہر ہو جاتی ہیں اور کچھ کی مخفی رہتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ زندگی کے مشکل ادوار میں بعض الوہی قوتیں اجاگر ہو جاتی ہیں اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے میں رہنمائی کرتی ہیں۔ انہی نظریات کے تحت میک کارل نے روحانیت کے متعلق ایک سروے کیا جس میں روحانیت کی ستائیس تعریفیں سامنے آئیں۔ اسی طرز پر موجودہ تحقیق کے دوران شرکاء سے

درخواست کی گئی کہ وہ روحانیت کی تعریف بیان کریں اور ان کی آرا پر بحث کی گئی۔ روحانی کیفیات بہت سی جہتوں کا حامل موضوع ہے۔ لیکن موجودہ کاوش کو بامعنیٰ بنانے کے لئے بیانیہ حصے کو چھٹی حس، غیبی امداد اور سچے خوابوں تک مختص کر دیا گیا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ایک آفاقی موضوع کو ایک سادہ اور مختصر کوزے میں بند کر دیا گیا ہو لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ جب اس کوزے کو الٹایا گیا تو مطالب و معنیٰ کے کئی ایک سرچشمے پھوٹ پڑے۔

1.1۔موجودہ تحقیق کے اغراض ومقاصداور طریقہ کار

موجودہ تحقیق مندرجہ ذیل اغراض ومقاصد کے تحت مرتب کی گئی۔

- روحانیت کے بارے میں شرکاء کی آرا اکٹھی کرنا۔
- مادی زندگی اور روحانیت کا تعلق سائنس، سوشل سائنس، فلسفہ اور مذاہب کی روشنی میں واضح کرنا۔

موجودہ انسانی زندگی میں روحانیت کی اہمیت کو اجاگر کرنا۔

آج کل سوشل سائنس میں دو قسم کی تحقیقات عام ہیں، ایک مقداری اور دوسری کیفیاتی۔ موجودہ تحقیق کے تقاضوں کے تحت دوسری قسم کا چناؤ کیا گیا۔ کیفیاتی تحقیق میں شرکاء کی اندرونی کیفیات اور احساسات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس تحقیق کے بھی کئی ایک طریقے ہیں۔ ان طریقوں میں سے شراکتی، بیانیہ اور انٹرویو کا انتخاب کیا گیا۔ شراکتی تحقیق میں دیگر شرکاء کی طرح مصنفین کو بھی رائے دہی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ بیانیہ طریقہ کار کے مطابق شرکاء نے اپنی زندگی کے غیر معمولی واقعات اور سچے خوابوں سے آگاہ کیا۔ موضوع کی نزاکت کے تحت قابل اعتبار شرکاء کا انتخاب کیا گیا۔ اس حصے کے لئے کوئی خاص سوال تیار نہ کیا گیا تا کہ شرکاء کے خیالات کا تسلسل برقرار رہے اور وہ کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے احساسات اور تجربات بیان کر سکیں۔ ریسرچ کا مواد حاصل کرنے کے لئے بنیادی اور ثانوی طریقہ اختیار کیا گیا۔ بنیادی طریقے میں شرکاء نے اپنے ذاتی واقعات بیان کئے اور ثانوی طریقے میں انہوں نے اپنے عزیزوں کے سچے واقعات بیان کئے۔ تحقیقی اخلاقیات کے مطابق شرکاء کا نام پتہ صیغہ راز میں رکھا گیا اور ہر شریک تحقیق کو ایک تحقیقی کوڈ دیا گیا (مثلاً ش 1، ش 2 وغیرہ)۔ اس تحریر میں اگر کہیں کوڈ کا استعمال کرنے کی بجائے لفظ عزیز یا عزیزہ استعمال کیا گیا ہے تو وہ شرکاء کے جاننے والوں کے واقعات ہیں۔

اس تحقیق کا دوسرا حصہ، یعنی کہ انٹرویو مندرجہ ذیل سوالات پر مشتمل تھا۔

1۔ آپ کے ذاتی خیال میں روحانیت کیا ہے؟

2۔آپ کے خیال میں آج کل روحانیت کا انحطاط کیوں پایا جاتا ہے؟

3۔آپ کے خیال میں ہم اپنے نوجوانوں کو روحانیت کی جانب کس طرح راغب کر سکتے ہیں؟

ہماری توقع کے عین مطابق بظاہر سادہ نظر آنے والے ان سوالات کے جوابات میں معنیٰ و مطالب کا ایک جہان آباد تھا۔ان سوالوں کے جوابات سے واضح ہوا کہ شرکاء شدت سے موجودہ معاشرے میں روحانیت کی کمی کو محسوس کرتے تھے۔انہوں نے محققین کے سامنے گویا کہ اپنے دل کھول کر رکھ دیئے۔ان کے جوابات کا ہر لفظ گراں قدر تھا اور انہوں نے تحقیق کے نئے ابواب آشکار کئے۔اس سلسلے میں نوجوانوں کا جوش وجذبہ قابل تحسین تھا،اور ہمارے لیے ایک اہم امر، کیونکہ ایک عرصے سے ہماری دھرتی کو روحانی طور پر بانجھ بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔لیکن نوجوانوں کا جذبہ پتا دیتا ہے کہ وہ اب بھی زرخیز ہے اور اس کے اندر گوہر نایاب چھپے ہیں۔یہ تحریر نوجوان نسل کے لیے لکھی گئی ہے،لیکن یہ ان کی آواز بھی ہے،جو نوجوان نسل سے مایوس انسانوں کو روحانی روئیدگی کی نوید دیتی ہے۔

موجودہ تحقیق کے شرکاء ٹائم زون کے لحاظ سے دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے یعنی پاکستان،ایران،امریکہ،کینیڈا اور آسٹریلیا۔لہٰذا وقت کے اختلاف کی بدولت ٹیلی فون انٹرویو لینا بھی مشکل امر تھا۔تاہم پہلے مرحلے میں شرکاء کو فون کر کے یا میسج بھیج کر تحقیق میں شرکت کی رضامندی لی گئی اور تحقیق کے اغراض ومقاصد اور طریقہ کار سے آگاہ کیا گیا۔بعدازاں انہیں تحریری یا صوتی پیغام بھیجے گئے اور ان سے درخواست کی گئی کہ جواب میں وہ بھی تحریری یا صوتی پیغامات ارسال کریں۔اس طریقہ کار کے ذریعے شرکاء کے پیغام اور ای میل کے ذریعے معلومات اکٹھی کرنا،انٹرویو سے قدرے مشکل اور وقت طلب ثابت ہوا۔انٹرویو کے دوران دو طرفہ گفتگو کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور قابل توضیح نکات کی بروقت تفصیل معلوم کر لی جاتی ہے۔علاوہ ازیں فی الفور سوالات (prompt) کی بھی ایک فہرست تیار کر لی جاتی ہے اور موقع محل کے لحاظ سے سوال پوچھے جاتے ہیں۔لیکن ای میل یا دوسرے پیغامات کی صورت میں فوری سوال کرنا ممکن نہ تھا۔لہٰذا قابل توضیح نکات کے لئے دوبارہ سوالات بھیجے گئے اور جوابات نوٹ کئے گئے۔

بروحال جب شرکاء دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے اور مختلف ٹائم زون میں رہ رہے تھے تو بہترین طریقہ یہی تصور کیا گیا۔ اس طریقہ کار میں شرکاء اپنی سہولت کے مطابق جوابات بھیج سکتے تھے۔ تحقیق کا تیسرا حصہ انعکاس سوچ (Reflective Thought) پر مبنی تھا۔ کیفیاتی تحقیق نہ صرف شرکاء بلکہ محقق کو بھی انعکاس فکر کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ جب انسان اپنی زندگی کے واقعات تفصیل سے بیان کرتا ہے تو ماضی کے بعض اعمال وافعال نئے مطالب ومعانی کے ساتھ سامنے آتے ہیں، جن سے انسان نئے اسباق سیکھتا ہے اور مستقبل کے لئے نئی منصوبہ سازی کرتا ہے۔ لہٰذا اس حصے میں شرکاء سے سوالات کئے گئے کہ آیا تحقیق میں حصہ لینے کی بدولت انہوں نے کوئی نیا سبق سیکھا؟ اور اس کی روشنی میں مستقبل کے لئے کوئی نیا لائحہ عمل تیار کیا؟ تقریباً تمام شرکاء کو انعکاس سوچ کے سوالات بھیجے گئے۔ لیکن ان سوالوں کے بہت کم جوابات محصول ہوئے۔ گو کہ وہ جوابات مفید معلومات پر مبنی ہیں لیکن شرکا کی اکثریت کی نمائندگی نہیں کرتے، اس وجہ سے ان جوابات کو ضمیمہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے (دیکھئے ضمیمہ 2)

اس تحقیق کے تمام شرکاء اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے [1]۔ ان میں زیادہ تر پی ایچ ڈی ڈاکٹر، کچھ پوسٹ ڈاک جبکہ کچھ ایم۔ اے تھے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ سینئر پروفیسر، اسسٹنٹ پروفیسر، ریسرچر، علماء دین اور طلبا تھے۔ چند شرکاء نے مزید اپنے قابل اعتبار لوگوں کا پتا دیا جن سے تحقیقی مواد اکٹھا کیا گیا۔ چند خواتین وحضرات نے معاونین کی خدمات سرانجام دیں۔ وہ مصنفین کے پیغام اپنے قابل اعتبار رابطوں کو بھجواتے اور ان کے من وعن جوابات مصنفین کو ارسال کر دیتے تھے۔ اس طرح تحقیقی مواد اکٹھا کرنے میں آسانی ہوئی۔ اس کے علاوہ شرکاء کے انتخاب میں جنس، عمر، مذہب، اور زبان کی کوئی تفریق نہیں رکھی گئی۔ البتہ جواب بھیجنے والوں میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔ مزید برآں نوجوان شرکا کی جانب سے بزرگوں کی نسبت زیادہ جواب موصول ہوئے۔ عمر کے لحاظ سے شرکاء کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا، یعنی کہ 25-35 سال، 35-55 سال، 55 سال سے زیادہ عمر کے افراد۔ 25 سے 35 سال کے افراد نے دوسرے گروپ (35-55) کے مقابلے میں زیادہ جوابات ارسال کئے۔ تیسرے گروپ سے سوائے ایک

1۔ شرکاء کا انتخاب کرتے ہوئے ان کی تعلیم کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ وہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔

شریک تحقیق کے اور کسی کا جواب موصول نہ ہوا۔اس کے علاوہ تحقیق کے پہلے حصے (بیانیہ) کے جواب دوسرے (انٹرویو) کے مقابلے میں زیادہ موصول ہوئے۔

تحقیق کے حصہ اول اور دوم کا تجزیہ الگ سے پیش کیا گیا۔آخر میں دونوں کا موازنہ کیا گیا، نتائج اخذ کیئے گئے اور سفارشات پیش کی گئیں۔تحقیق سے حاصل ہونے والے مواد کو سائنسی تحقیقات،قرآن وسنت اور عام فہم واقعات کے ذریعے واضح کیا گیا۔

موجودہ تحقیق بین المذہبی اور بین المضامین حقائق پر مبنی ہے۔اس کے باوجود کوشش کی گئی ہے کہ مشکل اصطلاحات کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ سادہ، سلیس اور غیر جانب دارانہ زبان استعمال کی جائے۔تاکہ ہر مکتبہ فکر اور نقطہ نظر کے قارئین اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔اس کے علاوہ موجودہ تصنیف میں متن کے لحاظ سے کئی ایک طریقہ تحریر استعمال کیئے گئے،یعنی کہ بیانیہ،موازناتی، متشکل اور متعامل۔ یہاں پر آخر الذکر دو طریقوں کی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔ متشکل طرز تحریر میں مصنف اپنی ذاتی زندگی کی مثالیں پیش کرتا ہے،تاکہ بات آسانی سے سمجھ آجائے اور قاری کی دلچسپی بھی قائم رہے۔اس طرح سے قاری اور مصنف کے درمیان ایک خاص ربط پیدا ہوجاتا ہے۔جدید تعلیمی نظام میں بھی اس طریقے کی سفارش کی جاتی ہے۔علاوہ ازیں متعامل طریقہ میں بات اس طرح سے کی جاتی ہے جیسے مصنف اور قاری آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہوں۔دونوں طرز تحریر، جرات، تجربہ اور احتیاط مانگتے ہیں۔جرات اس طرح کہ اپنی زندگی کے رازوں سے پردہ اٹھانا ایک کٹھن کام ہے۔احتیاط یوں کہ کہیں نمود و نمائش کا پہلو سامنے نہ آجائے اور مہارت یوں کہ تحریر کا مقصد پورا ہو اور کوئی مغالطہ پیدا نہ ہو۔مزید یہ کہ اس تحریر میں قدیم اور جدید واقعات کے امتزاج سے مختلف تصورات کو آسان بنانے کی کوشش کی گئی۔آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی قصص الانبیاء میں لکھتے ہیں کہ داستان اور واقعات قوت جاذبہ کے حامل ہوتے ہیں۔بنی نوع انسان پہلے حسی ہے اور اس کے بعد عقلی۔واقعات اور قصے کہانیاں انسان کی حسیات اور جذبات کو متاثر کرتے ہیں۔علاوہ ازیں یہ ہر شخص کے لئے قابل فہم ہوتے ہیں۔عمومیت رکھنے والی کتاب کو عقلی استدلال، روزمرہ کی مثالوں اور واقعات کا مرکب ہونا چاہیے۔تاکہ قاری ان کی مدد سے بامعنی نتیجہ اخذ کر سکے۔پاک پروردگار عالم نے قرآن پاک بھی انہی اصولوں پر مرتب

کیا۔ لفظ قرآن قَرَ آ سے ماخوذ ہے، جس کا لفظی مطلب ہے کثرت سے پڑھی جانے والی کتاب۔ چونکہ اس کلام الٰہی کو تا قیامت کثرت سے پڑھا جانا تھا، اس لئے ہر زمانے کے خواص و عوام کے لئے اسے نازل کیا گیا۔ اگر ہم علم تحریر پر نظر ڈالیں تو زیادہ پڑھی جانے والی دینی اور غیر دینی کتب اسی طرز پر لکھی گئی ہیں۔

1.2۔ موجودہ تحقیق کی افادیت

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس تصنیف میں ایسی کون سی جہت ہے کہ جو سوچ کے نئے در وا کر سکے یا تحقیق کی نئی راہیں متعین کر سکے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ تصنیف فی زمانہ مادی، ذاتی اور روحانی خلا کو پر کرنے کی ایک ادنیٰ سی کاوش ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک غلط العوام تصور رائج ہو چکے ہیں اول تو یہ کہ ہے روحانیت صرف انبیاء اور صلحا کی روحانی تجلیات کا نام ہے۔ دوسری جانب روحانیت کو مجذوبیت اور دولت اکٹھے کرنے کے مذموم ہتھکنڈوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا آج ہم روحانیت کی عام فہم تعریف سے بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ اس تصنیف کی اہم جہت یہ ہے کہ اس میں روحانیت کو اطلاقی سائنس کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یعنی روحانیت ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس کے بارے میں ہم معلومات اکٹھی کر سکتے ہیں، مشاہدات اور تجربات کر سکتے ہیں اور نتائج کو اپنی زندگی بہتر بنانے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس تصنیف میں سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے کہ روحانیت ہماری کامیاب زندگی کی امین ہے۔ وہ رنگ و نور اور خوشبو کی طرح ہمارے آس پاس پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ایک ایسی نعمت خداوندی ہے جو نہ صرف اخروی بلکہ مادی زندگی کی کامیابی کی کنجی بھی ہے۔

جیسے کہ پہلے بیان کیا گیا کہ یہ تصنیف روحانیت میں کیفیاتی تحقیق کا اجرا ہے۔ چھٹی حس اور روحانیت کے بارے میں پہلے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن لٹریچر کا مطالعہ بتاتا ہے کہ روحانیت اور جدید سائنسی تحقیقات کا موازنہ موثر طریقے سے پیش نہیں کیا گیا۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور غور و فکر کی سائنسی توجیہات پر ایک ہمہ گیر تصویر پیش نہیں کی گئی۔ علاوہ ازیں روحانیت کو اعلیٰ درجے کے تصوف اور عرفان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ آج کا نوجوان روز

مرہ زندگی میں روحانیت کی توضیح مانگتا ہے۔لہٰذا ہمیں روحانیت پر ایسی کثیر جہتی تحقیقات اور تصنیفات کی ضرورت ہے جن کے ذریعے نوجوان ذہنوں کو متاثر کیا جا سکے۔البتہ موجودہ تحقیقی روایت میں مزید نکھار پیدا کیا جا سکتا ہے۔اس سے بہتر طرز پر انٹرویو منعقد کئے جا سکتے ہیں۔اس کے علاوہ اس موضوع پر مقداری سروے بھی کئے جا سکتے ہیں۔

موجودہ تحقیق میں کم از کم تین نسلوں (1960–2020) کے درمیان بیانیہ اور معلوماتی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس تحقیق میں ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جو وقت کی کمی کے باعث ہماری نسل اپنے بچوں کو نہ سنا سکی۔لیکن ضابطہ تحریر میں لائے جانے کے باعث وہ اگلی نسلوں کے لئے محفوظ ہو جائیں گے۔اس تحقیق کے بنیادی منصوبے میں کوشش کی گئی تھی کہ کم از کم چار نسلوں (1940–2020) کے درمیان رابطہ قائم کیا جا سکے،لیکن بعض وجوہات کی بنا پر بزرگ حضرات کی جانب سے جوابات وصول نہ ہوئے۔ہمارا مطمع نظر یہ ہے کہ 1960 اور 1970 کی دہائیوں میں جنم لینے والی نسل قدرے بہتر روحانی حالات اور اقدار کے تحت پروان چڑھی۔اس نسل نے وسیع تر خاندان کے بزرگوں کے علم، تجربات اور عقل و دانش سے فائدہ اٹھایا۔اپنے بزرگوں سے انبیا اور صلحا کی کہانیاں سنیں، دنیاوی اور دینی معاملات میں توازن دیکھا۔اس کے علاوہ رشتہ داروں کے درمیان رواداری، ایثار اور محبت کے عملی مظاہرے دیکھے۔ لیکن اکیسویں صدی کے بچے ایسی تربیت سے محروم رہ گئے۔گزشتہ پانچ دہائیوں میں تیز رفتار ترقی اور اس کے ساتھ ہی دہشت گردی، مہنگائی، سستی سیاست اور دوسروں کی ٹانگ کھینچنے کی روایت میں برق رفتاری سے اضافہ ہوا۔وسیع خاندان کی جگہ انفرادی خاندان نے لے لی۔جہاں دیگر رشتے دور ہوئے، وہیں والدین اور بچوں میں بھی دوری پیدا ہو گئی۔ان حالات میں نوجوانوں کی ہمنوائی کے لئے کیا بچا؟ یا تو ڈیجیٹل میڈیا یا پھر ہم عمر دوست، جبکہ ہر دو مناسب رہنمائی کی صلاحیت نہیں رکھتے۔یہاں پر بحث اس بات پر نہیں کہ کھوئے زمانوں کو کس طرح لوٹایا جائے، بلکہ یہ کہ اس یک و تنہا نوجوان کی مدد کس طرح کی جائے کہ اس کی زندگی با مقصد ہو جائے اور وہ اعلیٰ روحانی اقدار کو سمجھنے کے قابل ہو جائے؟ موجودہ تحقیق میں ایسے ہی چند سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے برعکس اس تصنیف کا سلوگن اپنی اندرونی کیفیات کا شعور

اور روحانی بالیدگی کے ذریعے اپنے خدا کو پہچاننا ہے۔ آج کل روحانیت کے بارے میں بات کرنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ فی زمانہ یہ احتیاط ضروری سہی لیکن اس کتاب میں باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صاف ستھری اور خدا کے قریب لانے والی، دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دینے والی، کزور اور باطل افکار کے خلاف سینہ سپر اور شیطانی وسوسوں سے آگاہ کروانے والی روح سے کوئی حجاب نہیں۔ مادی دنیا فریب نظر ہے، جبکہ روحانی دنیا ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ دنیا ہمارے آگے بھاگتی ہے جبکہ روح ہماری حفاظت کے لئے پشت پر رہتی ہے۔

موجودہ تحقیق بین المذہبی اور بین الفقہی یگانگت کی مظہر ہے۔ پروفیسر مسعود عالم قاسمی سابق ڈین فیکلٹی آف دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مطابق دیگر مذاہب کا مطالعہ ایک اہم اسلامی روایت ہے۔ ہمارے فقہا نے ہمیشہ دیگر مذاہب کی کتب کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اپنے معاشرے میں رہنے والے دیگر مذاہب کے مذہبی خیالات، رسموں اور اقدار کا مطالعہ کیا۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر رکھی۔ ابوالریحان البیرونی کی ہندوستانی مذاہب پر کتاب الہند ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

شرکائے ریسرچ میں مختلف مکاتب فکر اور مذاہب کے خواتین و حضرات شامل تھے۔ تمام شرکاء کی آرا بیان کی گئی ہے اور ان کے مذہب یا مکتب فکر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر ایسا ذکر کہیں آیا بھی ہو تو اس کا مقصد بین المذہبی یا بین الفقہی ہم آہنگی کو واضح کرنا ہے۔ مزید یہ کہ آج کے دور میں جب ماورائے عقل امور کو دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے، اس وقت کوشش کی گئی کہ اس حساس موضوع کو دور اندیشی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

اس کتاب کا مطمع نظر نوجوان ہیں۔ امید ہے کہ یہ ادنی کاوش ان کے علم و شعور میں اضافہ کرے گی اور ان کے لئے خصوصاً فائدہ مند ثابت ہوگی جو مادیت پرستی کا شکار ہو کر روحانیت سے دور ہو گئے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض زندگی سے مایوس یا خالی پن کے شکار نوجوان اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

اس کتاب کا مواد بین الموضوعاتی (Interdisciplinary) ہے۔ یعنی کہ روحانیت اور دینی عقائد کا سائنس، تعلیم اور تحقیق کے درمیان رابطہ قائم کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی گئی

ہے۔امید ہے کہ مختلف درجہ تعلیم میں سائنس اور سوشل سائنس پڑھانے والے افراد اس تحقیق سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ وہ اس کے مفصل اور مدلل نکات کو اپنے لیکچر میں شامل کر کے بتدریج مادیت کی برائیوں سے دور ہونے اور مادہ سے بالاتر سوچ کو تقویت دے سکیں گے۔علاوہ ازیں دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبا اس تحقیق سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ کتاب مجالس امام حسینؑ کے خطابات کے لئے معاون ومددگار ثابت ہوسکتی ہے۔علاوہ ازیں اس کتاب کے نکات کو بین المذہبی پلیٹ فارم پر پیش کیا جا سکتا ہے۔آج کل انگریزی کتب کی مانگ زیادہ ہے لیکن یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے تا کہ عوام الناس کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہو۔

اس باب کی آخری سطور کو ہم بقیۃ اللہ فی الارض کے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ چونکہ یہ ادنیٰ سی کاوش روز اول سے امام العصرعج کے نام کی گئی، اسی وجہ سے تحقیق اور تحریر کے دوران ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا گیا۔ گویا کہ ہر لفظ پر نگرانی کا تیشہ تیز ہزا ہم دعوی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے تمام واقعات سچے اور حقیقت پر مبنی ہیں۔

اس کے علاوہ اس کتاب کو peer review کے عمل سے بھی گزارا گیا۔اس سلسلے میں دو ماہرین تعلیم نے بنظر غائر اس کے متن کا جائزہ لیا اور بہتری کے لئے تجاویز پیش کیں۔ان تجاویز کو مدنظر رکھتے ہوئے کتاب کے متن میں تبدیلی کی گئی۔

آخر میں ہم حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی دعا پر اپنی بات کا اختتام کرتے ہیں:

”رب الشرح لی صدری۔ویسر لی امری۔واحلل عقدۃ من لسانی۔ یفقھو قولی۔“

پروردگار میرا سینہ کھول دے، اور میرے کام کو میرے لئے آسان فرمادے اور میری زبان کی گرہ سلجھادے۔تا کہ لوگ میری بات کو سمجھ سکیں۔

دوسرا باب

جستجو رفیقِ جاں

اللہ تعالیٰ نے روز اول سے انسانی جسم کو روح کا تحفہ عطا کیا۔لیکن انسان نے مادیت کی اندھا دھند دوڑ میں اس رفیق جاں کو پس پردہ ڈال دیا۔ایک ایسے دور میں جب مادی خواہشات منہ در منہ اور روحانی تقاضے پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں، یہ تحریر اپنی رفیق جاں کو ڈھونڈتی ایک پر درد صدا کا کام دیتی ہے۔اسے یقین ہے کہ اس کی تلاش رائگاں نہیں جائے گی۔آخر کار وہ اپنے ازلی رفیق کا ہاتھ تھام کر نہ صرف مادی زندگی کی راہوں پر شاداں وفرحاں چلے گی، بلکہ اپنے حقیقی رب کی معرفت بھی حاصل کرلے گی۔امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے کہ 'خدا کی معرفت حاصل کرنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ انسان خود اپنی معرفت حاصل کرے۔خلقت کے ان رازوں اور حکمتوں کو جاننے کی کوشش کرے جو اس کے اندر چھپے ہیں' (بحار الانوار)۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح مادی دنیا بنائی بالکل اسی طرح سے روحانیت کو بھی تشکیل دیا۔ روحانیت اپنی اندرونی کیفیات کے ادراک کا نام ہے۔زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ہر انسان مادی دنیا سے بیزاری محسوس کرتا ہے اور اگر رحمت خداوندی شامل حال ہو تو اندھیروں میں بھٹکنے کی بجائے روحانیت کی اعلیٰ منازل طے کرتا ہوا اس عظیم الشان حقیقت سے جا ملتا ہے۔قدیم مذاہب میں بھکشو مختلف مشقوں کے ذریعے اپنی ادراکی صلاحیتوں کو جلا بخشتے تھے۔عیسائیوں کے مطابق اپنے دل میں محبت وشفقت، انسانیت کا درد، اخلاقیات اور سخاوت سے ادراکی قوتوں اور دوسری الہامی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔اسلامی نقطہ نظر سے غور وفکر، صوم وصلوٰۃ کی پابندی، دعا و مناجات، تسبیحات اور سب سے بڑھ کر اپنی انا کو قابو رکھنے اور تزکیہ نفس سے روحانی صلاحیتوں میں روئیدگی پیدا ہوتی ہے۔

ایرانی مصنف علی رضا رجائی (iv) کے مطابق کرہ ارض ایک نظام کے تحت چل رہا ہے۔دنیا کا چاہے کوئی بھی مذہب ہو وہ تین بنیادی عقائد پر مشتمل ہے یعنی خدا، زندگی اور انسان۔یہ عقائد انسانی زندگی میں ربط اور معنی پیدا کرتے ہیں۔تمام مذاہب کے مطابق انسان اشرف المخلوقات ہے اور ماورائے عقل قوتیں رکھتا ہے۔جب اس کی موت واقع ہوتی ہے تو وہ فنا نہیں ہوتا بلکہ ابدی زندگی حاصل کرلیتا ہے۔ان عقائد پر یقین رکھنے سے انسان مادی اور روحانی دنیا کو زیادہ بہتر

طریقے سے سمجھ سکتا ہے۔ وہ اپنے حالات کا تجزیہ کرتا ہے اور حیات ابدی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ پاتا ہے۔ رجائی کے مطابق تین مذہبی عقائد ذہنی سکون فراہم کرتے ہیں۔

1۔ خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

2۔ خدا ہر طاقت کا سرچشمہ ہے۔

3۔ خدا رحیم، شفیق اور مہربان ہے۔

ان عقائد کی وجہ سے انسان میں خدا پر یقین، صبر، بہادری اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا روحانیت پر یقین رکھنے والے افراد مضطرب نہیں ہوتے اور پر سکون زندگی گزارتے ہیں۔

2.1۔ حواس خمسہ: آلہ دہریت یا خدا پرستی؟

موجودہ موضوع کا حواس خمسہ کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہے۔ انسانی جسم میں ان حواس کی مثال ایسے دریچوں کی سی ہے جو دو طرفہ ترسیل کا کام دیتے ہوں۔ ایک جانب تو وہ بیرونی محرکات کو اعصابی نظام تک پہنچاتے ہس اور دوسری جانب اندرونی کیفیات کو باہر کا راستہ دکھاتے ہیں۔ لہٰذا حواس خمسہ کا تعلق بلا واسطہ دل، دماغ اور روح کے ساتھ ہے۔ البتہ موجودہ دور میں حواس خمسہ کو خود کار آلات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بھی انسانی تاریخ نے روحانی انحطاط کے ایسے ادوار دیکھے جن میں ثابت کیا گیا کہ جس شے کا تجربہ حواس خمسہ سے نہ کیا جا سکتا ہو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ مذہبی لحاظ سے اس رجحان کے دو نتائج سامنے آئے، پہلا تو یہ کہ مادہ پرستوں نے ایسے خدا تشکیل دیئے جنہیں دیکھا اور چھوا جا سکتا ہو۔ ان اعتقادات کی بدولت بت پرستی اور انسان پرستی کا آغاز ہوا، یعنی کہ مادہ اشیا سے بت گھڑے گئے اور حکمرانوں کو خدا ماننے کے راستے بھی استوار ہوئے۔ دوسرا نتیجہ دہریت کی صورت میں نکلا، یعنی کہ اگر ہم خدا کو حواس خمسہ کے ذریعے نہیں پرکھ سکتے تو خدا کا کوئی وجود ہی نہیں۔ ان لادین نظریات کے مطابق دنیا خالق حقیقی کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ وہ آفاقی حادثوں کی وجہ سے وجود میں آئی اور کاروبار کائنات خود کار قدرتی اصولوں پر چل رہا ہے۔ علاوہ ازیں روحانی انحطاط کے ہر دور میں نظام قدرت کے باہمی روابط توڑے گئے اور عوام کو حقائق کی ایک ٹوٹی پھوٹی تصویر پیش کی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ مادیت پرستوں

کے مذموم ہتھکنڈوں میں پھنس کر عوام حقیقت کا ادراک نہ کر پائیں۔ جب ظاہری اشیا میں ہی بامعنی ربط نہ رہے تو نظر نہ آنے والے خدا کا تصور محال ہو جاتا ہے۔ اس کی آسان ترین مثال یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں حواس خمسہ کا تعلق دل و دماغ اور احساسات و کیفیات سے توڑ دیا گیا ہے۔ دنیا کے کسی بھی حصے کا ابتدائی جماعتوں کا سلیبس اٹھا کر دیکھ لیں۔ کنڈرگارٹن، نرسری، مونٹیسوری وغیرہ میں بچوں کو خود مختار حواس خمسہ کا تصور دیا جاتا ہے۔ مثلاً آنکھ کا تعلق باقی چار حواس سے نہیں بتایا جاتا۔ اس کے علاوہ بچوں کو خوشی، ناراضگی اور غصے جیسے بنیادی احساسات کا شعور تو دیا جاتا ہے لیکن ان کا تعلق حواس خمسہ یا دل و دماغ کے ساتھ نہیں جوڑا جاتا۔ لہٰذا معصوم بچے اپنی اندرونی اور بیرونی صلاحیتوں میں ربط قائم نہیں کر پاتے۔ جب کسی کو اس کے اپنے وجود کی ہی مکمل تصویر پیش نہ کی جائے تو وہ وسیع و عریض کائنات اور اس کے عظیم خالق کو کس طرح سمجھ پائے گا؟

اگر ہم لادینیت کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دہریے پن کا آغاز زمانہ قدیم سے ہو گیا تھا۔ یونانی فلسفی کاروکا پہلی صدی قبل از مسیح میں لکھتا ہے کہ ہمارا مقصد حیات اس دنیا میں خوشحال زندگی گزارنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ یونانی یوری پیڈس تیسری صدی قبل از مسیح میں اپنے ایک ڈرامے کے مرکزی کردار بیلروفون کے منہ سے کہلواتا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے۔ پرانی کہانیوں کی وجہ سے بیوقوف نہ بنو۔ پانچویں صدی قبل از مسیح میں دہریت نے ایک طاقتور تحریک کی صورت اختیار کر لی اور سوفی نظریہ (۷) (The Greek Sophists) کے حامیوں نے خدا کے وجود پر سوالات اٹھانے شروع کر دیئے۔ اس تحریک کے حامیوں کا نعرہ تھا کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو۔ دور جدید میں بھی دہریت ایک طاقتور دیو کی طرح نمودار ہوئی۔ کسی بھی نئے نظریئے کے پنپنے کے لئے نظام تعلیم بہترین میدان تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مندرجہ ذیل حصے میں ہم چند فلسفیوں کا ذکر کریں گے جن کے لادین نظریات نے بیسویں صدی کے نظام تعلیم پر واضح اثرات مرتب کئے۔

ڈیوڈ ہیوم (1776ء–1711ء) اپنے دور کا انگریزی زبان میں لکھنے والا سب سے اہم فلاسفر تھا۔ بنیادی طور پر اس نے انسانی اخلاقیات پر بحث کی۔ لیکن بالآخر وہ روایتی مذہبی تصورات کے خلاف سینہ سپر ہو گیا۔ وہ خدا کے وجود، الوہی ادیان اور معجزہ کے خلاف تھا۔ اس کے

مطابق جس نظام کا مشاہدہ یا تجربہ نہ کیا جا سکے، اسے رد کر دینا چاہیے۔ اپنی کتاب 'انسانی افہام و تفہیم کی چھان بین'(vi) میں اس نے بائبل کے دو حصوں (Joshua 10:13-14) اور (Kings 20:9-11) پر خصوصی اعتراضات کئے۔ جوشوا میں اس دن کا واقعہ بیان ہوتا ہے جب حضرت یوشع بن نون کنعان کے میدان میں اموریوں کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے خدا سے دعا کی کہ چاند اور سورج دونوں اپنے مقام پر رک جائیں، تاکہ انہیں فتح حاصل کرنے کے لئے زیادہ وقت مل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور دن لمبا کر دیا، یہاں تک کہ انہوں نے فتح حاصل کر لی۔ کنگز کے مطابق حضرت حزقیا نے دعا مانگی کہ وقت الٹا چل پڑے۔ ان کی دعا قبول ہوئی اور سورج کا سایہ کم از کم آٹھ یا دس قدم یعنی کہ پانچ یا چھ گھنٹے پیچھے ہٹ گیا۔ کرونیکل 31:32 کے مطابق سیاحوں نے اس معجزے کا مظاہرہ کیا۔

ہیوم کا کہنا تھا کہ یہ بیانات کشش ثقل کے اصولوں کے خلاف ہیں۔ فلکیاتی اجسام اپنی حرکات معمول کے مطابق جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا قائم ہے۔ وہ نہ تو اپنے مقام پر رک سکتے ہیں اور نہ ہی الٹے چل سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو کرہ ارض کا نظام ہی تباہ ہو کر رہ جائے۔ جہاں تک معجزات کی شہادت کا تعلق ہے تو چند گنے چنے لوگوں نے ان کی شہادت دی۔ وہ لوگ بھی تعلیم یا عقل و فہم کے لحاظ سے قابل اعتبار نہ تھے۔ ان کے بیانات ایسے سیاحوں کی طرح ہیں جو دوسرے ملکوں کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مذہبی شخص جذباتی ہوتا ہے۔ وہ اپنے عقائد کو ثابت کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑتا۔ چاہے اسے اپنے دعویٰ کے جھوٹ کا یقین ہی کیوں نہ ہو(vii)۔ اس کے علاوہ عوام الناس کے لئے بھی مابعد الطبیعات کے قصے جاذب نظر ہوتے ہیں۔ لہٰذا معجزات کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ معاشرتی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے دین کا رخ کرتے ہیں۔ اپنی ایک اور کتاب 'Treatise on Human Nature' میں وہ لکھتا ہے کہ مابعد الطبیعات نظریات پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ایسے ناقابل فہم عقائد نے معاشرے میں اوہام اور تعصّبات کی داغ بیل ڈالی۔ ہمیں ایک ایسے سائنسی نظام کی ضرورت ہے جس کی بنیاد کلی طور پر حواس خمسہ پر ہو۔ جو شے ہمارے حواس سے نہ گزری ہو ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ جس تصور کی

شہادت نہ دی جا سکے وہ قدرتی قوانین کے خلاف ہوتا ہے۔انہی افکار کی بنا پر اس نے تمام مذاہب کی سچائی ماننے سے انکار کر دیا۔اس کا مشہور مقولہ ہے کہ ’دین انسان کا ایجاد کردہ ہے نہ کہ انسان دین کا‘۔

اس نے 1743ء میں ولیم موریز کو ایک خط میں لکھا کہ ’’خدا کا تصور کئی ایک مسائل پیدا کرتا ہے کیونکہ اسے حواس کے ذریعے سمجھا نہیں جا سکتا۔جب ہم اسے جانتے ہی نہیں تو اس سے محبت کس طرح کر سکتے ہیں‘[viii]۔ Enquiry VI میں وہ لکھتا ہے کہ ’خدا انسانی سوچ سے اس حد تک بالاتر ہے کہ وہ اس کے متعلق کوئی ٹھوس تصور بھی پیش نہیں کر سکتا‘۔DialogueX میں اس نے دعویٰ کیا کہ خدا کے بارے میں تمام تصورات کمزور عقائد پر مشتمل ہیں۔اپنے مضمون ’OnSuicide‘ میں اس نے سفارش پیش کی کہ انسان کو خودکشی کا حق حاصل ہونا چاہیے۔اگر ایک کیڑا انسان کی موت کا باعث بن سکتا ہے تو اسے اپنی خوشی کے لئے اپنی زندگی ختم کرنے کا حق کیوں حاصل نہیں؟اس کا نظریہ تھا کہ علم کی تمام شاخیں انسان کی مرہون منت ہیں۔لہٰذا انسانی فطرت کو سمجھنے کے لئے ہمیں مشاہدہ اور تجربات کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔انسانی دماغ کا مابعد الطبیعات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ نیوٹن کی سائنسی دنیا کی طرح کام کرتا ہے۔اس نے انسانی فطرت کے علم کو ’دماغی جیوگرافی‘ یا ’تشریح الاعضاء‘ کا نام دیا۔دماغی جیوگرافی سے اس کی مراد دماغ کے مختلف حصوں کا مطالعہ تھا۔اس کے نظریہ تجربہ کاری (empiricism) کے اثرات آج بھی ہر شعبہ زندگی اور خصوصاً نظام تعلیم میں بلاواسطہ طور پر رائج ہیں[ix]۔

کارل مارکس[x] انیسویں صدی کا جرمن نژاد فلاسفر تھا۔اس کے نظریہ مارکس ازم نے تقریباً آدھی دنیا کی معاشرتی، معاشی اور مذہبی زندگی بدل کر رکھ دی۔بیسویں صدی میں چین اور روس نے اس کے نظریات سے متاثر ہو کر لامذہبی سٹیٹ کی بنیاد رکھی۔کارل مارکس نہ صرف روایتی طبقاتی نظام بلکہ مذہب کے بھی خلاف تھا۔اس کے مطابق دینی مصیبت ایک حقیقی مصیبت ہے۔دین جبر کا دوسرا نام ہے۔علاوہ ازیں یہ انسانوں کے لئے افیون کا کام کرتا ہے[xi] اس کا کہنا تھا کہ مذہبی ریاستوں میں ایک طبقہ حاوی اور دوسرا محدود ہو جاتا ہے۔جبکہ معاشی ترقی کے لئے تمام طبقوں کو ایک جیسے حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔1870ء میں اس نے سفارشات پیش کیں کہ

تعلیم تمام طبقوں کے لئے عام اور مفت ہونی چاہیے۔اس کے علاوہ تمام مذہبی اداروں کا اثر و رسوخ تعلیم سے ختم کر دینا چاہیے۔کارل مارکس نے بالواسطہ نظام تعلیم کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔لیکن اس کے بعد آنے والے ماہرین تعلیم پر اس کے نظریات کے واضح اثرات پڑے۔

برٹرینڈ رسل (xii) انیسویں صدی کا مشہور برطانوی فلاسفر تھا۔اس نے طریقہ تعلیم میں عملیت پسندی (pragmatism) کا اجراء کیا۔نیشنل لوئس یونیورسٹی کا پروفیسر مائیکل جے راکلر اپنے مضمون 'طریقہ تعلیم پر رسل بمقابلہ ڈیوی' میں لکھتا ہے کہ ویسے تو وہ ایک معاشرتی سائنس دان تھا لیکن بچوں کی تعلیم کے ساتھ اس کا خاص شغف تھا۔اس کی ہر کتاب کا کچھ حصہ طریقہ تعلیم کے لئے مختص ہوتا۔1927ء میں اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر بیکن ہل اسکول کا افتتاح کیا۔رسل بیسویں صدی کے لادین ستونوں میں سے ایک تھا۔'میں کرسچین کیوں نہیں ہوں' میں اس نے خدا، اخروی زندگی، جنت اور دوزخ کے وجود سے انکار کیا۔اس کا خیال تھا کہ کائنات ایک حادثے کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔وہ تمام عمر نہ صرف اپنے عقائد پر قائم رہا بلکہ ہر فورم پر ان کا پرچار بھی کرتا رہا۔

بیسویں صدی تعلیمی نظریات کے لحاظ سے ایک انقلابی صدی تھی۔نظام تعلیم میں نئے مضامین شامل کئے گئے، مثلاً علم نفسیات، اخلاقیات، بچوں کی نشو ونما وغیرہ۔اس کے علاوہ طریقہ تعلیم میں بھی نئی جہتیں پیش کی گئیں۔لیکن اگر غور کیا جائے تو وہ سب اٹھارویں اور انیسویں صدی کے لادین نظریات کی توسیع ہیں۔آج کسی بھی اعلیٰ درجے کی مشرقی یا مغربی یونیورسٹی کا فلسفہ تعلیم کا نصاب اٹھا کر دیکھ لیں تو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے لادین فلسفیوں کے نظریات نظر آئیں گے۔بنیادی طور پر ہمیں ان معاشرتی اور معاشی نظریات سے کوئی پرخاش نہیں۔ہمارا مطمع نظر تو صرف یہ ہے کہ بیرونی دنیا سے برآمد شدہ نظریات کو من و عن ملکی نظام تعلیم میں لاگو نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے ماحول، کلچر اور دین کے خلاف مواد کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیے۔اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ بدیسی افکار کی وجہ سے ہمارے نظام تعلیم میں کہاں جھول پیدا ہو گیا ہے اور اس خلا کو کس طرح سے پر کیا جا سکتا ہے؟ اگر درآمد شدہ افکار کو من وعن قبول کر لیا جائے تو ہمارا حال بھی بے روح اور لادین معاشروں جیسا ہو جائے گا۔اسی

سلسلے میں دور حاضر کی چند مثالیں حاضر خدمت ہیں۔

اس سلسلے میں ہماری شریک تحقیق ش 1 نے بتایا کہ 1990ء کی دہائی میں مجھے ہارورڈ یونیورسٹی میں ESL (English as a Second Language) کورس کرنے کا موقع ملا۔ اس کورس میں تقریباً بیس کے قریب ایشیائی اور یورپی طلبا تھے۔ کورس کے دوران روزمرہ کے مضامین لکھوائے جاتے تھے۔ اسی سلسلے میں ایک انسٹرکٹر نے تاکید کی کہ دور جدید کی معاشرتی برائیوں کے حل پر ایک مضمون لکھو۔ میں نے اپنے مضمون میں مذہب کو انسانیت کے لئے نجات دہندہ قرار دیا۔ وہ مضمون پڑھنے کے بعد انسٹرکٹر نے طلبہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ 'میری نظر سے ایک دلچسپ مضمون گزرا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمام طلبا اسے پڑھیں اور اظہار رائے کریں'۔ اس کے بعد اس نے میرے مضمون کی کاپیاں تمام طلبا میں بانٹیں۔ وہ مضمون پڑھنے کے بعد طلباء نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انسانی تاریخ میں تقریباً تمام جنگیں، قتال اور دوسرے غلط کام مذہب کے نام پر ہوئے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ دنیا کے تمام مذاہب انسان کی بہتری کے لئے آئے۔ البتہ چند مادہ پرستوں نے مذہب کو اپنے ذاتی فوائد کے لئے استعمال کیا اور انسانیت کو نقصان پہنچایا۔ لیکن میرے ہم جماعتوں کے نزدیک مادیت ایک حقیقت جبکہ روحانیت تصوراتی تھی۔ انسٹرکٹر بھی ان طلبا کی ہم خیال تھی۔ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا کہ پرانے زمانے کے لوگ سادہ لوح اور جذباتی ہوا کرتے تھے۔ وہ انبیاء کی بات مان کر ان دیکھے خدا پر یقین کر لیا کرتے تھے۔ لیکن آج کا انسان کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی وجہ سے منطقی ہے۔ وہ دلیل سے بات کرتا ہے، ہر شے کا مشاہدہ اور تجربہ کرنا چاہتا ہے اور ثبوت مانگتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ منہ زور ہے۔ اسے ان چھوئے خدا کی نہیں بلکہ ایک ٹھوس قانون کی ضرورت ہے جو ڈنڈے کے زور سے اسے برائی سے روک سکے۔''

ش 1 نے مزید بتایا کہ ''انہی دنوں ایک تقریب میں میری ملاقات ایک ہسپانوی نژاد امریکی مسلمان لڑکی سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران اتفاقاً نماز کا ذکر آ گیا۔ وہ قدرے تحقیر سے بولی، 'نماز؟ آج کل کے دور میں کون نماز پڑھتا ہے؟ اور پھر ہر نماز سے پہلے وضو؟ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں ہمارے بزرگ نماز پڑھتے ہوں، لیکن آج کل کے مصروف زمانے میں کس کے پاس

اتنا وقت ہے بھلا؟ یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔''

ش 1 نے چین میں بھی کچھ وقت گزارا تھا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ،''چین میں قیام کے دوران ایک انڈر گریجویٹ مسلمان نوجوان سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نوجوان نے بتایا کہ اسکول کے اساتذہ انہیں مذہب کی تباہ کاریوں کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ وہ پیغمبروں سے بھی ناراض تھا۔ اس نے کہا کہ اگر تمام مذاہب ایک خدا کی جانب سے آئے تھے تو پیغمبروں نے مختلف مذاہب کیوں متعارف کروائے؟ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ انسانوں میں اختلاف اور نفرت کا بیج بو رہے ہیں؟ میں نے پوری کوشش کی کہ وقت اور زمانے کے لحاظ سے مختلف شریعتوں اور اصولوں کی ضرورت کو واضح کر سکوں۔ لیکن اس کے نوخیز ذہن میں دین کے خلاف نفرت بھر دی گئی تھی۔ لہٰذا مسلمان ہونے کے باوجود بھی اس نے میرے دلائل ماننے سے انکار کر دیا۔''

یہاں پر نظام تعلیم کا اثر واضح ہو جاتا ہے۔ چین کی تیز ترین معاشی دوڑ کی بدولت اکثر والدین بچے کی مناسب تربیت پر توجہ نہیں دے پاتے۔ اکثر اوقات بچہ ڈے کیئر اور اسکول میں اپنا وقت گزارتا ہے۔ چین کے قانون کے مطابق ایک بچہ پیدا کرنے کی پابندی ہے۔ یوں بچے کو کسی بہن یا بھائی سے بھی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی اور وہ مکمل طور پر معاشرے میں پھیلے رجحانات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس واقعے میں ہم پاکستانیوں کے لئے سبق ہے۔ گو کہ ہم مسلمان معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں لیکن ہمارے ہاں خطرناک حد تک منفی رجحانات عام ہو چکے ہیں۔ اب جبکہ انفرادی خاندانوں کا رواج عام ہو گیا ہے تو والدین کی ذمہ داری اور بھی بڑھ گئی ہے۔ والدین کی مصروفیات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، اپنی اولاد کی صالح تربیت ان کا اولین فرض ہے۔ انہیں نظر رکھنی چاہیے کہ ان کا بچہ/ بچی گھریلو ماحول سے کیا سیکھ رہا ہے اور باہر سے کیا سوغات لے کر گھر واپس آ رہا ہے؟

آج ہمارے نظام تعلیم میں بھی لادینیت کے اثرات نمایاں ہیں۔ دیگر معلومات کی طرح حواس خمسہ کو بھی خودکار آلات کے طور پر پڑھایا جاتا ہے اور ان کا تعلق اندرونی عوامل سے نہیں جوڑا جاتا۔ بتدریج بچہ یقین کر لیتا ہے کہ جو نظر آتا ہے اور جس پر سائنسی تجربہ کیا جا سکتا ہے وہی سچ ہے۔ اس کی سوچ میں اتنی گہرائی پیدا ہی نہیں ہوتی کہ وہ مادی اشیا سے بالاتر ہو کر سوچ سکے۔ سیکولر

طریقہ تعلیم نے مدرسی اور دینی زندگی کو دو مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یوں مذہب کو ذاتی اور تعلیم کو معاشی اور معاشرتی زندگی کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ ذاتی زندگی کا تعلق گھریلو ماحول اور تربیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ آج کل بچہ پیدائش کے چھ ہفتے بعد ڈے کیئر اور اڑھائی سال کی عمر میں اسکول کا سفر شروع کر دیتا ہے۔ جب اسکول سے واپسی ہوتی ہے تو والدین گھر پر ہونے کی بجائے اپنی نوکری پر ہوتے ہیں۔ بالآخر سرِ شام جب ان سے ملاقات ہوتی ہے تو محبت کی بجائے قائدہ قانون اور اصولوں کی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے حالات میں بچہ گھر کے مقابلے میں بیرونی زندگی سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ بیرونی دنیا میں آزادی، گلیمر اور دوست احباب ہوتے ہیں۔ اس طرح بچہ سکول اور اس کے بعد دوستوں یا سوشل میڈیا کے اثرات قبول کرتا چلا جاتا ہے اور بتدریج مادیت سے قریب اور روحانیت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہاں پر ماریہ مونٹیسوری کے طریقہ تعلیم کا مختصر جائزہ بے محل نہ ہوگا۔ مس مونٹیسوری نے بیسویں صدی عیسوی میں حواس خمسہ پر مبنی طریقہ تعلیم کو عام کیا۔ اس طریقہ کو تعمیری تصور (constructivist approach) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اس طریقہ تعلیم میں بچے مختلف النوع تعلیمی اشیاء کے ذریعے حواس خمسہ کو بروئے کار لاتے ہیں۔ موجودہ دور کا طریقہ تعلیم تعمیری تصورات پر مبنی ہے۔ لہٰذا خیال کیا جاتا ہے کہ مونٹیسوری سیکولر تعلیم کے بانیوں میں سے ایک تھی۔ لیکن اس قیاس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ درحقیقت اس کا نعرہ حواس خمسہ کی تربیت کے ذریعے بچے کی روحانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا تھا۔ دنیا کی دو عظیم جنگیں اور انسانی معاشرے پر ان کے اثرات دیکھنے والی ماریہ مونٹیسوری نے تعلیم کو انسانی روح کی تلاش قرار دیا۔ اس کے نزدیک یہی تلاش بیمار معاشرے کے لئے نجات دہندہ کا درجہ رکھتی تھی۔ ماریہ 1870ء میں اٹلی میں پیدا ہوئی۔ وہ میڈیکل کالج کی پہلی طالبہ تھی۔ وہ ایک بہترین ڈاکٹر اور فعال نساء پسند تھی۔ 1907ء میں اس نے غریب اور یتیم بچوں کی تعلیم کے لئے کام شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی شخصیت میں انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ وہ کٹر کیتھولک ہو گئی اور ہر سال کانونٹ میں منعقد ہونے والے روحانی پروگرام میں شرکت کرنے لگی۔ اس نے اپنا شاندار میڈیکل کا شعبہ اور نساء پسندی کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ 1952ء سے لے کر اپنی وفات تک کا عرصہ اس نے تعمیری نظام تعلیم اور روحانیت

کے اجراء کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ مختلف ملکوں کا سفر کرتی، اساتذہ کو تربیت دیتی، کانفرنسز میں حصہ لیتی اور کتابیں لکھتی۔ اس کی تحریروں میں بارہا خدا، یسوع مسیح، اور آسمانی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہے کہ فلاسفر رابرٹ جی بکن میئر کے مطابق خدا نے بچے کو تخلیق کیا اور ماں باپ کو مستعار دیا۔ انہیں چاہیے کہ بچے کی اندرونی صلاحیتوں کا احترام کریں۔

مونٹیسوری کا کہنا تھا کہ بچوں کے اندر فطرتی طور پر تخلیقی صلاحیتیں چھپی ہوتی ہیں۔ مادی نظریات کی وجہ سے طلبا کو اخلاقی اقدار کی پاسداری کے لئے نہیں بلکہ مشینوں کے غلام کے طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ غلام ذہن کے افراد موجودہ دور کی ناہمواریوں مثلاً جنگ وجدل اور قومیت کے اژدھے کے خلاف آواز اٹھانے کے قابل نہیں رہتے۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نے 'آفاقی تعلیم' کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کے تحت کائنات کے عوامل میں ایک ربط پایا جاتا ہے اور ہر جز ایک کل کا حصہ ہوتا ہے۔ اس طریقہ تعلیم میں بچے کو رابطے کے اصول سکھائے جاتے تھے اور اسے حق دیا جاتا تھا کہ وہ کائنات میں اپنا مقام خود منتخب کرے۔ مونٹیسوری نے اسی طریقہ تعلیم کو 'روحانی تعمیر نو' کا نام بھی دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسی تعلیم بچے کے شعور کو مادی ضرورتوں سے بالاتر کر کے اسے روحانی صلاحیتوں کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ اس نے کہا کہ آج کے پرتشدد دور میں روحانی نمو ہی انسان کے لئے نجات دہندہ ہے۔ اس دور کی افراتفری روح کے خالی پن کا نتیجہ ہے۔ یہ احساس معاشرے میں خطرناک رجحانات جنم دیتا ہے، جن میں سب سے خطرناک نوجوانوں میں خودکشی کا رجحان ہے۔ علاوہ ازیں مونٹیسوری انسانیت کی ہمہ گیریت کی بھی قائل تھی۔ وہ تمام انسانوں کو ایک ہی قوم کے افراد گردانتی تھی۔ اسے 1949، 1950 اور 1951 میں نوبل پرائز کے لئے نامزد کیا گیا۔ بعض تحریروں میں مونٹیسوری روحانی نشوونما کا موازنہ جسمانی نشوونما سے کرتی ہے۔ ایک بڑھتے ہوئے بچے کی نہ صرف جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں نمو پا رہی ہوتی ہیں بلکہ روحانی صلاحیتیں بھی بڑھ رہی ہوتی ہیں۔ جس طرح انسانی جنین ماں کی محافظ کوکھ میں نمو پاتا ہے بالکل اسی طرح سے بچے کی روحانی صلاحیتیں والدین اور دیگر افراد کی محبت سے نمو پاتی ہیں۔ اسے ایسی تعلیم وتربیت کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے روحانی تقاضے پورے کر سکے۔ اس نے دو نئی اصلاحات، یعنی 'جاذب دماغ' (absorbent mind) اور 'حساس ادوار' کا

بھی اجراء کیا۔جاذب دماغ کا مطلب یہ ہے کہ بچے کا دماغ ایک ایسے اسپنج کی طرح ہوتا ہے جو ماحول کے اثرات جذب کرتا چلا جاتا ہے۔حساس ادوار میں بچہ تیزی اور انہماک سے سیکھتا ہے۔ مثلاً زبان سیکھنے کے دور میں اس کی تمام صلاحیتیں الفاظ سننے اور سیکھنے پر مرکوز ہوتی ہیں اور جب ہاتھ پاؤں سے سیکھنے کا دور آتا ہے تو وہ حرکات کی جانب متوجہ ہوجاتا ہے۔والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ ان ادوار میں بچوں کو مناسب ماحول اور مواد فراہم کریں۔یہ صرف جسمانی اور تعلیمی نہیں بلکہ ایک روحانی فریضہ بھی ہے۔ان ادوار میں اگر بچے کی ضرورتیں پوری نہ کی جائیں تو وہ روحانی انتشار کا شکار ہوجاتا ہے(xiii)۔

مونٹیسوری نے روحانی جنین کو انسانیت کا سب سے بڑا خزانہ قرار دیا۔اس کا کہنا تھا کہ یہی وہ طاقت ہے جو دنیا بدل سکتی ہے۔بچہ انسانیت کی بقا کا ضامن ہے۔ہمیں چاہیے کہ اس خزانے کی حفاظت کریں ورنہ موجودہ طریقہ تعلیم بچے کو صرف معاشی اور میکانکی معاشرہ تشکیل دینے کی تربیت دے گا۔ایسا معاشرہ اخلاقی انحطاط اور اعلیٰ روحانی قدروں کی پامالی کا شکار ہوگا۔بچے کی مناسب تربیت کے ذریعے ہم دنیا میں مثبت طاقت کا اجراء کرسکتے ہیں۔یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ مونٹیسوری نے حواس خمسہ کا رابطہ اعلیٰ روحانی اقدار کے ساتھ وابستہ کیا،لیکن بعدازاں سیکولر نظام تعلیم نے اس کے نظام تعلیم کو خالصتاً مادیت پرستی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

سیکولر نظام کے برعکس ادیان عالم حواس خمسہ کو ایسی کھڑکیوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو بیرونی معلومات کو اندرونی دنیا تک پہنچاتی ہیں۔یوں اندرونی اور بیرونی صلاحیتوں کے باہم ربط سے انسان اپنی ذات کی شناخت کرتا ہے۔یہی شناخت خدا تک پہنچنے کا زینہ ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ'اس نے تمہاری رہنمائی کے لئے کان، آنکھیں اور دل و دماغ پیدا کئے' (الملک:23)۔

حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ' قلب کا فرض ہے کہ خدا پر ایمان لائے، زبان کا فرض ہے کہ حق بات کہے، کانوں کا فرض ہے کہ سچی بات پر توجہ دیں، آنکھ کا فرض ہے کہ غلط شے کو نہ دیکھے، ہاتھوں کا فرض ہے کہ غلط جگہ پر استعمال نہ ہوں، ٹانگوں کا فرض ہے کہ غلط جگہ پر نہ جائیں اور چہرے کا فرض ہے کہ خدا کے آگے جھکے' (الکافی)۔یہی وجہ ہے کہ روز حشر یہ اعضاء خدا کے حضور

جوابدہ ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ 'بیشک کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے باز پرس ہوگی' (بنی اسرائیل:36)۔

امام حسینؑ دعائے عرفہ میں حواس خمسہ کا ذکر کچھ اس طرح سے کرتے ہیں کہ 'پروردگار میں نور بصارت کی گزرگاہوں' سانس کے گزرنے کے شگاف، قوت شامہ کے خزانوں، قوت سماعت تک آواز پہنچنے کے سوراخوں، ہونٹوں کے اندر دبے ہوئے رموز، زبان کی حرکت سے نکلے ہوئے الفاظ، اپنی نیند، بیداری، حرکات وسکنات، رکوع وسجود کے حوالے سے گواہی دیتا ہوں کہ اگر میں ارادہ بھی کروں اور آخرز مانے تک زندہ رہ کر تیری کسی ایک نعمت کا شکریہ ادا کروں تو یہ ناممکن ہے۔' یہ دعا نہ صرف توحید کے اظہار کا بے پایاں خزانہ ہے بلکہ یہ واضح کرتی ہے کہ ہر انسان کے حواس خمسہ میں جسمانی اور روحانی معلومات کا ایک جہان آباد ہے۔ اس کے علاوہ آئمہ کرام سے منسوب دوسری دعاؤں میں بھی بارہا حواس خمسہ، اعصاب کے ذریعے نظام ترسیل اور اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ کی بہترین صنعت کاریوں کے طور پر کیا گیا ہے۔ یعنی کہ حواس خمسہ کو روحانی کیفیات سمجھنے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اگر ان دعاؤں پر غور وفکر کیا جائے تو دنیاوی معاملات روحانیت سے منسلک نظر آتے ہیں اور مطالب و معنی کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ اپنے شاگرد مفضل ابن عمرو جعفی سے فرماتے ہیں کہ 'اے مفضل! اپنے حواس خمسہ پر نظر ڈالو۔ خدا نے آنکھوں کو پیدا کیا تا کہ رنگوں کو دیکھیں۔ اگر رنگ ہوتے اور چشم نہ ہوتی تو رنگ بیکار تھے۔ اگر چشم ہوتی اور رنگ نہ ہوتے چشم بیکار تھی۔ کانوں کو پیدا کیا تا کہ آوازیں سنیں۔ اگر صدا ہوتی اور کان نہ ہوتے تو آواز بیکار تھی۔ اگر صدا نہ ہوتی اور کان نہ ہوتے تو کان بیکار تھے'۔ جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق آواز سننے کے لئے ہوا کے واسطے کی ضرورت ہوتی ہے اور آنکھ کو روشنی کے واسطے کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں حدیث ہلیلہ امام جعفر صادقؑ کے ایک دہریے کے ساتھ مباحثے پر مشتمل ہے۔ اس ہندی دہریے کا عقیدہ تھا کہ جو چیز حواس خمسہ سے ثابت نہ ہو سکے اس کا کوئی وجود نہیں۔ لہٰذا خدا کا کوئی وجود نہیں (نعوذ باللہ)۔ امام نے فرمایا کہ حواس خود کار نہیں ہوتے۔ ان کا مرکز دل ہے اور دل کی رہنما عقل ہے۔ آنکھوں نے

وہ دیکھا جو اس نے خلق کیا۔ کانوں نے اس کی اتاری ہوئی کتابیں سنیں اور تمام معلومات دل تک پہنچائیں۔ دل نے عقل تک پہنچائیں اور عقل نے یہ فیصلہ کیا کہ ان تمام چیزوں کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور موجود ہے۔ اس دہریہ کا عقیدہ تھا کہ سویا ہوا انسان ایک مردہ کی مانند ہوتا ہے، کیونکہ اس کے حواس خمسہ منقطع ہو جاتے ہیں۔ امام اسی نقطے کے ذریعے اسے روح اور خدا کے وجود کا قائل کرتے ہیں۔ حدیث ہلیلہ طویل ہے۔ لیکن آخر کار اس دہریے نے امام کی مدلل گفتگو سے متاثر ہو کر خدا کا وجود قبول کر لیا اور مشرف بہ اسلام ہوا (التوحید بحار الانوار)۔

ہم نے موجودہ تحقیق میں واضح کیا ہے کہ چھٹی حس جہان روحانی کے لئے کھڑکی کا کام کرتی ہے۔ اس لئے یہاں ہم ش 1 کی کروائی گئی ایک تربیتی ورکشاپ کی مثال پیش کرتے ہیں جو چھٹی حس یا اندرونی آنکھ سے متعارف کروانے کے لئے ترتیب دی گئی تھی۔ ورکشاپ ایسی تربیت کو کہا جاتا ہے جس میں شرکاء عملی طور پر کام کرتے ہیں۔ اس ورکشاپ کا منتہائے نظر یہ تھا کہ طالبات کو ان کی روحانی صلاحیتوں کے ذریعے ارتکاز، غور و فکر، پرسکون رہنے اور اضطراب سے بچنے کی تربیت دی جا سکے۔ اس ورکشاپ کے آغاز میں طالبات کو چھٹی حس اور اندرونی آنکھ کا ربط بتایا گیا۔ چھٹی حس کے لئے اردو زبان میں لفظ 'اشارہ' اور انگریزی میں 'سگنل' بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی شے کو اندر کی آنکھ یا تیسری آنکھ بھی کہا جاتا ہے۔ ورکشاپ کے دوران طالبات کو ایک عملی مشق سے گزارا گیا۔ اس مقصد کے لئے تربیتی ہال کی دیوار پر ایک جاذب نظر کھلونا لگا دیا گیا۔ کھلونے کے سامنے ایک عمودی لائن کھینچی گئی۔ طالبات ایک ایک کر کے لکیر کے آغاز پر کھڑی ہوتیں، پندرہ سیکنڈ تک کھلونے پر اپنی توجہ مرکوز رکھتیں اور اس کی پوزیشن اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتیں۔ اس کے بعد لکیر پر چلتی ہوئی لکیر کے آخری سرے پر پہنچتیں جہاں کھلونا لٹکایا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ الٹے قدموں پر چلتی ہوئی نقطہ آغاز تک واپس جاتیں۔ شرط یہ تھی کہ ان کے پاؤں لکیر سے ہٹنے نہ پائیں۔ جب وہ پہلی مشق کر چکیں تو انہیں ہدایت کی گئی کہ آنکھیں بند کر کے یہی مشق دہرائیں۔ اس ہدایت پر انہوں نے شور مچا دیا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ بہرحال انہیں اس مشق کے لئے تیار کیا گیا۔ ایک طالبہ مشق کرتی اور باقی تماشائی کا کردار ادا کرتیں۔ تماشائی طالبات کو اجازت تھی کہ اگر مشق کرنے والی طالبہ کا پاؤں لکیر سے ہٹ جائے تو شور مچائیں اور جب اس کا

پاؤں واپس لکیر پر آجائے تو تالیاں بجائیں۔ تمام طالبات دو مرتبہ کی مشق کے بعد آنکھیں بند کر کے لکیر پر چلنے کے قابل ہوگئیں۔ وہ نہ صرف اس سادہ مشق سے لطف اندوز ہوئیں بلکہ انہوں نے تیسری آنکھ کے تصور سے کئی ایک اسباق سیکھے۔ کچھ طالبات نے کہا کہ ہمیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم سرکس کے مداریوں کی طرح رسے پر چل رہے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آنکھیں بند ہونے کے باوجود کیا چیز انہیں رہنمائی کر رہی تھی کہ ان کے پاؤں پتلی سی لکیر سے سے ہٹتے نہیں تھے؟ ان کا جواب تھا کہ ارتکاز اور اندرونی آنکھ! جب ہم نے مشق سے پہلے کھلونے کو کچھ دیر تک پوری توجہ سے دیکھا تو ہمارے ذہن نے قبول کر لیا کہ وہی کھلونا ہماری منزل مقصود تھا۔ جب ہماری آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو ہم مکمل طور پر ان پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔ لیکن جب ظاہری آنکھ بند کر کے ایک سیدھی لکیر پر پہلے سیدھا اور پھر الٹا چلنا پڑا تو ہمیں اپنا ذہن وسیع ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ بتدریج وہ پتلی سی لکیر ہمیں اپنے اندر نظر آنا شروع ہوگئی۔ کھلونے کی پوزیشن بھی ذہن نے محفوظ کر لی تھی اور وہ ہمیں ہدایت دیتا تھا کہ کس مقام پر جا کر رکنا ہے اور پھر الٹا چلنا ہے۔ جب الٹے پاؤں واپسی کا سفر شروع ہوا تو وہ مشکل کام تھا۔ اب ہمیں نہ صرف ایک سیدھی لکیر پر چلنا تھا بلکہ اپنا توازن بھی برقرار رکھنا تھا۔ اب اندر کی آنکھ نے اس طرح مدد کی کہ ہمیں اپنے پیچھے لکیر نظر آنا شروع ہوگئی اور ہم احتیاط کے ساتھ پاؤں چلتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ اس گفتگو کے بعد انہیں بتایا گیا کہ اپنی اندر کی آنکھ اور اندرونی صلاحیتوں کو منظم کر کے کس طرح کام میں لایا جا سکتا ہے۔ ہر انسان کے اندر ایک وسیع جہان آباد ہے۔ وہ جہان نہ صرف اپنی ذات کو کھوجنے بلکہ اپنے خالق کو جاننے کا بھی ذریعہ ہے۔ اسی جہان کی مدد سے ہم اچھے اور برے کی پہچان کر سکتے ہیں اور اپنے معاملات میں بہتری لا سکتے ہیں۔ کبھی کبھار آنکھیں بند کر کے اندرونی جہان کو تسخیر کرنے کی کوشش کریں۔ اس سے نہ صرف ارتکاز بڑھتا ہے بلکہ دیگر مخفی صلاحیتیں بھی جلا پاتی ہیں۔ بعد ازاں چند طالبات نے بتایا کہ اس ورک شاپ کے دوران پہلی مرتبہ انہیں اندرونی صلاحیتوں کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور ان کے مناسب استعمال سے ان کی زندگی میں سکون آیا۔ یا یہ کہ اس ورکشاپ کے بعد روحانی صلاحیتوں پر ان کا اعتقاد بڑھا اور انہوں نے مزید تحقیق کی۔ مشکل گھڑی میں نہ صرف اندرونی صلاحیتیں ان کے کام آئیں بلکہ انہیں اپنا لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے واضح

ہدایات بھی ملیں۔ کچھ اور نے کہا کہ انہوں نے اضطراب میں مبتلا کچھ افراد کو ارتکاز اور اندرونی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر پرسکون ہونے کی تعلیم دی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ظاہری آنکھ محدود الٹرا وائلٹ اور انفرا ریڈ شعاعوں کے درمیانی حصے کا ادراک کرتی ہے جبکہ باطنی آنکھ کا دائرہ کار اس سے وسیع تر ہے۔ اسی طرح انسانی قوت سماعت بھی آواز کی لہروں کے ایک خاص تعدد (فریکوینسی) سے سگنل وصول کرتی ہے، جبکہ ہماری فضا اس کے علاوہ بھی بے شمار لہروں سے بھری پڑی ہے۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ ہر قسم کی معلومات انسان کے باطنی شعور میں موجود ہیں لیکن ظاہری اور باطنی شعور کے درمیان ایک پردہ حائل ہوتا ہے۔ فرانسیسی دانشور برگ سون نے باطنی شعور کو زندگی کا کھوج لگانے کا نام دیا۔ اس کے مطابق غیر معمولی خصوصیات کے حامل اشخاص اپنے اعضاء میں موجود یادداشت کی مدد سے معلومات حاصل کرتے ہیں (دی برین آف اسلام)۔ جس طرح سے ٹی وی یا ریڈیو سٹیشن کو سگنلز ملتے ہیں اور وہ ہزاروں میل دور کی ریڈیو فریکوینسی سے رابطہ قائم کر لیتے ہیں، اسی طرح سے بعض اوقات ہماری دماغی لہروں کی فریکوینسی بھی کسی دوسرے واسطے یا میڈیم کے ساتھ ٹکرا جاتی ہے اور ہم غیر مرئی آوازیں سنتے ہیں یا تصاویر دیکھتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگوں کو عالم بیداری یا خواب میں مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا علم ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ انسانی وائبز (بدن کی لہریں) محسوس کرتے ہیں اور مزید کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی ملاقات چند غیر مرئی ہستیوں سے ہو چکی ہے۔ موجودہ دور میں ایسی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن آج بھی انسانوں کی ایک بڑی تعداد کا واسطہ غیر معمولی واقعات سے پڑتا ہے۔ تاہم مادیت پرستی کی وجہ سے ایسے واقعات میں کمی آ گئی ہے۔ مزید یہ کہ آج کل ایسے واقعات ضابطہ تحریر میں لانے کا رواج بھی کم ہو گیا ہے۔

2.2۔ موجودہ تحقیق اور بین المذاہب ہم آہنگی

روحانیت کا عقیدہ تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ ہم نے تعارف کے باب میں کہا کہ اس کاوش کو بین المذاہب ہم آہنگی کا مظہر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مقام پر یہ بھی واضح کیا گیا کہ اس وقت شیطان نے بنی نوع انسان کے خلاف اپنے تقریباً تمام ہتھکنڈے ظاہر کر دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک خطرناک ہتھکنڈہ دلوں میں وسوسہ ڈالنا اور نفرت پھیلانا ہے تاکہ مختلف افکار رکھنے والوں میں جنگ وجدل اور قتال کا سلسلہ جاری رہے۔ لہٰذا بین المذہبی اور بین الفقہی ہم آہنگی وقت کی ضرورت ہے۔ حقیقت تو کہ ہے کہ ہر مذہب اور مکتبہ فکر میں سچائی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ مختلف مذاہب اور فرقے کسی نہ کسی مقام پر آ کر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے چھوٹے چشمے اور دریا مختلف علاقوں کو سیراب کرتے ہیں لیکن آخرکار ایک بڑے سمندر میں جا گرتے ہیں۔ ذیل میں ہم مختلف مذاہب میں موجود عقیدہ توحید اور دیگر چیدہ چیدہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں تاکہ بین المذاہب ہمآہنگی کا تصور واضح ہو جائے۔

ادیان عالم معاشرے کی بہتری کے لئے وجود میں آئے۔ البتہ ان میں سے کئی ایک آج تبدیل شدہ حالت میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں یا تو بتوں کی پوجا کی جاتی ہے یا وہ خدا کے وجود سے ہی بے بہرہ ہیں۔ انہی میں سے ایک ہندو ازم بھی ہے۔ دراصل 'ہندو' دینی نہیں بلکہ جغرافیائی اصطلاح تھی۔ لفظ ہندو سنسکرت لفظ 'سندھو' سے اخذ کیا گیا ہے۔ سندھو دریائے سندھ کا قدیم نام تھا اور سرزمین پاکستان کے تمام علاقوں کو سندھو کہا جاتا تھا۔ زمانہ قدیم سے برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر لاتعداد قبائل آباد تھے۔ ہر قبیلے کے اپنے رسم و رواج، دیوتا اور دیویاں ہوا کرتی تھیں۔ البتہ بیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں کئے گئے انگریزوں کے بعض سروے کے مطابق برہمن ایک خدا کی عبادت کرنے والوں میں سے تھے۔ لہٰذا ان کے مذہب کو 'برہمن ازم' کہا گیا۔ تاہم انہی سالوں میں برطانوی حکومت نے ملکی رائے شماری کے دوران انڈیا کے عوام کو مسلمان، عیسائی اور ہندو آبادی میں تقسیم کر دیا۔ اس ضمن میں تمام ذیلی قبائل کو 'ہندو' کا نام دے دیا گیا تاکہ مسلمانوں کو اقلیت ثابت کیا جا سکے۔ آج ہندو مذہب میں دیوی دیوتاؤں کا ایک ہنگام برپا ہے۔ البتہ ماہرین لسانیات کے مطابق دریائے سندھ کے کنارے آباد آریا قوم کے قدیم ترین افکار میں خدا

کی وحدانیت کا قوی تصور پایا جاتا ہے۔اس سلسلے میں چند ایک مثالیں پیش خدمت ہیں۔

ہندوؤں کی قدیم ترین کتاب رگ وید کے نام سے مشہور ہے۔لفظ 'وید' کا مطلب ہے 'علم'۔رگ وید دریائے سندھ کے کنارے 1500 سال قبل از مسیح میں ترتیب دی گئی۔ ہندووں کے ہاں دو قسم کی مقدس روایات عام ہیں۔پہلی 'شروتی' یعنی 'جو سنا گیا' اور دوسری 'سمرتی'، 'جو یاد کیا گیا' کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ وید اور اپنیشد شروتی روایات سے تعلق رکھتی ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب 'ہندی اردو تنازع' میں لکھتے ہیں کہ رگ وید کے قدیم ترین حصوں، پرانا (ہندوؤں کے قدیم بھجن) اور اپنیشد میں توحید کا نظریہ پایا جاتا ہے۔مثلاً براہمہ سوتر کے مطابق 'خدا ایک ہے۔کوئی دوسرا خدا نہیں، ہرگز نہیں، کسی صورت نہیں'۔

رگ وید (46:64:1) کے مطابق 'خدا ایک ہے لیکن اس کے کئی ایک نام ہیں'۔اس کے علاوہ رگ وید (16:45:6) میں لکھا ہے کہ 'اس کی تعریف جس کا کوئی ثانی نہیں اور جو اکیلا ہے'۔ چاندیوگ اپنیشد (1:2:6) دعویٰ کرتا ہے کہ 'خدا صرف ایک ہے'۔مزید یہ کہ سویتا سواترا اپنیشد (9:6) میں یہ اعتراف پایا جاتا ہے کہ 'اس کے نہ کوئی والدین ہیں، نہ آقا'۔بھگوت گیتا (20:7) کا بیان ہے کہ 'جن کی عقل پر مادی خواہشات کا پردہ پڑ گیا ہو صرف وہی دوسرے خداؤں کی پوجا کرتے ہیں'۔سیوسواترا اپنیشد (20:19:4) کے مطابق 'نہ اس کو کوئی اوپر سے دیکھ سکتا ہے، نہ سامنے اور درمیان سے، اس جیسا کوئی نہیں، اس کا نام عظیم اور اکبر ہے۔اس کی صورت کوئی نہیں دیکھ سکتا۔اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں'۔ ہندوؤں کے قدیم ویدوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت نوحؑ کی شریعت کو مانتے تھے۔ان کے ہاں آج بھی 'مانوسمرتی' رائج ہے۔مانو حضرت نوحؑ کو کہا جاتا تھا اور مانوسمرتی کا مطلب ہے 'حضرت نوحؑ کا قانون'۔رگ وید میں طوفان نوحؑ اور حضرت یونسؑ کا قصہ پایا جاتا ہے، مثلاً قدیم ترین سپتھا برہمانہ، پرانا وغیرہ۔اس داستان کا مرکزی کردار مانو ویوسوتا کے نام سے جانا جاتا ہے۔سنسکرت میں لفظ 'مانو' کا مطلب انسان ہے۔ان دستاویزات کے مطابق مانو ایک مقدس ہستی کا نام تھا۔اس نے عبادت کے ذریعے رب کو راضی کیا۔عظیم سیلاب کے بعد مانو کی کشتی ملایا کے پہاڑوں پر جا کر رکی۔ بعد ازاں اس کی نسل اس کے تین بیٹوں چھرما، شرما اور یاپتی سے چلی۔

قدیم ہندوستان کا دوسرا بڑا مذہب بدھ مت تھا۔ مہا آتما بدھا کی پیدائش 500 سال قبل از مسیح میں بتائی جاتی ہے۔ بدھ مت کے مطابق مہا آتما بدھا ایک قبائلی سردار کے بیٹے تھے۔ انہوں نے انسانیت کے دکھ دور کرنے کے لئے محل کی پر آسائش زندگی چھوڑ دی اور عرصہ دراز تک جنگلوں میں گھومتے رہے اور بودھی (عرفان) حاصل کرنے کے بعد بدھ مت کی بنیاد رکھی۔ حقیقتاً بدھ مت کا مقصد ہندو مذہب میں موجود برائیوں کا خاتمہ کرنا تھا نہ کہ ایک نئے مذہب کا اجراء کرنا۔ مہا آتما بدھا سے منسوب بعض اقوال کے مطابق وہ نئی شریعت لے کر نہیں آئے۔ بلکہ پرانی شریعت سے معاشرتی اور اخلاقی برائیاں دور کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن برہمنوں کی شدید مخالفت کی وجہ سے بدھ مت اور ہندو مذہب دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے۔ مزید براں مہا آتما بدھ کی وفات کے بعد بدھ مت کے پیروکار بھی مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور حقیقی تعلیمات کی شکل بدل گئی۔ آج بدھ مت کے افکار میں توحید کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ لیکن اس مذہب کے مخطوطے مہا آتما بدھا کی وفات کے پانچ سو سال بعد ضابطہ تحریر میں لائے گئے۔ بعض مغربی ماہرین کے مطابق کوئی نہیں جانتا کہ مہا آتما بدھا کی اصل تعلیمات کیا تھیں؟ بہر حال ان کی قدیم کتابوں میں حق اور سچ کے عناصر آج بھی ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ آج ہندو مت اور بدھ مت کے بنیادی عقائد کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ تاریخی شواہد کے مطابق ہر دو مذاہب میں اصلاً بت پرستی کا رواج نہیں تھا۔ پہلی صدی قبل از مسیح میں یونانیوں کی یورشوں کے ساتھ بدھ مذہب میں بت پرستی کا رواج عام ہوا۔ سکندر اعظم کا مقصد نہ صرف دنیا کو فتح کرنا تھا بلکہ یونانی ثقافت کو عام کرنا بھی تھا۔ وہ اپنے ساتھ بیشمار غیر فوجی دستے لے کر آیا تھا۔ وہ خود تو کچھ عرصے بعد ہی زخمی حالت میں یونان کے لئے روانہ ہو گیا، لیکن اپنے پیچھے بے شمار یونانی خواص و عوام چھوڑ گیا، جنہوں نے یونانی ثقافت کو ہندوستان کی زمین پر فروغ دیا۔ اس وقت بت پرستی یونانی تہذیب کا جزو لاینفک تھی۔ بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ سکندر اعظم موجودہ ہندوستان کے علاقوں تک پہنچا۔ لیکن زیادہ تر ماہرین کی رائے کے مطابق اس کی یورشیں موجودہ پاکستان کے علاقوں تک محدود رہیں۔ اسی وجہ سے پہلی صدی عیسوی میں موجودہ پاکستان کے علاقوں (قدیم گندھارا) میں موجود بدھ مذہب کے پیروکاروں نے مہانہ بدھ مت کی بنیاد رکھی۔ اس شاخ کے تحت مہا آتما بدھ اور دوسرے بودھی ستوا

(ایسے عظیم پیشوا جنہیں بودھی حاصل نہیں ہوئی تھی) کے بت بنائے، اوران کی پوجا شروع کردی۔ پانچویں صدی عیسوی تک بت پرستی کا رواج ہندومت میں بھی جڑ پکڑ چکا تھا۔

ہندومت اور بدھ مت کی بدلی ہوئی ہیئت کی وجہ سے آج ہم ان مذاہب میں چھپی سچائیوں کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ موجودہ تحقیق کے دوران ہم نے چند ایک رفقا سے بدھ مت میں پا جانے والے حضرت علیؑ اور امام مہدی آخرالزماںؑ کے تصور کا ذکر کیا۔ انہوں نے یا تو حیرت کا اظہار کیا یا سرے سے اس حقیقت کو ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ مثال کے طور پر یہاں ہم حکیم محمود گیلانی کے تحقیقی کتابچے ایلیا کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کتاب قبل از پاکستان لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں زبور، انجیل اور سنسکرت کے مستند حوالوں کی مدد سے حضرت علیؑ کی پیغمبروں، ہندومت کے بعض رشیوں اور مہا آتما بدھ سے ملاقات کا ذکر ہے۔ 1980ء کے بعد یہ کتاب ناپید ہوگئی، اور 2000ء میں شیعہ ذرائع نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ ایک مرتبہ ہم نے اپنے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ رشتہ دار کو وہ کتاب تحفتاً پیش کی۔ انہوں نے کتاب لے کر اس کی ورق گردانی کی اور معذرت کے ساتھ واپس کردی۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں یقین نہیں آتا کہ حضرت علیؑ نے کبھی ہندوؤں یا مہا آتما بدھ سے ملاقات کی ہوگی۔

ان قدیمی مذاہب کی ارتقاء تاریخ کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ مفاد پرستوں نے ان کے بنیادی ڈھانچے میں کچھ اس طرح افراط و تفریط کی کہ ان کی اصلیت پر پردہ پڑ گیا۔ بدھ مت اور ہندومت پر ہمیشہ سے بھکشوؤں، برہمن منتریوں اور حکمرانوں کا راج رہا جو مادی تقاضوں کے تحت مذہب کے بنیادی اصولوں میں ردو بدل کرتے رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مذہب کو دورخ قوانین پر قائم کیا۔ دین کے بنیادی اصول بھکشوؤں اور عوام کے لئے مختلف تھے۔ بھکشوؤں کے لئے عبادت اور زندگی گزارنے کے اصول انتہائی سخت تھے۔ وہ مراقبہ کی سخت ترین مشقیں کرتے، لباس کے نام پر دو چادریں لپیٹتے یا لمبا چوغہ پہنتے اور اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے بھیک مانگتے۔ انتہائی سخت مشقیں کرنے کے بعد وہ ایسی صلاحیتوں کے حامل ہو جاتے جن کی وجہ سے وہ مذہبی زندگی پر چھا جاتے۔ دوسری جانب عوام کو مذہبی پیچیدگیوں سے دور رکھا جاتا تھا۔ ان کے لئے مذہبی اور نجی زندگی کے اصول انتہائی لچک دار تھے۔ ان کے لئے سٹوپا[1] پر حاضری دینا،

چڑھاوے چڑھانا اور چند اخلاقی روایات کی پاسداری کرنا ضروری تھا۔ یاد رہے کہ جب مذاہب اپنے بنیادی عقائد پر سختی سے عمل پیرا نہیں ہوتے اور خواص وعوام کی خوشی کی خاطر بنیادی اصولوں میں افراط وتفریط کرتے رہتے ہیں تو دین کی اصلیت گم ہو جاتی ہے۔ آج بدھ ازم کے بڑے فرقوں میں خدا کا تصور موجود نہیں۔ لیکن اگر اس مذہب پر بنظر غائر تحقیق کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں رسول خدا صلعم اور آل رسولؑ کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ تذکرہ ثابت کرتا ہے کہ اصلاً اس مذہب میں خدا کا تصور بھی موجود تھا۔

ہمارے ملک کی سب سے بڑی اقلیت عیسائی کمیونٹی ہے۔ اس لئے ان کی مذہبی تعلیمات کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ہمارے الیکٹرانک میڈیا پر ان کے مسائل پر کوئی ڈرامہ یا دستاویزی پروگرام دیکھنے کو نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نہ تو ان کے مسائل سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی خصوصیات سے۔ ذیل میں ہم موجودہ دور کے عیسائیوں کی دعا کی طاقت اور علمی وعقلی صلاحیتوں کو واضح کرنے کے لئے چند واقعات پیش کرتے ہیں۔

عیسائی کمیونٹی میں دعائیہ گروپ کا رواج عام ہے۔ اس گروپ میں متقی اور پرہیز گار عیسائی شامل ہوتے ہیں۔ اگر ان کی کمیونٹی میں کوئی بیمار ہو تو دعائیہ گروپ وہاں جا کر دعا کرتا ہے اور اکثر اوقات ان کی دعا کا جواب بھی آتا ہے۔ ہمارا ایک عیسائی چوکیدار اکثر دیر سے ڈیوٹی پر آتا تھا۔ اس کی چارہ جوئی بھی ہوتی۔ ایک دن اس نے بتایا کہ وہ دعائیہ گروپ میں شامل ہے۔ اکثر اوقات وہ گروپ رات دیر تک دعا میں مصروف رہتا ہے۔ اس لئے صبح وقت پر اس کی آنکھ نہیں کھلتی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد اس نے نوکری چھوڑ دی۔ اس کا کہنا تھا کہ دعائیہ گروپ میں شمولیت کی وجہ سے وہ صبح کی نوکری نہیں کر سکتا۔ وہ بعد از دوپہر کی نوکری تلاش کرے گا۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ اس کے لئے روحانی فرض اتنا اہم تھا کہ اس نے اپنا روزی کا واحد ذریعہ چھوڑ دیا۔ ہمیں دعائیہ گروپ کی افادیت پر بھی کچھ شک تھا۔ لہٰذا ہم نے اپنی بہن سے استفسار کیا جس کا ادیان کا مطالعہ وسیع ہے۔ اس نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو

1 سٹوپا بدھ مت کی عظیم ترین عبادت گاہ کا نام ہے۔

شفا کا معجزہ عطا کیا تھا۔ انہوں نے اپنے کچھ حواریوں کو وہ طاقت ودیعت کی جواب تک بعض صالح اور راست باز عیسائیوں میں موجود ہے۔ بعد ازاں ایک عیسائی شریک کار نے بتایا کہ ان کے والد دعائیہ گروپ میں شامل تھے۔ وہ انتہائی پرہیز گار اور روزہ دار تھے۔ جب کسی دعائیہ گروپ کے ساتھ جاتے تو روزہ رکھ کر جاتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ عیسائیوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جو لوگ بہت زیادہ پرہیز گار ہوتے ہیں وہ کسی رسمی تعلیم کے بغیر ہی قدیم زبانیں، یعنی عبرانی اور لاطینی بولنے لگتے ہیں۔ بائبل میں بھی اس امر کا ذکر موجود ہے۔ میرے والد ان میں سے ایک تھے۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میرے ابو کہتے تھے کہ شفا کے کئی ایک معنیٰ ہوتے ہیں۔ شفا کا ایک مطلب ہے صحت مند زندگی۔ اس کے برعکس انسان ایک ایسے مقام تک بھی پہنچ جاتا ہے جہاں صرف موت ہی اس کی شفا اور آزادی کا باعث بن سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرتی ہوں۔ ہمارے ایک عزیز کی والدہ بیمار تھیں۔ جب دعائیہ گروپ ان کی شفا کی دعا مانگ رہا تھا تو ابو بول پڑے کہ ہمیں ان کی زندگی کی بجائے یہ دعا مانگنی چاہیے کہ خدا کی مرضی پوری ہو۔ بائبل میں لکھا ہے کہ خدا ایک راست باز کی دعا قبول کرتا ہے۔ ہمیں ہمیشہ یہ سوچنا چاہیے کہ کہیں ہماری دعا اس کی مرضی کے خلاف تو نہیں جا رہی؟ اس کے بعد دعائیہ گروپ نے کچھ اس طرح سے دعا مانگنی شروع کی، 'ہم تیرے بندے تیری مرضی چاہتے ہیں۔ تو وہی کر جو تیری رضا ہے'۔ اس دعا کے بعد آدھے گھنٹے کے اندر آنٹی کا انتقال ہو گیا۔ اس لمحے سب نے کہا کہ وہ ہر قسم کی ابتلا اور بیماریوں سے شفا پا گئیں۔'

اسلام اقلیتوں کے ساتھ محبت اور مہربانی سے پیش آنے کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن آج ہمارے بدصورت رویوں کی وجہ سے اقلیتیں گمنامی اور پوشیدگی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو جانتے ہیں کہ ان کے آس پاس ہندو، پارسی، بہائی اور عیسائی افراد بھی آباد ہیں؟ کتنے ہیں جنہوں نے کبھی انہیں یا ان کے ادیان میں چھپی سچائیوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہو یا ان کے لئے درد مند دل رکھتے ہوں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم میں سے کتنے افراد کا ایمان اور افعال اتنے مکمل اور صالح ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اعلیٰ ترین مخلوق یعنی کہ انسان

سے بیزاری کا اظہار کریں؟ دیگرادیان سے بیزاری کے سلسلے میں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم امام العصر کی مملکت کو ایک مثالی حکومت تصور کرتے ہیں تو کیا امام العصرؑ کی سلطنت میں دیگر مذاہب کے ساتھ ناروا رویہ اختیار کیا جائے گا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ عقیدہ ہمارا نہیں بلکہ اغیار کا ہے۔ معصومین کے اقوال کے مطابق امام العصر عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کے فیصلے ان کے اپنے قوانین کے مطابق کریں گے۔ حقیقت تو یہ ہے منافرتیں اور تنگ دلی ان کے قیام کی راہ کے پتھر ہیں۔ دوسری جانب ذہنی ہم آہنگی اور محبت وشفقت امام کے ساتھیوں کا طرہ امتیاز ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ محبت اور نفرت کے جذبات دوطرفہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں چند سبق آموز واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ سروے کے دوران ہماری ملاقات شہر کے ایک قدیم مندر میں رہنے والی ہندو خاتون سے ہوئی۔ وہ جس کھنڈر میں رہتی تھی وہاں نہ پانی تھا، نہ بجلی۔ وہ گلی میں بیٹھی کسی کے گھر سے مانگے ہوئے پانی سے اپنے برتن دھو رہی تھی۔ جب ہم نے اس سے بات کرنا چاہی تو وہ انتہائی نفرت سے چلائی، 'جا جا، چلی جا'۔ ہم نے دوبارہ کوشش کی تو اس نے پہلے سے زیادہ ہسٹیریائی انداز میں چلانا شروع کر دیا۔ ہم شرمندگی کے جذبات دل میں لئے اس گلی سے نکل آئے۔ وہ عورت یقیناً شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھی لیکن ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی نفرت اور ہیجان میں کہیں نہ کہیں ہمارا ہاتھ بھی تھا۔ یہ ہمارے رویئے ہی ہیں جن کی وجہ سے پاکستان تمام دنیا میں مذہبی تعصب اور تشدد کے لئے مشہور ہو چکا ہے۔ امریکہ کی ریاست ٹیکساس میں ہم نے ایک کار پر اسٹیکر لگا دیکھا، جس پر لکھا تھا کہ 'عیسائیوں کو پاکستان کی شدت پسند عوام سے بچاؤ'۔ ہم سب جانتے ہیں کہ عیسائیوں کے خلاف کھلم کھلا حملے سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں نہ کہ ذاتی نوعیت کے۔ لیکن سیاستدان ایسے معاملات میں خود میدان میں نہیں اترتے۔ بلکہ دین کی آڑ میں عوام کے ذریعے اپنے مذموم ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اگر عوام الناس بین المذاہب ہم آہنگی کا شعور رکھتے ہوں تو وہ کبھی دوسروں کے ہاتھوں کھلونا نہ بنیں۔

قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کا بین المذہبی رویہ ہمارے رویئے کے برعکس

تھا۔ انہوں نے ہمیشہ غیر مذاہب اور خصوصاً اقلیتوں کے ساتھ رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی کا خیال رکھا۔ وہ اسلام کے اس زریں اصول پر قائم رہے کہ 'لا اکراہ فی الدین' ترجمہ: دین میں کوئی جبر نہیں (سورہ بقرہ: 256)، یا پھر یہ کہ 'لکم دینکم ولی دین' ترجمہ: تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے (الکافرون: 6)۔ گو کہ تبلیغ کا کام جاری رہا، لیکن تبلیغ محبت، شفقت اور آمادگی کے اصولوں پر کی جاتی تھی۔ ذمیوں کے جان و مال اور دیگر حقوق کی حفاظت مملکت کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ ذیل میں ہم اسلامی تاریخ سے اخذ کئے ہوئے چند بین المذہبی ہم آہنگی پر مبنی چند واقعات بیان کرتے ہیں۔

حضرت علیؑ نے ایک دن کوفہ کی گلیوں میں ایک عمر رسیدہ اور نابینا فقیر کو بھیک مانگتے دیکھا۔ حضرت علیؑ اسے دیکھ کر غمگین ہو گئے اور دریافت کیا کہ کیا اس کا کوئی خاندان یا رشتہ دار نہیں جو اس کی مدد کرے؟ لوگوں نے کہا کہ وہ اکیلا ہے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے لوگوں سے مزید سوالات کئے تو پتہ چلا کہ وہ ایک عیسائی باشندہ تھا۔ جوانی کے زمانے میں وہ محنت مزدوری کر کے روزی کماتا تھا لیکن بینائی زائل ہونے کے بعد اسے کوئی روزگار نہ ملا اور وہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا۔ اتنا سننے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ 'یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک شخص کام کے قابل ہوتا ہے تو لوگ اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جب وہ کام کے قابل نہیں رہتا تو اسے ایک جانب ڈال دیتے ہیں۔ تم سب مانتے ہو کہ جب تک وہ تندرست تھا تو اس نے معاشرے کی خدمت کی۔ اب معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ اسے ایک باعزت روزگار مہیا کرے۔ میں بیت المال سے اس کے لئے تاحیات وظیفہ کا حکم جاری کرتا ہوں' (صوت العدالۃ الانسانیہ)۔

اگر غور کیا جائے تو یہ پنشن کی ایک اولین مثال ہے اور پنشن بھی وہ جو ایک ذمی کے لئے مختص کی گئی۔ اسی طرح حضرت علیؑ نے ایک مرتبہ خطبہ کے دوران گریہ فرمایا۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ 'معاویہ کی فوجوں نے شام کے ایک گاؤں پر حملہ کیا اور ایک یہودی لڑکی کی پازیب اتار لی۔ حالانکہ یہودی جزیہ دیتے ہیں اور حکومت کی پناہ میں ہیں' (شبہائے پشاور)۔ انہی وجوہ کی بنا پر عیسائی مصنف جارج جرداق اپنی تصنیف صوت العدالۃ الانسانیہ میں لکھتا ہے کہ حضرت علیؑ کی شہادت پر ہر صالح اور دردمند آنکھ اشکبار ہوئی لیکن سب سے زیادہ گریہ ذمیوں

نے کیا یعنی کہ عیسائی، یہودی اور ماگی مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد۔

سید محمد شیرازی اپنی تصنیف شبہائے پشاور میں نقل کرتے ہیں کہ خلیفہ دوم کے دور میں جب مدائن کے قیدی مدینے لائے گئے تو خلیفہ نے حکم دیا کہ تمام قیدی عورتوں کو مسلمانوں کی کنیزی میں دے دیا جائے۔ اس وقت حضرت علیؑ نے فرمایا کہ ان میں دو قیدی خواتین شہنشاہ ایران یزدجرد کی بیٹیاں ہیں۔ انہیں عام عورتوں کی طرح کنیزی میں نہیں دیا جا سکتا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ کیا کرنا چاہیے تو آپ نے فرمایا کہ انہیں حق دو کہ وہ جس سے چاہیں نکاح کر لیں۔ ان دونوں میں سے شاہ زناں نے محمد بن ابی بکر اور شہر بانو نے امام حسینؑ کا انتخاب کیا۔ امام زین العابدینؑ بی بی شرق بانوسؑ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اسی طرح امام موسیٰ کاظمؑ کی زوجہ اور امام رضاؑ اور بی بی فاطمہ معصومہ قمؑ کی والدہ عجمی کنیز تھیں۔ انہیں تکمت (آب زم زم کا ایک اور نام) اور خیزران وغیرہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ جب ان کا کارواں مدینے پہنچا تو وہ بہت بیمار تھیں۔ جب انہیں خریدا گیا تو اصحاب حیران تھے کہ ایک لاغر کنیز کو اتنے داموں پر کیوں خریدا گیا (شیخ صدوق)۔ حقیقت یہ تھی کہ امام صادقؑ کی زوجہ اور امام موسیٰ کاظمؑ کی والدہ حمیدہ خاتون کو حضور پاکؐ نے خواب میں ہدایت کی تھی کہ بی بی نجمہ سؑ کو خرید کر اپنی بہو بنائیں۔ ان کے ہاں ایک بہترین بچے کی پیدائش ہو گی۔ امام رضاؑ کی پیدائش کے بعد انہیں طاہرہ کا لقب دیا گیا۔

اس باب کے آخر میں ہم بین المذاہب ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے سفارش پیش کریں گے کہ اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت اقلیتوں علاقوں کی سیر اور دیگر مذاہب کے مطالعہ کے لئے بھی نکالیں۔ علم نفسیات کے مطابق معلومات کی کمی تعصّبات کا باعث بنتی ہے۔ دوسری جانب دوسروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے وسعت نظر اور سوچ میں گہرائی اور تعصّبات میں کمی واقع ہوتی ہے۔

اس باب میں ہم نے واضح کیا کہ اندرونی صلاحیتوں کی تلاش دراصل رب حقیقی کی تلاش ہے۔ اس کے علاوہ حواس خمسہ کے متعلق دو متبادل نظریات کا ذکر کیا گیا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں جدید سائنس کی بنیاد حواس خمسہ پر مبنی تجربات کی بنا پر پڑی۔ اس کے

ساتھ ہی اس دور کے بعض فلسفیوں نے حواس خمسہ کو بنیاد بنا کر ادیان کی حاکمیت سے انکار کر دیا۔ وہ نظریات بیسویں صدی کے سیکولر نظام کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ دوسری جانب ادیان عالم انہی حواس خمسہ کو ادراک، علم و عرفان اور الوہیت کا زینہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بین المذاہب نظریات پیش کئے گئے اور بحث کی گئی کہ دیگر مذاہب کا علم ہمارے رویے میں لچک اور ہماری سوچ میں وسعت پیدا کرتا ہے۔

تیسرا باب

روحانیت:

شراکتی اور کیفیتی تحقیق

اس باب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی کیس اسٹڈی، بیانیہ حصہ اور شرکاء کے جوابات سے حاصل ہونے والی معلومات۔ روحانی بالیدگی کے سلسلے میں شریک تحقیق ش 1 کے سنائے ہوئے واقعات اتنے مکمل تھے کہ انہیں کیس اسٹڈی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

1۔3۔ کیس اسٹڈی

ش 1 کا کہنا تھا کہ ''میں نے زندگی کے ہر دور میں اپنے ماحول اور حالات کے تغیر و تبدل سے روحانی اسباق سیکھے۔ میری خواہش تھی کہ اپنے مشاہدات اور تجربات دوسروں تک پہنچا سکوں تا کہ وہ ان سے فائدہ حاصل کریں۔ اس تحریر کی صورت میں رب ذوالجلال نے میری آرزو کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اسی سلسلے میں چند واقعات پیش خدمت ہیں۔

میرا عقیدہ ہے کہ صاف ستھرا لٹریچر نوجوانوں کی کردار سازی اور روحانی بالیدگی کا باعث بنتا ہے۔ 1980 کی دہائی میں عنایت اللہ صاحب کا رسالہ ُحکایت' عوام میں خاصہ مقبول تھا۔ اس پرچے میں معاشی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی موضوعات پر کہانیاں ہوتیں۔ ہمارے گھر وہ رسالہ باقاعدگی سے منگوایا جاتا تھا۔ میری عمر اس وقت بارہ یا تیرہ سال ہوگی۔ اس وقت کے رواج کے مطابق میں انگریزی میڈیم اسکول میں پڑھتی تھی لیکن قرآن کی تعلیم، گھر کے ادبی ماحول اور اردو کے محنتی اساتذہ کی وجہ سے میں اردو پڑھنے اور لکھنے میں طاق تھی۔ اس رسالے کی اصلاحی کہانیاں ہمارے آس پاس پھیلے سچے واقعات پر مبنی ہوتی تھیں۔ ان میں سے اکثر ایمان کی طاقت اور اخلاقیات کا درس دیتی تھیں۔ ان کہانیوں نے میرے کچے ذہن پر گہرے اثرات چھوڑے اور میری شخصیت کو ایک خاص رنگ عطا کیا۔ اس میں ایک نفسیاتی کالم مقناطیسی شخصیت کے نام سے چھپتا تھا۔ میں اسکول کے زمانے سے ہی وہ کالم شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ اس کالم نے نہ صرف علم نفسیات کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کیا بلکہ میری ذہنی وسعت اور خیال کی

گہرائی میں بھی اضافہ کیا۔ اسی وجہ سے کالج میں میں نے نفسیات کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر اختیار کیا۔

اس کے علاوہ میرے بڑے بھائی کی ذاتی لائبریری نے بھی میرے تصورات کو جلا بخشی۔ بھائی صاحب بھی اس وقت سکول کے طالب علم تھے لیکن وہ ذہنی طور پر سمارٹ تھے۔ وہ ناشر حضرات کو خط بھیج کر نایاب کتابیں منگواتے اور بڑی حفاظت سے الماری میں تالہ لگا کر رکھتے۔ لیکن اگر کبھی ان کی الماری کھلی رہ جاتی تو میں فوراً ایک آدھ کتاب نکال لیتی اور چوری چھپے پڑھتی رہتی۔ میرے لئے سب سے زیادہ متاثر کن دیس بدیس کی کہانیاں تھیں۔ یونانی دیو مالائی قصے، مصر کے قدیمی معبد کدے، ہندوستانی شہزادوں اور قبیلوں کی داستانیں اور قدیم رومیوں کی کہانیاں وغیرہ۔ اس کے علاوہ جنگل جنگل گھومتے، گھنٹیاں بجاتے خانہ بدوشوں کے قافلے جو مہاآتما بدھا کی محبت میں سرشار جاتک کہانیاں گاتے جاتے۔ یہیں سے مجھے یونانی فلسفہ، عیسائیت، یہودیت، ہندوازم، بدھ ازم اور دیومالائی داستانوں کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوا اور میرے بین المذہبی نظریے کا آغاز ہوا۔

میری بین المذہبی سوچ کی ایک اور وجہ اپنے آبائی شہر کا ماحول بھی تھا۔ اس متوسط درجے کے شہر میں شہریوں کی معاشی اور معاشرتی زندگیاں ایک دوسرے کی مرہون منت ہوتی تھیں۔ مسلمان ہو یا عیسائی، آپس میں اچھے تعلقات رکھتے، مل جل کر کاروبار کرتے اور مذہبی رواداری سے پیش آیا کرتے تھے۔ میرے بھائیوں کے گروپ میں عیسائی دوست تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا لگا رہتا۔ اسی وجہ سے مجھے عیسائی مذہب کے بارے میں جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ کالج کے دنوں میں، میں نے اپنی ایک عیسائی دوست سے بائبل مانگی تو میری ایک مسلمان دوست نے تنبیہ کی کہ بائبل مت پڑھنا۔ اس طرح تمہارا ایمان کمزور ہو جائے گا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ میرا ایمان اتنا نازک نہیں کہ بائبل پڑھنے سے کمزور ہو جائے۔ ہاں البتہ اس سے میرا ایمان اور مضبوط ہو گا۔ بعد ازاں میں نے اس بائبل کا مطالعہ کیا اور اسلام اور عیسائیت کے ملتے جلتے نکات تلاش کئے۔ یہاں مجھے 1980ء کی دہائی کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے جب سردیوں کی ایک سہ پہر

دروازے پر دستک ہوئی۔ پھوپھی نے دروازے پر جا کر دیکھا تو باہر عیسائی لڑکیوں کا ایک گروپ کھڑا تھا۔ ان میں سے ایک انگریز مشنری اور دوسری مقامی لڑکیاں تھیں۔ پھوپھی نے انہیں اندر بلایا۔ وہ سب اندر آ کر سہولت سے بیٹھ گئیں۔ وہ عیسائیت کے بارے اردو زبان میں چھپی کتابیں بانٹ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے بھی کتابوں کا ایک سیٹ دیا۔ یہ تو واضح تھا کہ کوئی مسلمان ان کی کاوشوں سے اپنا عقیدہ نہیں بدلے گا۔ لیکن وہ عیسائیت کے بارے میں مسلمانوں کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتی تھیں اور کم از کم میری حد تک ان کا مقصد پورا ہو گیا۔ وہ سیٹ عرصہ دراز تک میرے پاس محفوظ رہا۔ جب کبھی دل میں عیسائیت کے بارے میں کوئی سوال اٹھتا تو میں وہ کتابیں نکال کر ان کا مطالعہ کرتی۔ اب سوچتی ہوں کہ ان تین دہائیوں میں ہماری دنیا کا پانسا ہی پلٹ گیا ہے۔ اس وقت وہ مشنری لڑکیاں کسی خوف اور خدشے کے بغیر شہر کے گلی کوچوں میں گھوم پھر کر تبلیغ کر رہی تھیں۔ آج کل کے حالات میں تو یہ واقعہ ناقابل یقین لگتا ہے۔

سرعت خیال مجھے وراثت میں ملی تھی۔ گھر کا ادبی اور مذہبی ماحول اس میں مزید اضافے کا باعث بنا۔ 1980ء ہی کی دہائی میں ہم عربی ملک بحرین منتقل ہو گئے۔ والد صاحب تعلیم اور سیر و سیاحت سے خاص شغف رکھتے تھے۔ مصروفیات کے باوجود بھی وہ ہمیں باقاعدگی سے برٹش لائبریری، ساحل سمندر اور صحرا کی سیر کے لئے لے کر جاتے۔ جزیرہ البحرین کے لق ودق صحراؤں کی گرمی، ویرانی اور سمندر کی لہریں میرے تخیل کو مزید طاقت پرواز عطا کرتیں۔ سفر کے دوران جب گاڑی چلتی تو میرے خیالات کی روح بھی پرواز کرتی ہوئی نہ جانے کس جہان تک پہنچ جاتی۔ ساحل پر پہنچ کر یوں محسوس ہوتا جیسے سمندر کی لہریں کوئی خاص پیغام دے رہی ہوں۔ ان دنوں میں نے خیالوں ہی خیالوں میں نہ جانے کتنی کہانیاں لکھ ڈالیں۔ والد صاحب نے ہمیں وہ مقام بھی دکھایا جس کی وجہ سے بحرین کا نام پڑا۔ لفظ بحرین کا مطلب ہے دو پانی۔ یہاں ایک مقام پر سمندر کی تہہ سے میٹھے پانی کا چشمہ ابلتا ہے اور سطح سمندر پر دور تک دو پانی اکٹھے چلتے ہیں لیکن آپس میں ملتے نہیں۔ سمندر کی قربت کی وجہ سے بحرین کا پانی کھارا ہے۔ صرف چند ایک میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں۔ قدیم زمانے سے ملاح کشتیوں میں

سوار ہو کر اس چشمے سے پانی لایا کرتے تھے۔

سترہ سال کی عمر میں میں نے ایک افسانہ لکھا جس میں میری روح عالم بالا میں سفر کرتی تھی۔ فرشتوں اور دیگر نورانی اجسام سے ملاقات کرتی اور بیکراں فضاؤں میں چکر کاٹتے ہوئے عرش معلیٰ کے عین تلے جاتی۔ میں نے درستگی کی نیت سے وہ افسانہ اپنے اردو کے استاد کو دیا۔ اگلے روز انہوں نے مجھے دیکھا تو شفقت سے مسکرائے اور کہنے لگے کہ تمہاری روح کہاں عالم ملکوت میں گھوم رہی تھی۔ انہیں وہ افسانہ بہت پسند آیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس افسانے کو اشاعت کے لئے بھجوائیں گے۔ لیکن شاید وہ افسانہ چھپ نہ سکا کیونکہ اس کے بعد انہوں نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

1۔1۔3۔ ملکوں ملکوں کی سیر اور روحانی بالیدگی

بحرین کے قیام کے دوران ہم نے قدرت کا ایک عجیب نظارا دیکھا۔ مغرب کے وقت ہم سمندر کے کنارے بیٹھے تھے کہ اچانک خاموشی چھا گئی۔ ہم میں سے کسی نے اس خاموشی کو محسوس نہ کیا۔ البتہ کچھ دیر بعد جب سمندر کی لہروں نے اچانک شور مچایا تو والد صاحب چونکے اور کہنے لگے کہ یہ کیا ہوا؟ والدہ نے بھی کہا واقعی ابھی تو بالکل خاموشی تھی۔ اچانک اتنا شور کیسے ہوا؟ تب ہم سب نے محسوس کیا کہ مغرب کے وقت سمندر خاموش ہو گیا تھا۔ گلف کا کئی ایک عربی ممالک کے درمیان بہنے والی ایک پرسکون خلیج ہے جس کی لہریں زیادہ شوریدہ سر نہیں ہوتیں۔ بلکہ بحرین کے چھوٹے جزیروں میں تو اس کا ساحل قدیم حویلیوں کے پچھواڑوں تک بھی پہنچ جاتا تھا۔ اس روز جب رکا ہوا پانی چلا تو اس کی لہروں نے معمول سے زیادہ شور مچایا۔ بعد میں میرے والدین اکثر کہا کرتے تھے کہ بچپن سے سنتے آئے تھے کہ جب دونوں وقت ملتے ہیں تو چلتا پانی بھی رک جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا ہوتے ہوئے پہلی مرتبہ دیکھا۔

قرآن پاک نے انسانوں کو دعوت دی ہے کہ زمین پر چل پھر کر خدا کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں۔ ماضی میں لوگ محدود وسائل کے باوجود بھی سیر و تفریح کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

اگر میں اپنے خاندان کی مثال لوں تو ہم جہاں بھی جاتے کچھ نہ کچھ نیا سبق حاصل ہوتا۔کبھی کسی کی غربت،کبھی امارت،کبھی قدرتی مناظر میں خدا کی نشانیاں نظر آتیں۔والدین ان امور پر تبصرہ کرتے اور ہمارا کچا ذہن اس تبصرے کو قبول کرتا جاتا۔آج ہم اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ نہ تو اپنی ذات کے لئے وقت نکال پاتے ہیں، نہ ہی اپنی اولاد اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم گھریلو اور پیشہ ورانہ زندگی کے ساتھ عزیز واقارب اور دوستوں کے ساتھ میل ملاقات اور سیر وتفریح کو بھی مناسب وقت دیں۔سیر وتفریح روزانہ کے معمول سے وقفے کا کام کرتی ہے۔یہ وقفہ نہ صرف جسمانی اور روحانی صحت کے لئے ضروری ہے بلکہ اس سے وسعت نظر بھی پیدا ہوتی ہے۔

کالج کے دنوں میں میں اکثر گرد آلود اور ویران کھنڈرات خواب میں دیکھتی۔ مجھے حیرت ہوتی کہ میں ایسے خواب کیوں دیکھتی ہوں۔عقدہ اس وقت کھلا جب بی-ایس-سی مکمل کرنے کے بعد میں نے ایم اے آثار قدیمہ میں داخلہ لیا اور کئی سال تک آثار قدیمہ کے ساتھ منسلک رہی۔میرا پی-ایچ-ڈی کا مقالہ بدھ مت کے قدیم علوم پر تھا۔عبادت اور ذکر وفکر میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا، خدا سے لو لگانے سے ارتکاز بڑھ گیا تھا اور خیالات میں مزید پختگی آ چکی تھی۔اس کے علاوہ اپنے موضوع سے وابستگی بھی غیر معمولی حد تک تھی۔ان دنوں عجیب واقعات کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ذہنی پرواز کا یہ حال تھا جب بدھ مت کی قدیم عبادت گاہوں کا مشاہدہ کرنے جاتی تو کھنڈرات بولتے نظر آتے اور گویا کہ آنکھوں کے سامنے ایک تصویر چلنے لگتی کہ اس مقام پر کیسے واقعات پیش آئے ہوں گے۔بعد میں ایسے چند ایک واقعات کے بارے میں کتابوں سے ثبوت بھی مل جاتے۔گویا کہ اعلیٰ ارتکاز کی وجہ سے میرا وجدان میرے موضوع میں ڈھل چکا تھا۔کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ میں، میں نہیں ہوں بلکہ اپنے موضوع کی تلاش میں بھٹکتی کوئی روح ہوں۔

انہی دنوں مجھے چین کی پیکنگ یونیورسٹی میں تحقیق کا موقع ملا۔وہاں میرے موضوع سے متعلق مواد تو بہت تھا لیکن اجنبی لوگوں کی اجنبی زبان کی وجہ سے دن خاموشی میں گزر جاتا اور

شامیں فارغ ہوتیں۔ ان اداس دنوں میں عبادت خداوندی میں اضافہ ہوا۔ خاموشی اور عبادت کے امتزاج نے ارتکاز، پرواز خیال اور روحانی کیفیات کو بہت بڑھا دیا تھا۔ پیکنگ یونیورسٹی چنگ حکمرانوں (Qing Dynasty) کے محل میں واقع ہے۔ وہ محل 1898ء میں تعمیر کیا گیا اور چنگ حکمرانی کے خاتمے کے بعد اسے یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کا اولڈ کیمپس تعمیری خوبصورتی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ دیدہ زیب عمارات، منقش دیواریں اور دروازے، گھنے جنگلات، نایاب درخت اور پودے، بانس کے جھنڈ، نہریں، پانی کے خوبصورت تالاب اور شیروں کے مجسمے۔

تصویر#1



پیکنگ یونیورسٹی چین میں ایک سوکھے تالاب کا منظر

بانس کے جھنڈ سے جب ہوا ٹکرا کر گزرتی تو سیٹیاں بجتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ شام کے وقت یونیورسٹی کے ریڈیو اسٹیشن کی نشریات کا آغاز ہو جاتا۔ درختوں کی بلند شاخوں پر اسپیکر لگے ہوتے تھے تاکہ چلنے پھرنے والے افراد نشریات سے محظوظ ہو سکیں۔ ان اسپیکروں سے آتی موسیقی کی آواز جنگلوں کا ماحول اور بھی پرفسوں بنا دیتی۔ شام کی خاموشی میں ایسا محسوس ہوتا گویا کہ آپ جنت ارضی میں چلے جا رہے ہوں۔

بدھ بھکشوؤں کی سوچ بچار کا ایک طریقہ روزانہ کی سیر بھی تھا۔ ان کی عبادت گاہوں میں لمبی راہداریاں پیدل چلنے کے لئے مخصوص ہوا کرتیں جن میں وہ صبح شام پیدل چلتے، اپنی تخلیق اور دوسرے کائناتی عوامل پر غور و فکر کرتے اور ورد کرتے رہتے۔ اس کے علاوہ بھکشوؤں کو یہ تاکید بھی کی جاتی کہ آس پاس کے علاقوں میں ہواخوری کے لئے جائیں اور اردگرد کا مشاہدہ کریں۔ ہواخوری سے تازہ ہوا انسانی دماغ میں جاتی ہے اور قوت ارتکاز اور ادراک کو جلا بخشتی ہے۔ میں نے اس طریقہ کار پر عمل کرنے کا ارادہ کیا۔ پیکنگ یونیورسٹی میری قیام گاہ سے ایک گھنٹے کے پیدل راستے پر تھی۔ میں صبح تو بس لے کر جاتی لیکن واپسی پر پیدل چلتی ہوئی واپس آتی۔ چھ مہینے کی اس باقاعدہ سیر نے میری جسمانی اور ذہنی صحت پر مثبت اثرات ڈالے۔ مطمئن ذہن کے ساتھ ہواخوری کی وجہ سے سوچ کو جلا ملتی اور کئی ایک گتھیاں سلجھ جاتیں۔ بعض اوقات بغیر کسی جدوجہد کے مزید تحقیق کا لائحہ عمل تیار ہو جاتا۔ چلتے چلتے کئی ایک گتھیاں سلجھ جاتیں۔ جس مسئلہ کا کوئی حل نظر نہ آ رہا ہوتا اس کا حل نظر آ جاتا۔ اس عادت کی وجہ سے ذہنی تناؤ کم ہوا اور دل میں محبت اور صبر شکر کے جذبات میں اضافہ ہوا۔ پردیس اور تنہائی کے دنوں میں مجھے احساس ہوا کہ یہ جذبات مشکل وقت میں انسان کے بہترین رفیق ثابت ہوتے ہیں۔ چینی بچوں اور خوبصورت جانوروں کو دیکھ کر میرے دل میں محبت اور شفقت کے جذبات ابھرتے۔ اس کے علاوہ میں قدرتی نظارے دیکھ کر خوش ہوتی اور پاک پروردگار کا شکر ادا کرتی جس نے مجھے اس ان دیکھے دیس تک پہنچایا تھا۔

نومبر 2011ء کی ایک یخ بستہ شام میں پیکنگ یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑی تھی۔ ایک چینی جوڑا میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور مسکرا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میری بیزاری اور بھی بڑھ گئی۔ میں نے سوچا اب وہ پوچھیں گے کہ تم پاکستانی ہو؟ پاکستان ہمارا دوست ہے اور بس۔ یہاں آ کر ان کی انگریزی ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن اس جوڑے کا سوال کچھ مختلف تھا۔ لڑکی پوچھنے لگی کہ تم پروفیسر ہو؟ میں نے کہا نہیں میں طالب علم ہوں۔ وہ کہنے لگی لیکن اپنے ملک میں تو پروفیسر ہو نہ؟ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگی مجھے پتا چل گیا تھا۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ کہنے لگی تمہارا چہرہ علم اور خیال کی روشنی سے چمکتا ہے۔ اس روز میرے اوپر انکشاف ہوا کہ بلندی خیال سے بھی چہرہ چمک سکتا ہے۔

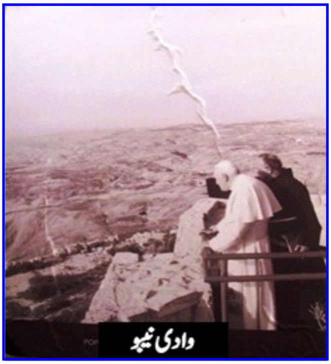
درحقیقت ہمارے اندر تہہ بہ تہہ رکھا علم لو دیتا ہے اور نگاہ کو پاکیزگی عطا کرتا ہے اور یہی پاکیزگی نور خداوندی کی عکاس ہوتی ہے۔ حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ ایمان والوں کا نفس نور ہے (الکافی)۔ اندرونی کیفیات ہمارے ظاہری جسم سے بالکل اسی طرح چھلکتی ہیں جیسے لیمپ کے شیڈ سے روشنی باہر آتی ہے۔ وطن واپس آنے کے بعد میں نے کئی ایک چمکتے چہرے اور چمکتے ہاتھوں کا مشاہدہ کیا۔ ان ہاتھوں سے رزق حلال، مثبت سوچ اور دوسروں کی مدد کے جذبے کی شعائیں نکلتی تھیں۔ کئی سال بعد جب میں نے ہاتھوں کی روشنی کے بارے میں نووا ( ) کا لکھا ہوا مضمون پڑھا تو حیران رہ گئی۔ اس تحقیقی مضمون کے مطابق نہ صرف انسانی ہاتھوں اور ناخنوں بلکہ پیشانی اور پاؤں کے تلووں سے بھی روشنی کے فوٹان خارج ہوتے ہیں۔ ناخنوں سے 60، انگلیوں کی پوروں سے 40 اور ہتھیلیوں سے 40 فوٹان فی سیکنڈ خارج ہوتے ہیں۔ انسانی ناخن منشور (prism) کی طرح روشنی پھیلاتے ہیں۔ تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ جگنوؤں کی طرح انسانی ہاتھوں میں بھی کیمیائی نورانیت (chemo-luminescense) پائی جاتی ہے۔ اگر ہاتھوں پر قدرتی تیل کا مساج کیا جائے تو یہ روشنی بڑھ جاتی ہے۔ البتہ بیمار افراد میں روشنی کا اخراج کم ہوتا ہے۔ یہاں سے حضرت موسیٰؑ کے ید بیضا کا معاملہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ اگر عام انسانوں کے ہاتھوں اور پیشانی سے نور نکلتا ہے اور روحانیت کی وجہ سے چند افراد کے نور میں اضافہ ہوجاتا ہے تو حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالامر نبی کے ہاتھوں سے کیوں نہیں؟ لیکن اللہ تعالیٰ ایسے نورانی امور عام انسانوں کی آنکھوں سے پوشیدہ رکھتا ہے اور وقت آنے پر انہیں عیاں کرتا ہے۔ یوں ایک زمانے کا معجزہ دوسرے زمانے کی سائنس کا درجہ اختیار کرلیتا ہے۔

چین سے واپسی کے کچھ عرصے کے بعد مجھے ایک کانفرنس کے سلسلے میں اردن جانے کا موقع ملا۔ اس کانفرنس میں ایک ہزار سے زائد مندوبین نے شرکت کی تھی۔ ان میں سے اکثر یورپین عیسائی تھے اور اردن کے مقدس مقامات کی زواری کی غرض سے آئے تھے۔ اردن قدیم تہذیبوں اور پیغمبروں کی یادگاروں کا امین ملک ہے۔ یہاں پر بہتا ہوا دریائے اردن (تصویر#2)، وادی نیبو (تصویر#3)، بحیرہ مردار (تصویر#4)۔

تصویر#2



تصویر#3



تصویر#4



200 قبل از مسیح میں سرخ پہاڑوں کو کاٹ کر بنایا گیا شہر پیٹرا خدا کی نشانیوں کی طرح سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ یہاں حضرت لوطؑ کی بیٹیاں اپنے قبائل کے ساتھ آکر آباد ہوئیں۔ مغربی اردن میں موتہ کے مقام پر جنگ موتہ لڑی گئی۔ دور جدید کی مشہور انگریزی فلمیں انڈیانا جونز اور لارنس آف عریبیہ صحرائے اردن میں بنائی گئیں۔

دریائے اردن 251 کلومیٹر لمبا دریا ہے جو اسرائیل، فلسطین، لبنان، اردن اور شام سے ہوتا ہوا بحیرہ مردار میں جا گرتا ہے۔ عیسائی اعتقادات کے مطابق دریائے اردن ایک مقدس دریا ہے۔ اسی دریا کے پانی سے یوحنا اصطباغی نے حضرت عیسیٰؑ کو بپتسمہ دیا۔ بائبل میں دو مرتبہ اس دریا کا ذکر آیا ہے یعنی کہ Joshua 3:14-17 میں جہاں بیان کیا گیا کہ دریائے اردن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے درمیان خشکی کا راستہ بن گیا تاکہ اسرائیلی قوم آسانی سے اسے پار کر سکیں۔ اس کے علاوہ 2 کنگز 11 میں حضرت الیاسؑ کے آسمانوں پر زندہ اٹھائے جانے کا ذکر آتا ہے۔ حضرت الیاسؑ خدا کے مقرب پیغمبروں میں سے تھے، جن کا ذکر، تورات، انجیل اور قرآن پاک میں آتا ہے۔ قرآن پاک میں سورہ انعام آیت 65، اور سورہ الصافات میں آیت 124 سے لے کر آیت 129 تک حضرت الیاسؑ کا مختصر قصہ بیان کیا گیا۔ بائبل کے مطابق حضرت الیاسؑ اور حضرت یوشعؑ جب دریائے اردن کے کنارے پہنچے تو انہوں نے اپنا چغہ اتار کر پانی سے چھوا۔ پانی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ جب وہ دریا پار کر رہے تھے تو آسمان سے آگ (نور) کا گھوڑا اور بگھی نمودار ہوئے۔ انہوں نے الیاسؑ کو اٹھایا اور ایک بگولے کی صورت آسمانوں پر لے گئے۔ یوشع بن نون نے الیاس کا چغہ اٹھایا اور دریا کے کنارے کھڑے ہو کر گریہ کیا۔ دریا کی دوسری جانب کھڑے ان کے پچاس ساتھی وہ نظارا دیکھ رہے تھے۔ عمان کے محکمہ آثار قدیمہ اور ٹورزم نے بائبل کی چند نشانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دریائے اردن کے ایک خشک کنارے پر حضرت الیاس کو آسمان پر اٹھائے جانے کا مقام مختص کیا گیا ہے۔

تصویر#5



حضرت الیاسؑ کو آسمان پہ اُٹھائے جانے کی منظر کشی

بحیرہ مردار کے آس پاس اور دریائے اردن کے کنارے کئی ایک قدیم اور جدید چرچ پائے جاتے ہیں۔ دریائے اردن کے کنارے آج بھی کثرت سے عبادت اور دعا کا سلسلہ جاری ہے (تصویر#6)۔

تصویر#6



دریائے اردن کے کنارے عیسائیوں کی عبادت

دریائے اردن کے آس پاس واقع گرجا گھروں میں دریائے اردن کا مقدس پانی محفوظ کرلیا جاتا ہے اور شیشے کی بوتلوں میں بھر کر زائرین کو دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دریائے اردن میں غسل کرنا بھی ہر بیماری اور خصوصاً جوڑوں کے درد کے لئے اکیرہ سمجھا جاتا ہے۔ بیت اللحم حضرت عیسیٰ ؑ کی بنائی ہوئی پہلی مسجد بیت اللحم اردن سے چار میل کے فاصلے پر اسرائیل کی سرحدوں میں واقع ہے۔ بائبل کی روایات کے مطابق جبل نیبو کو حضرت موسیٰ ؑ کی آخری یادگار قرار دیا جاتا ہے۔ مسیحی روایات کے مطابق اس پہاڑ کے قریب پہنچ کر حضرت موسیٰ ؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تم اسے پار کرلو تو وعدہ کی گئی زمین تک پہنچ جاؤ گے۔ لیکن ان کی قوم نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اے موسیٰ ؑ! ہمارے بچے چھوٹے ہیں لہٰذا ہم اپنے ناتواں بچوں کو لے کر اس پہاڑی پر نہیں چڑھ سکتے۔ یہاں سے حضرت موسیٰ ؑ نے اپنی قوم کے ساتھ جدائی اختیار کی، اکیلے پہاڑ پر چڑھے اور اس کی بلندی سے وعدہ کی گئی زمین کا نظارا کیا۔ اس کے بعد وہ جنگل میں روپوش ہو گئے اور اس کے بعد کسی انسانی آنکھ نے انہیں نہیں دیکھا۔ اسی روپوشی کے دوران ان کی وفات ہوئی اور فرشتوں نے ان کی تدفین کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان کی قوم سالہا سال تک وادی نیبو میں بھٹکتی رہی یہاں تک کہ ان تمام افراد کی موت واقع ہوگئی جنہوں نے پہاڑ پر چڑھنے سے انکار کیا تھا۔ جن بچوں کے بارے میں انہوں نے عذر پیش کیا تھا وہ جوان ہوئے، پہاڑ عبور کیا اور فلسطین میں داخل ہوئے۔

بحیرہ مردار سے جبل نیبو پر چڑھتے ہوئے ایک اور خدائی قدرت کا نظارا دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہاں غیر معمولی کشش ثقل (gravitational anomaly) کا مقام واقع ہے۔ اس جگہ کو (gravitational hill) کا نام دیا گیا ہے۔ اس بلندی پر پہنچ کر سڑک تقریباً عمودی شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن انجن بند کرنے کے باوجود بھی گاڑی بلندی کی جانب چلتی ہے۔ دنیا میں اور مقامات پر بھی غیر معمولی کشش ثقل کے مقامات پائے جاتے ہیں۔ جن میں مسلمانوں کے ہاں سب سے زیادہ مشہور مدینہ کی وادی البیدہ کا کشش ثقل کا مقام ہے۔ سائنسی لحاظ سے غیر معمولی کشش ثقل کی کئی ایک توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی پر بھی سائنسدانوں کا اجماع نہیں ہوسکا۔ کئی ایک سائنس دانوں نے اس امر کو نظر کا دھوکا بھی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ

سرزمین اردن کی ایک خصوصیت ہر رنگ کا پتھر اور مٹی بھی ہے۔ یہ رنگ سیاہ سے لے کر سرخ، سبز، نارنجی اور زرد وغیرہ ہیں۔

تصویر#7



اُردن کے آرٹسٹ مختلف رنگ کے پتھروں سے پچی کاری کرتے ہوئے

اس کے علاوہ ان رنگوں کے مختلف شیڈ بھی ملتے ہیں۔ قدرت کی اس حیرت انگیز صناعی کی وجہ سے اس علاقے میں زمانہ قدیم سے ہی پچی کاری کا رواج پڑ گیا تھا۔

بحیرہ مردار بھی خدا کی عظیم الشان نشانیوں میں سے ایک ہے۔ بائبل میں ازاقیل اور کرونیکل 1120 میں اس سمندر کو نمک کا سمندر، لوط کا سمندر اور سدوم سمقر کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ لمبائی اور چوڑائی کے لحاظ سے اسے ایک جھیل کہا جا سکتا ہے لیکن نمک کی زیادتی کی وجہ سے اسے سمندر کا نام دیا گیا۔ اور اس کے پانی میں نمک کی مقدار عام سمندر سے 6۔ 9 مرتبہ زیادہ ہے۔ نمک کی اس غیر معمولی زیادتی کی وجہ سے اس میں کسی قسم کی زندگی پنپ نہیں سکتی، نہ ہی کوئی شے اس میں ڈوب سکتی ہے اور کوئی کشتی بھی اس کی سطح پر نہیں چل سکتی یعنی یہ کہ اس کی تہہ ہر قسم کی زندگی اور اس کے ساتھ ہی ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نمک میں شفا رکھی ہے۔ نمک میں موجود سوڈیم ہوا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ کے ساتھ عمل درآمد کے ذریعے سوڈیم کاربونیٹ بنا دیتا ہے۔ یوں ہوا میں آکسیجن کی مقدار زیادہ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی کم ہو جاتی

ہے۔ایسی فضا سانس کی بیماریوں اور ذہنی تناؤ میں مبتلا اشخاص کے لئے اکیرڈ ثابت ہوتی ہے لیکن بحیرہ مردار کے نمکیات کی شفا پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ شفا ہوا میں موجود کثیر آکسیجن کی وجہ سے ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے 417 میٹر نیچے ہے اور دنیا کا زیریں ترین مقام ہے۔اس سطح تک پہنچتے ہوئے سورج کی نقصان دہ الٹرا وائلٹ شعاعوں کا اثر کم تر ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس آکسیجن اس تیزی سے پہنچتی ہے جیسے کنویں میں ہوا داخل ہوتی ہے۔بحیرہ مردار کے ساحل کی مٹی بھی صحت وصفائی کے لئے تمام دنیا میں درآمد کی جاتی ہے۔

اردن کی وادی الفیان میں واقع خربت النحاس کے مقام پر دنیا کی سب سے بڑی، قدیم ترین اور تانبے کی کانوں کے آثار موجود ہیں۔3000 سال قبل از مسیح میں یہاں عظیم الشان تہذیب پائی جاتی تھی۔ان لوگوں نے تانبے کی ان کانوں سے اس قدر دھات نکالی اور بھٹیوں میں اس کثرت سے اسے پگھلا کر آلات اور روزمرہ کی اشیا تیار کیں کہ حیات کا توازن بگڑ گیا، زمین بنجر ہوگئی، جانور ناپید ہوگئے اور پانی کے ذخیرے خشک ہو گئے۔جب تانبے کی کانیں بھی ختم ہو گئیں تو انہیں پتا چلا کہ وہ زندگی کی جنگ ہار چکے تھے۔ان میں سے کچھ حالات کی سختی کا شکار ہو گئے۔جو بچ گئے وہ انجانی منزلوں کی جانب ہجرت کر گئے اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کے نشان چھوڑ گئے۔

2۔1۔3۔قرآن پاک اور حج بیت اللہ کی تجلیات

میں نے اپنی زندگی میں قرآن پاک اور حج بیت اللہ کی تجلیات دیکھیں اور دوسرے رفقائے کار سے اس سلسلے میں واقعات سنے۔مندرجہ ذیل سطروں میں چند واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

ہماری برادری میں قرآن پڑھانے کا باقاعدہ ہدیہ طے نہیں کیا جاتا تھا۔چند ایک مرد حضرات لیکن زیادہ تر خواتین بچوں کو بلا معاوضہ قرآن پڑھایا کرتی تھیں۔ہمیں خاندان کی ایک خاتون نے قرآن پڑھایا۔اس تحقیق میں ہم انہیں باجی کے نام سے پکاریں گے۔خدا نے انہیں قرآن پاک پڑھانے کے لازوال جذبے سے نوازا تھا۔انہوں نے انتہائی جوانی

کے دور میں قرآن پڑھانا شروع کیا اور اپنی وفات تک وہ چار نسلوں کو قرآن پڑھا چکی تھیں۔ ان کی شخصیت اتنی رعب دار تھی کہ انہیں باقاعدہ ہدیہ پیش کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ نہ ہی کبھی انہوں نے خود ایسا سوچا۔ البتہ خاندان کے مختلف افراد کی جانب سے ان کے لئے ہر وقت تحفہ تحائف کا سلسلہ جاری رہتا۔ ان کے خاوند باقاعدگی سے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا گھر اجناس سے بھرا ہوتا اور ہر خوشی غمی کے موقع پر ان کا لباس سب خواتین کے مقابلے میں بہتر ہوتا۔ شاید وہ بھی قرآن پاک پڑھانے کا ہی اعجاز تھا کہ تمام عمر معمولی بیماریوں کے علاوہ کوئی بیماری انہیں چھوکر بھی نہ گزری تھی۔ آخر دم تک ان کے قویٰ مضبوط اور جسمانی طاقت بحال رہی۔ اس کے علاوہ جب ان کے خاوند نے کاروبار کا آغاز کیا تو وہ ایسا جما کہ گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگئی۔ وہی باجی جو ایک پرانے مکان میں رہتی تھیں اب ان کے کئی ایک کوٹھیاں اور مکان تعمیر ہو گئے۔ زیارات تو وہ تنگدستی کے دور میں ہی کر چکی تھیں۔ لیکن برادری میں سب سے پہلا حج باجی اور ان کے خاوند نے کیا۔ اس وقت حج بہت مہنگا ہوا کرتا تھا اور صرف اہل ثروت ہی حج کی استطاعت رکھتے تھے۔ ان کی امارت بھی ان کے قرآن پاک پڑھانے کے جذبے کو کم نہ کرسکی اور وہ مرض الموت تک بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی رہیں۔ جب مجھے حج کی سعادت نصیب ہوئی تو مدینہ میں میں نے قرآن پڑھ کر ان کے لئے دعا مانگی۔ اسی رات انہیں خواب میں باجی اور دیگر مرحوم خواتین کو دیکھا۔ سب خواتین کے چہرے اور لباس کسی انہونی سی روشنی میں چمک رہے تھے لیکن باجی کی بات ہی کچھ اور تھی۔ انہوں نے بے حد چمک دار سفید ریشمی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ سب خواتین آپس میں بات چیت اور ہنسی مذاق میں مصروف تھیں۔ ان کی کھنکتی ہوئی ہنسی زندگی سے بھرپور تھی۔ خواب میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے باجی زندہ ہیں اور میں نے بے حد شرمندگی محسوس کی کہ میں نے ایک زندہ انسان کو مرحوم سمجھا اور ان کی مغفرت کی دعا مانگی۔ بیدار ہونے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ شاید قدرت نے مجھے ان کی جاوداں زندگی کا ایک ہلکا سا عکس دکھایا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن پڑھنے اور پڑھانے کا اجر خدا خود ہی جانتا ہے۔ ہم جیسے معمولی انسانوں کے لئے اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔

اس کے علاوہ ہمارے محلے کے قریب ہی ایک حافظ صاحب رہتے تھے۔ان کے خاندان میں وراثتی طور پر نابیناپن چلتا تھا۔لیکن اس کے ساتھ آواز کا بے مثال لوچ بھی ان کی خاندانی وراثت کا حصہ تھا۔قاری صاحب جب تلاوت قرآن پاک کرتے تو لوگوں پر وجد طاری ہوجاتا۔ عام لوگوں میں مشہور تھا کہ جب وہ قرآت کرتے ہیں تو جنات حاضری دیتے ہیں۔ان کی ایک نابینا بہن کا میرے ساتھ خاص شغف تھا۔اگرانہیں کہیں آنا جانا ہوتا تو میرے ساتھ جایا کرتی تھیں۔اسی وجہ سے اکثر میرا ان کے گھر آنا جانا لگا رہتا۔بچپنے کے باوجود میں محسوس کرتی کہ ان کے ہاں ہر چیز کی ریل پیل لگی رہتی ہے۔پھل فروٹ اور کھانے پینے کی دوسری اشیا میزوں پر پڑی نظر آتیں۔حافظ صاحب کے پاس مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ہروقت لوازمات اور چائے چلتی رہتی۔بذلہ سنجی ایسی کہ گھر میں ہروقت ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں گونجتی رہتیں۔مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی ان کے گھر میں کوئی جھگڑا ہوتے دیکھا ہو حالانکہ ناسمجھی کے دن تھے لیکن اکثر میرے دل میں خیال آتا کہ اس گھر میں قاری صاحب،عورتوں اور بچوں کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔قاری صاحب کی کوئی باقاعدہ نوکری بھی نہیں تھی۔تو پھر ان کے گھر اجناس کی اتنی ریل پیل کس طرح لگی رہتی ہے؟اس وقت مجھے یہ شعور نہیں تھا قاری صاحب کے گھر میں صوم وصلوات اور قرآن پاک کی تجلیات نظر آتی ہیں۔بعدازاں قاری صاحب کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلے میں بھی کئی گنا زیادہ رزق عطا کیا۔

قرآن پاک کا ایک عجیب اعجاز ہم نے اس وقت دیکھا جب ہم جزیرہ البحرین میں منتقل ہوئے۔اس وقت میرے چھوٹے بھائی کی عمر تیرہ سال تھی۔وہاں ہمارے گھر کی پچھلی دیوار مسجد کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔رمضان کا مہینہ آیا تو امی نے خلاص کھجوریں افطاری کے لئے بھجوائیں۔ 'خلاص' یعنی کہ ختم ہوجانے والی بحرین کی عمدہ اور مہنگی ترین کھجور ہوا کرتی تھی۔اس میں قدرتی طور پر اتنا زیادہ شیرہ بھرا ہوتا ہے کہ وہ تازہ حالت میں ایک دن سے زیادہ نہیں رہ سکتی تھی۔اسی وجہ سے وہ کھجور ملک سے باہر درآمد بھی نہیں ہوسکتی۔بحرینی اس کھجور کو عموماً دھوئے بغیر کھاتے تھے کیونکہ دھونے سے اس کی مٹھاس کم ہوجاتی تھی۔اسی وجہ سے اس کھجور کو چھوئے بغیر ٹوکریوں میں ڈال کر بازار پہنچایا جاتا تھا۔ہماری والدہ کو ہر چیز دھونے کی عادت تھی۔لہٰذا جب وہ کھجوریں دھو

رہی تھیں تو انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر ہر کھجور پر سورہ اخلاص پڑھنی شروع کر دی۔ شام کو جب انہوں نے وہ کھجوریں بھائی کو دیں تو وہ ناراض ہو گیا۔ کہنے لگا امی یہ لوگ تو افطاری کے بعد مرغوں کے مرغے کھا جاتے ہیں اور آپ ان کے لئے صرف کھجور بھیج رہی ہیں۔ امی نے ہنس کر کہا، تم لے کر تو جاؤ۔ میں نے ہر کھجور پر بسم اللہ پڑھ کر سورہ اخلاص پڑھی ہے۔ تم دیکھنا کہ وہ لوگ ان کھجوروں کو کتنا پسند کرتے ہیں۔ امی نے تو بچے کو بہلانے کے لئے ایک بات کہہ دی تھی لیکن در حقیقت ہوا بھی وہی۔ بھائی جب مسجد سے واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ کہنے لگا کہ امی تمام لوگوں نے کھجوریں بہت پسند کیں۔ وہاں افطاری کے لئے اور بھی چیزیں تھیں لیکن وہ لوگ ایک ایک کھجور اٹھاتے جاتے اور پوچھتے جاتے کہ آخر تمہاری والدہ نے یہ کھجور کہاں سے منگوائیں، اس سے پہلے ہمیں خلاص کا ایسا ذائقہ کبھی نہ آیا۔ بعد میں والدہ اکثر کہتی کہ سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کتنی برکت ہے کہ چیزوں کا ذائقہ ہی بدل جاتا ہے۔ اسی لئے شہید مرتضی مطہری Light within me' میں لکھتے ہیں کہ ہر سورہ کی بسم اللہ دوسری سورہ سے مختلف اثرات رکھتی ہے۔ ہر سورہ کی بسم اللہ اس کے کسی خاص لفظ یا الفاظ کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ جیسے سورہ توحید کی بسم اللہ لفظ الحمد سے رابطہ رکھتی ہے۔ اسی لئے ہر سورہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔

بہت دور کی نہیں، بلکہ 1980 کی دہائی کی بات ہے کہ تقریباً ہر مسلمان معاشرے میں کثرت سے ختم قرآن کی محفلیں سجتیں۔ ان میں زیادہ تر مرحومین کے ایصال ثواب کے لئے برپا کی جاتی تھیں۔ مسجدوں اور گھروں میں قرآن پاک کے پارے رکھے رہتے۔ اس کے علاوہ لوگ گھروں میں نئی چادریں اور تکیے ختم قرآن پاک کے لئے الگ سے رکھتے۔ قرآن پاک پڑھنے کا اصول یہ تھا کہ آواز کم از کم اپنے کانوں تک ضرور پہنچے۔ ختم قرآن کی محفلوں میں خاص خیال رکھا جاتا کہ آواز اتنی بلند نہ ہو کہ آس پاس قرآن پاک پڑھتے ہوئے لوگ متاثر ہوں۔ ان معطر محفلوں کا ایک ملکوتی تاثر ہوا کرتا تھا اور وہ نورانی محفل مدھم آوازوں کے زیر و بم سے اس طرح تھرتھراتی جیسے ورید جاں لہو کی گردش سے تھرتھراتی ہے۔ اس تصنیف کے حصہ دوم میں ہم نے وہابیت کا ذکر کیا ہے جس کے نظریات کے تحت پرانی روایات کو بدعت قرار دے دیا گیا۔ اس وقت ایک سینئر صاحبہ کا درس سننے کو ملا جنہوں نے کہا کہ ایصال ثواب کے لئے برپا کی ہوئی ختم قرآن کی محفلوں کا

کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ مرحومین کو صرف وہی اعمال فائدہ دیتے ہیں جو وہ خود سرانجام دیتے ہیں۔ آپ کا بھیجا ہوا کوئی بھی عمل مرحومین تک نہیں پہنچتا۔ ان نظریات کا ہمارے اوپر تو زیادہ اثر نہیں پڑا لیکن عمومی طور پر دیکھا جائے تو ایسے افکار عام ہونے کے بعد ختم قرآن پاک کی محفلوں میں تیزی سے کمی واقع ہوئی۔

اس کے علاوہ لوگ روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک سہ پہر میری والدہ نے ایک بزرگ خاتون کے گھر مجھے کسی کام سے بھیجا۔ وہ خاتون 'اماں' کے نام سے مشہور تھیں۔ جب میں دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو دیکھا کہ اماں صحن میں بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ ان کی آواز میں کچھ ایسا جادوئی اثر تھا کہ میں مبہوت رہ گئی۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا کہ وہ عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ نہ جانے کس گھڑی ان کی زندگی کے دن پورے ہو جائیں اور ان کی ملکوتی آواز بھی کہیں کھو جائے۔ لہٰذا ان کی قرآت ریکارڈ کر لینی چاہیے۔ اس وقت موبائل کا زمانہ تو تھا نہیں، ریکارڈنگ کے لئے مجھے ان کے گھر ٹیپ ریکارڈر لے کر جانا پڑتا۔ میں سوچتی ہی رہ گئی اور ایک دن ان کی وفات کی خبر مل گئی۔ ان کے جنازے پر میں سوچ رہی تھی کہ کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھیں۔ عین ممکن ہے کہ سہ پہر میں انہوں نے تلاوت قرآن پاک بھی کی ہو۔ کاش گزشتہ روز ہی ان کی تلاوت ریکارڈ کر لی ہوتی۔

اسی طرح ہماری ایک عزیزہ نے حج کے دوران تلاوت قرآن پاک کی ایک ملکوتی آواز سنی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ 2015ء میں حج کے لئے گئیں۔ مزدلفہ کے مقام پر حاجی کھلے آسمان تلے ایک رات گزارتے ہیں۔ یہ رات زندگی کی تمام راتوں سے مختلف اور عجیب تجلیات کی حامل ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال ہو تو صرف یہی ایک رات انسان کی زندگی بدلنے کے لئے کافی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ اس رات عبادت کرنے کے بعد وہ سو گئیں۔ ان کے آس پاس خواتین اور پاؤں کی جانب مرد حضرات سو رہے تھے۔ شاید وہ کچھ دیر ہی سوئی ہوں گی کہ تلاوت قرآن پاک کی آواز نے انہیں جگا دیا۔ وہ کچھ دیر لیٹی مسحور کن آواز سنتی رہیں۔ قاری دھیمی آواز میں ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھ رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مرد حضرات میں سے کوئی تلاوت کر رہا ہے۔ لہٰذا وہ مردوں کی جانب پیٹھ کئے اٹھیں اور وضو کرنے چلی گئیں۔ جب وہ وضو کر کے واپس آئیں تو ان کی

نظر مرد حضرات پر پڑی۔ وہ سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ انہوں نے گھڑی دیکھی تو فجر میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ انہوں نے نفل شب ادا کئے۔ وہ اس ہستی کی شکر گزار تھیں کہ اس نے انہیں مزدلفہ کے مبارک مقام پر نفل شب کے لئے جگایا۔ وہ کہتی تھیں کہ مرد حضرات تو سب سو رہے تھے میں آج تک حیران ہوں کہ وہ پر اثر آواز کس کی تھی؟

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے اردن کی سیر کا ذکر کیا۔ وہاں ہمارا قیام بحیرہ مردار کے کنارے واقع ایک ہوٹل میں تھا۔ میں ہر روز اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر سمندر کے کنارے چلی جاتی۔ ان دنوں میری طبیعت تلاوت قرآن پاک کی جانب مائل تھی۔ میرے بیگ میں چھوٹا سا قرآن ہوتا اور میں ساحل سمندر پر بیٹھ کر تلاوت کرتی رہتی۔ اسی اثنا میں سورج ڈوب جاتا اور سرمئی اندھیرا اپنا مقام بنانا شروع کر دیتا، لیکن میں تلاوت قرآن پاک کے سحر میں گرفتار بحیرہ مردار کے کنارے بیٹھی رہتی۔ اندھیرے کے بعد ساحل پر رکنا منع تھا کیونکہ قریب ہی اسرائیل کی سرحدیں واقع تھیں۔ لہٰذا گارڈ کی سیٹیاں وہاں سے اٹھنے پر مجبور کرتیں۔ ایک روز میں تلاوت قرآن پاک میں مصروف تھی کہ ایک طویل قامت مغربی خاتون پر نظر پڑی۔ وہ کچھ فاصلہ رکھ کر کچھ اس طرح سے کھڑی تھی کہ اس کے جسم کا رخ سمندر کی جانب اور چہرہ میری طرف تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ تلاوت کی آواز سے لطف اندوز ہو رہی تھی لیکن پنجوں کے بل اس طرح سے تیار کھڑی تھی کہ جیسے ہی میری نظر پڑے تو وہ بھاگ نکلے۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔ وہ دوڑی چلی آئی۔ اس نے پوچھا کیا تم ہندو ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ اس نے دوبارہ سوال کیا۔ کیا تم ڈوبتے سورج کی پوجا کر رہی ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ اس نے پوچھا یہ تمہارے ہاتھ میں کیسی کتاب ہے؟ میں نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور یہ قرآن پاک ہے۔ وہ کہنے لگی میں نے ایسی پرسوز اور سریلی آواز اس سے پہلے کبھی نہیں سنی۔ اس آواز نے مجھے تمہاری جانب کھینچا اور میں نے بہت سکون محسوس کیا۔ کیا میں کچھ دیر کے لئے تلاوت سن سکتی ہوں؟ میں نے کہا کیوں نہیں؟ اس کے بعد وہ دیر تک آنکھیں بند کئے تلاوت قرآن پاک سنتی رہی۔ تلاوت قرآن پاک کے اثرات سے کس کو انکار ہوگا؟ لیکن مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ بحیرہ مردار کے کنارے مسلسل تلاوت

کرنے سے کب اور کیسے میری آواز کی تاثیر میں اضافہ ہو گیا تھا۔اس کے بعد میں نے محفلوں میں تلاوت قرآن پاک کا آغاز کیا۔

حج بیت اللہ بھی انسانی زندگی بدلنے کی مقناطیسی تاثیر رکھتا ہے۔اس سلسلے میں چند واقعات حاضر خدمت ہیں۔

ش 1 نے بتایا کہ جب مجھے حج کی سعادت نصیب ہوئی تو مکہ پہنچنے کے بعد میری اندرونی کیفیت بالکل بدل گئی۔ میں مکہ کی نورانی گلیوں میں چلتی جاتی اور حیرت کرتی کہ میں، میں نہ رہی تھی۔کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے میں مر چکی ہوں اور میری روح میرے جسم سے الگ ہو گئی ہے۔ میری دنیاوی شناخت جیسے کہیں کھو سی گئی تھی، نہ ڈگریاں، نہ حیثیت و مرتبہ، نہ پیشہ، نہ میں ایک مصنفہ تھی کہ جسے عالم جانتا تھا۔وہ اوصاف کچھ فاصلہ رکھ کر میرے ساتھ چلتے رہتے لیکن میرے نئے وجود میں ضم نہ ہوتے۔ میں دوئیت کا شکار ہو گئی تھی۔ان دو میں سے میں کون تھی؟ میرا حال ایسا تھا جیسے کسی بہت بڑے ہجوم میں اپنی ماں سے کھویا ہوا کوئی حیران و پریشان بچہ۔اسی حیرانی میں ایک دن انکشاف ہوا کہ تمام زندگی اعمال و افعال میں خلوص ناپید رہا اور خالص خدا کے لئے کچھ نہ کیا۔اس کے ساتھ ہی ایک عجیب سی ندامت نے آ گھیرا اور یہ بھی احساس ہوا کہ حج بیت اللہ شاید وہ واحد عمل ہے جو خالص خدا کے لئے سرانجام دے رہی ہوں۔البتہ صحن کعبہ میں داخل ہوتے ہی وہ خاص قسم کی پریشانی ختم ہو جاتی اور جسم و جاں ایک ہو جاتے۔میں، میرا پالنے والا عظیم رب اور اس کا برگزیدہ گھر، بس ان تین نقطوں کی تکون میں میرا وجود چکر لگاتا رہتا۔خانہ کعبہ کا سیاہ لبادہ اس کے رعب و دبدبہ اور شان میں اور بھی اضافہ کرتا اور میں حاجیوں کے سمندر میں ضم ایک ذرے کی طرح طواف میں مصروف رہتی۔

وطن واپسی پر میں اکثر سوچتی کہ آج تک خالص خدا کے لئے کیا کیا؟ اس کے کچھ عرصے بعد ایک دن جب میں اپنے پودوں کو پانی دے رہی تھی تو خدا کی اس سرسبز و شاداب مخلوق نے میری سوچ کو ایک نیا انداز بخشا۔ مجھے ادراک ہوا کہ خلوص کی بہترین تعریف سورہ اخلاص میں بیان کی گئی ہے یعنی کہ خدا کو ایک اور لاشریک ماننا۔سورہ الحجرات 38 کے مطابق جو شیطان کے ہتھکنڈوں سے بچ جاتا ہیاور اپنے کاموں کی منظوری کے لئے خدا کے علاوہ کسی کو

نہیں دیکھتا، شیطان اس سے دور بھاگتا ہے۔ علامہ مطہری Light Within Me میں لکھتے ہیں کہ خلوص کے دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ تمام عبادات صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے ہوں اور دوسرا یہ کہ ہر کام میں اللہ کی خوشنودی کو مقدم رکھیں۔ قرآن پاک ان اعمال کو صالح اعمال قرار دیتا ہے۔ یعنی خلوص کا مطلب ہر وہ کام جو خالص خدا کے لئے سرانجام دیا گیا ہو۔ عبادت الٰہی تو رہی ایک جانب، اگر ہم اپنے روزمرہ کے کاموں میں خلوص (یعنی خالص خدا کے لئے) کو شامل کرلیں تو نہ صرف برکت بلکہ روحانیت اور معرفت خداوندی بھی حاصل ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر ہم اپنی اولاد کو پالنے کے لئے سوجتن کرتے ہیں لیکن اگر ارادہ کر لیں کہ یہ خدا کی دی ہوئی امانت ہے اور ہم انہیں خدا کے نیک بندے بننے کی تربیت دیں گے تو یہی عمل خالص خدا کے لئے ہو جائے گا۔ اسی طرح سے ہمیں چاہیے کہ پاک غذا خدا کی خوشنودی کے لئے کھائیں۔ نوکری میں امانت داری اپنے رب کو راضی رکھنے کے لئے کریں کیونکہ قیامت کے روز انسانوں کے اعمال کا پیمانہ خلوص ہوگا۔

2۔3۔ بیانیہ حصہ

ہر انسان کی زندگی میں غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں۔ تاہم اکثر اوقات ہم ان کی غیر معمولی کیفیت کو محسوس نہیں کرتے اور محض ایک اتفاق سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسے واقعات کی افادیت واضح کرنے کے لئے ہم شرکاء کے بیان کردہ چھٹی حس کے اشارے اور غیبی امداد، حالت بیداری میں غیر معمولی ہستیوں سے ملاقات، سچے خوابوں اور حالت خواب میں غیر معمولی شخصیتوں سے ملاقات کا تذکرہ کریں گے۔

1۔2۔3۔ چھٹی حس اور غیبی امداد

ہم نے گزشتہ حصے میں عنایت اللہ صاحب کا ذکر کیا۔ وہ 1965ء کی جنگ میں اگلے مورچوں تک پہنچ جاتے، سپاہیوں کے ساتھ قیام کرتے اور جنگ کی کہانیاں اکٹھی کرتے۔ ان کی ایک کہانی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک سپاہی بارڈر کے قریب ایک ایسے علاقے

میں تعینات تھا جہاں دریا بہتا تھا۔ وہ ہر شام دریا پر جاتا لکڑی کا ایک تختہ دریا میں ڈالتا اور اس پر لیٹ جاتا۔ تختہ دریا کے آہستہ بہاؤ پر بہتا رہتا اور اس کی طبیعت پر سکون ہو جاتی۔ اسی طرح سے ایک دن تختے پر لیٹے ہوئے اسے نیند نے آگھیرا۔ عالم غنودگی میں اسے اپنی ماں کی بے چین آوازیں سنائی دیں۔ آخر کار ان آوازوں نے اسے جگا دیا۔ اس نے دیکھا کہ ہر سو اندھیرا چھا چکا تھا اور وہ دریا کے قدرے تیز بہاؤ پر بہتا جا رہا تھا۔ اس نے دریا میں چھلانگ لگائی اور تیرتا ہوا کنارے تک پہنچا وہ فوجی بیرکوں سے کافی دور تھا۔ بدقت تمام اپنے کیمپ میں پہنچا۔ وہاں اس کی ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ گھر گیا تو اس نے ماں کو سارا واقعہ سنایا۔ کچھ سوچنے کے بعد انہیں یاد آ گیا کہ ایک روز مغرب کے وقت ان کا دل پریشان ہو گیا تھا۔ انہوں نے خدا سے اس کی سلامتی کی دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے غیب سے اس کی مدد فرمائی۔ اس فوجی کا کہنا تھا کہ اگر اس روز اسے مدد نہ پہنچتی تو شاید وہ بہت دور نکل جاتا اور کسی مصیبت میں پھنس جاتا۔ ذیل میں شرکاء کے بیانات پیش کئے جاتے ہیں۔

موجودہ تحقیق کے دوران ش 3 نے اپنے چھٹی حس کے دیئے گئے اشارے کو اس طرح بیان کیا کہ، ''زندگی میں کئی مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا کہ چھٹی حس نے بروقت اشارہ دیا اور کسی بڑے خطرے سے بچا لیا۔ ایک مرتبہ میں اپنی بہن کے ساتھ بازار گئی۔ واپسی پر ہم ویگن میں بیٹھنے والے تھے تو مجھے دو لڑکے نظر آئے۔ مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا اور میں غیر ارادی طور پر گھوم کر وین کے دوسرے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے فوراً بعد ایک لڑکے نے پہلے دروازے کے قریب بیٹھی میری بہن کا پرس چھینا اور بھاگ گیا۔ اب سوچتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح میری چھٹی حس نے بروقت مجھے آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔

ش 2 نے بتایا کہ کچھ ماہ پہلے وہ موٹروے پر 100 کلومیٹر سے زیادہ کی رفتار پر گاڑی چلا رہے تھے کہ ان کا ٹائر پھٹ گیا اور گاڑی الٹ گئی۔ گاڑی میں خاندان کی خواتین اور بچے سوار تھے۔ ان میں ایک نوجوان بھتیجا بھی تھا جس کی چھٹی حس قدرتی طور پر بہت تیز ہے۔ اس نے حادثہ ہونے سے چند سیکنڈ پہلے تمام جزئیات کے ساتھ اصل واقعہ دیکھ لیا۔ لیکن اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ گاڑی کی رفتار کم کرنے کی ہدایت کرتا۔ اس حادثے میں گاڑی میں موجود سب افراد زخمی

ہوئے لیکن وہ حادثہ اتنا خطرناک تھا کہ اس میں سب سواریوں کی جانیں بچ جانا بھی ایک معجزہ کے برابر تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی غیبی ہاتھ نے ان کی مدد کی ہو۔

جس طرح بعض اوقات لوگ غیر معمولی اشیا کا نظارا کرتے ہیں بالکل اسی طرح سے بعض لوگوں کا واسطہ اندرونی آواز سے بھی پڑتا ہے۔ اسی سلسلے میں ش 17 نے اندرونی آواز کا ذکر کیا۔ وہ کہتی ہیں کہ، ''جب ہم سعودی عرب میں رہتے تھے تو عمرہ کے لئے گئے۔ مدینہ سے ہم نے بیٹی کے لئے سونے کی چوڑیاں خریدیں۔ واپسی کے لئے جب ہم بس میں بیٹھے تو مجھے ایک واضح آواز سنائی دی کہ...... کی چوڑیاں دیکھو۔ میں نے دیکھا تو کوئی اس کے بازو سے چوڑیاں اتار کر لے گیا تھا۔''

ش 1 نے چھٹی حس سے متعلق انتہائی حیران کن واقعہ بیان کیا۔ وہ کہتی ہیں کہ، ''میری بہن امید سے تھیں اور بچے کی پیدائش میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ ایک دن میں اپنے بچوں کو لے کر بازار گئی۔ ایک سڑک پر مجھے دو خواتین نظر آئیں۔ ایک دبلی اور دوسری قدرے فربہ بدن تھی۔ فربہ خاتون نے نرسوں والا سفید کوٹ پہنا ہوا تھا اور سر پر سکارف تھا۔ ان دونوں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ دوسرے لوگوں کی طرح سڑک پر چلی جارہی تھیں۔ لیکن نہ جانے کیوں انہیں دیکھ کر میرے دل پر گھبراہٹ طاری ہوگئی اور میں نے واپس گھر جانے کا ارادہ کرلیا۔ بچوں نے کہا کہ ابھی تو یونیفارم نہیں خریدے لیکن میں گھر واپس آ گئی۔ گھر آ کر معلوم ہوا کہ بہن سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ میں نے فوراً اسے ہسپتال پہنچایا۔ وہاں ایک عجیب منظر میرا منتظر تھا۔ جس نرس نے بہن کا معائنہ کیا وہ وہی خاتون تھی جسے میں نے کچھ دیر پہلے بازار میں دیکھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے ایک جھٹکا لگا۔ ڈاکٹر بازار والی لمبی خاتون تھی۔ جب وہ اطلاع دے چکی کہ بہن اور اس کا بچہ خیریت سے ہیں تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ایک گھنٹہ پہلے آپ اپنی نرس کے ساتھ فلاں بازار میں گئی تھیں؟ ڈاکٹر ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ توبہ کریں جی۔ ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ اپنا کام چھوڑ کر بازار جاسکیں۔ وہ کہتی ہیں کہ وہ ایک عجیب واقعہ تھا۔ شاید قدرت نے اطلاع دی تھی کہ بہن گر گئی ہے اس کی مدد کو پہنچو۔

2۔2۔3۔حالت بیداری اور غیر معمولی واقعات

ش 1 نے بتایا کہ ’’ہمارے ایک استاد محترم نے ایک مرتبہ اپنی زندگی کا ایک حیرت انگیز واقعہ سنایا۔ان کے اسکول کے زمانے میں ان کے والد صاحب نے گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ایک کم عمر لڑکا ملازم رکھا۔ان کا گاؤں ایک پہاڑی مقام پر واقع تھا اور اندھیرا ہونے کے بعد جنگلی جانوروں کے خوف سے کوئی بھی باہر نہ نکلتا تھا۔ایک روز اندھیرا چھا گیا اور وہ بچہ گھر لوٹ کر نہ آیا۔کافی دیر انتظار کے بعد ان کے والد صاحب نے انہیں بھیجا کہ اسے تلاش کر کے لاؤ۔استاد صاحب کا کہنا تھا کہ انہوں نے ہر ممکن مقام پر اسے تلاش کیا لیکن اس کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔وہ لوگ دروازے پر پریشان کھڑے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں کہ اچانک سفید لباس میں ملبوس ایک بزرگ نظر آئے۔ان کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔چہرے سے رعب اور دبدبہ ٹپکتا تھا۔انہوں نے بچے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔انہوں نے بچہ استاد محترم کے حوالے کیا اور واپسی کے لئے مڑے۔استاد صاحب نے بچے سے پوچھا کہ کہاں غائب ہو گئے تھے۔اس کے بعد سر اٹھا کر دیکھا تو ان بزرگ کو کہیں نہ پایا۔انہوں نے بچہ گھر کے اندر بھیجا اور خود بزرگ کی تلاش میں نکلے لیکن ان کا کہیں اتا پتا نہ تھا۔وہ نہیں جانتے تھے کہ بزرگ کون تھے لیکن ان کے بیان سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ حضرت خضرؑ ہوں۔‘‘

انہوں نے مزید کہا کہ ’’اسلام کے تمام مکاتب فکر میں حضرت خضرؑ کی لمبی عمر پر متفق ہیں۔البتہ ان کے ظاہری حلیے پر کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔اہل سنت حضرات کے ہاں وہ ایک باریش نوجوان ہستی ہیں جبکہ اہل تشیع کے مطابق وہ ایک باریش بزرگ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔الشیخ الصدوقؒ اپنی کتاب عیون الاخبار الرضا میں امام رضاؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ وہ رسول اکرمؐ کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ ان کی ملاقات حضرت خضرؑ سے ہوئی۔وہ مضبوط جسم کے اور لمبے بزرگ تھے۔قرآن پاک میں 18:60-82 میں حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ کی ملاقات کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔امام جعفر صادقؑ کی ایک روایت کے مطابق عراق کے شہر کوفہ میں واقع مسجد سہلہ حضرت خضرؑ اور پیغمبر موسیٰؑ کی پہلی

ملاقات کے مقام پر بنی ہے۔

ش 15 نے بتایا کہ ''ہمارا تعلق خیبر پختونخواہ کے علاقہ غیر سے ہے۔ ہمارے والد صاحب کی گاؤں میں کوئلے کی کانیں تھیں۔ 1960ء کی دہائی میں ایک مرتبہ جیپ لے کر وہ شمالی پنجاب سے لاہور جا رہے تھے۔ لاہور کے قریب چھوٹا راستہ اختیار کرنے کی خاطر وہ چھانگا مانگا کے جنگل میں داخل ہو گئے۔ گھنے جنگل میں انہیں لمبا چغہ پہنے ایک بزرگ نظر آئے۔ بزرگ نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ میرے بابا کا تعلق بلند پہاڑوں کے ان بہادر پٹھان قبائل سے ہے جو ڈر کو گالی سمجھتے تھے۔ لیکن بابا اعتراف کرتے تھے کہ بزرگ کو دیکھ کر انہیں خوف محسوس ہوا۔ انہوں نے گاڑی تیز کر کے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی لیکن انجن خود بخود ہی بند ہو گیا۔ بزرگ ان کے قریب آئے اور کہا نظر کی نظر چلی جائے گی۔ اس واقعے کے بیس سال بعد جب بابا پینتالیس سال کے تھے تو ان کی کوئلے کی کان میں دھماکا ہوا اور بابا بری طرح سے زخمی ہو گئے۔ اس وقت ہمارے گاؤں سے کوئی سڑک شہر تک نہیں جاتی تھی۔ بابا کو لکڑیوں سے بنے ایک فریم کے ساتھ باندھا گیا اور جنگلوں میں سے گزار کر بیس گھنٹے میں قریبی میڈیکل سنٹر تک پہنچایا گیا۔ بابا کے چہرے کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ اس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ بچ جائیں گے۔ لیکن وہ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ انہوں نے تمام راستے اپنے حواس بحال رکھے اور نماز کے وقت نماز ادا کرتے رہے۔ گھنے جنگلوں میں ایک مرتبہ پھر وہی بزرگ نظر آئے اور انہوں نے کہا کہ نظر کو نظر مل جائے گی۔ لیکن اس وقت ان کا مطلب شاید بینائی نہیں لیکن اندرونی آنکھ کا بیدار ہو جانا تھا۔ بابا کی جان تو بچ گئی لیکن ان کی بینائی جاتی رہی۔ میرے بابا کی آنکھیں تمام بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھیں۔ اگر انہیں بروقت طبی امداد مل گئی ہوتی تو شاید ان کی بینائی بحال ہو جاتی۔ وہ تریسٹھ سال نابینا رہے اور کبھی کسی نے ان کی زبان سے شکوہ نہ سنا۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے، ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔ بابا نے اکیاون سال کی عمر سے نماز پڑھنی شروع کی اور ان کی آخری وصیت بھی نماز کی تلقین تھی۔ وہ پوری رات تہجد پڑھتے تھے اور صبح چاشت کی نماز پڑھ کر ظہر تک سوتے تھے۔''

انہوں نے مزید بتایا کہ ''میری پیدائش اس حادثے کے چھ سال بعد ہوئی۔ میں تو جیسے

ان کو ایک کھلونا مل گئی تھی۔ میں ہر وقت ان کے پاس رہتی تھی۔ وہ مجھے اپنی کہانیاں سناتے تھے۔ میں ان کے البم لے کر بیٹھ جاتی اور ہر تصویر کی ایک کہانی ہوتی تھی۔ وہ میری آنکھیں بند کرواتے اور مجھے کہتے تم تصور کرو تم میرے ساتھ ان جگہوں کو محسوس کرو گی اور عمر بڑھنے کے ساتھ میں نے زیادہ سے زیادہ ان کی گزری ہوئی زندگی اور لمحوں کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جب میں پی-ایچ-ڈی کرنے کے لئے امریکہ روانہ ہونے لگی تو بابا سے اپنی اداسی کا ذکر کیا اور کہا کہ میں تو کبھی آپ کے بغیر سوئی ہی نہیں تو انہوں نے ہنس کر کہا: آنکھیں بند کر کے میرا تصور کرنا میں تمہارے پاس ہوں گا۔ ان کی بات سچ ثابت ہوئی۔ پردیس کی تنہائی یا پی-ایچ-ڈی کے دوران ذہنی تناؤ میں، میں نے جب بھی آنکھیں بند کر کے ان کا تصور کیا تو وہ میرے ساتھ تھے۔ صرف تصور میں ہی نہیں، بلکہ میں نے بارہا ان کے وجود کا لمس بھی محسوس کیا۔ جب میں بیمار ہو جاتی تو انہیں فون کرتی۔ وہ فون پر ہی مجھے دم کرتے اور میں اچھی بھلی ہو جاتی۔ 2018ء میں میرے بابا کا انتقال ہو گیا۔ میں شدت سے ان کی کمی محسوس کرتی ہوں۔ ان جیسے لوگ صدیوں میں ایک مرتبہ پیدا ہوتے ہیں۔"

ش 8 نے بتایا کہ "جن دنوں میں امریکہ میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی تو کئی مرتبہ مشکل مراحل سے گزری۔ مشکلات کے دوران مجھے احساس ہوا کہ میں زندگی میں کبھی بھی اکیلی نہیں رہی۔ بلکہ خدا کی جانب سے ہمیشہ مدد ملتی رہی۔ ایک مرتبہ صبح سویرے میری سپروائزری کمیٹی کے ساتھ میری میٹنگ تھی لیکن وہ رات بہت طوفانی تھی۔ بادلوں کی گرج، آسمانی بجلی کی چمک، اس کے ساتھ بارش اور طوفانی ہوائیں۔ میں طوفان سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ جب طوفان بہت بڑھ گیا تو میں نے اپنے مرحوم والد کو آواز دی اور کہا کہ یہ سب کچھ میں برداشت نہیں کر پا رہی۔ اچانک مجھے اپنی کمر کے پیچھے کچھ انجانا سا احساس ہوا۔ وہاں دو مرد ہاتھوں میں خنجر نما ہتھیار لئے کھڑے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میرے محافظ ہوں۔ وہ میری جانب دیکھنے کی بجائے کھڑکی سے باہر دیکھتے تھے۔ میں اور زیادہ خوفزدہ ہو گئی۔ لیمپ آن کیا اور ساری رات سو نہ سکی۔ دوسری صبح میں نے اپنے ایک کلاس فیلو سے بات کی تو اس نے کہا کہ میری دوست سے بات کرو وہ ان امور کا علم رکھتی ہے۔ جب میں نے اس خاتون کو پورا واقعہ سنایا تو وہ کہنے لگی کہ شاید وہ

تمہارے محافظ ہوں۔ تمہارے اندر مافوق الفطرت چیزیں دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ اس وجہ سے تم نے انہیں دیکھ لیا۔ اگر تم انہیں دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتی تو مسلسل تین راتوں تک ان کا شکریہ ادا کرو اور انہیں بتاؤ کہ تم انہیں دیکھنے سے ڈرتی ہو۔ اس طرح وہ تمہارے ساتھ تو رہیں گے لیکن تمہیں نظر نہیں آئیں گے۔ میں نے اس کی نصیحت پر عمل کیا۔ اس کے بعد مجھے ایسا کچھ نہیں دکھا اور طوفانی راتوں سے میرا ڈر کم ہو گیا۔''

ش 11 نے اپنے نانا اور ماموں کے غیر معمولی واقعات سنائے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''ماموں اور نانا میں بہت محبت تھی۔ ایک مرتبہ چھوٹے ماموں راولپنڈی سے آئے اور علاج کی غرض سے نانا کو ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بڑے ماموں نے ضد کی کہ بابا کو لے کر مت جاؤ اگر وہ چلے گئے تو مجھے کچھ ہو جائے گا۔ سب لوگ حیران تھے کہ وہ کوئی بچے تو نہ تھے کہ نانا کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ بہر حال چھوٹے ماموں نانا کو اپنے ساتھ لے گئے اور ہسپتال میں داخل کروا دیا اسی اثنا میں بڑے ماموں ان سے ملنے آئے۔ نانا نے ان سے اصرار کیا کہ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ماموں نے جواب دیا کہ میں ایک ہفتے بعد آؤں گا اور آپ کو لے جاؤں گا۔ اس کے بعد ہم اکٹھے رہیں گے اور کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ جب نانا اور ماموں یہ گفتگو کر رہے تھے تو کمرے میں کافی لوگ موجود تھے۔ سب نے ان کی گفتگو سنی۔ اس کے بعد نانا کو یہ کہہ کر ڈسچارج کر دیا کہ ان کی زندگی بہت کم رہ گئی ہے۔ ان کا مزید علاج کرنا ممکن نہیں۔ بہتر ہے کہ گھر پر رکھ کر ان کی نگہداشت کی جائے۔ اسی وقت بڑے ماموں کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ان کی موت کی وجہ کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہ آئی۔ نانا چونکہ پہلے ہی قریب المرگ تھے لہٰذا کسی نے انہیں ماموں کی وفات کی اطلاع نہ دی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک گھنٹے کے اندر نانا بھی وفات پا گئے۔ ایک گھر میں یکے بعد دیگرے دو موتیں ایک بڑا حادثہ تھیں۔ ایک ہی وقت میں ان کے جنازے اٹھے اور ایک ہی جگہ دفن ہوئے۔ ماموں نے تمام عمر والد صاحب کے ساتھ ایک حد ادب رکھا اور وفات کے بعد انہیں نانا کے قدموں میں دفن کیا گیا۔''

انہوں نے مزید بتایا کہ ''اس سے عجیب تر واقعہ تقریباً ایک ہفتے کے بعد پیش آیا جب جنرل ہسپتال کے مینیجنگ ڈائریکٹر نے میرے چچا کو فون کر کے کہا کہ آپ کا ایک عزیز میرے

ہسپتال داخل تھا۔اس وقت وہ کہاں ہیں؟ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ چچا نے بتایا کہ وہ تو فوت ہو گئے ہیں۔ڈاکٹر نے کہا کہ میں نے انہیں خواب میں دیکھا۔وہ ایسے بلند مقام پر تھے جسے میں ایک راز سمجھتا ہوں اور اس راز کو افشا نہیں کرنا چاہتا۔لیکن آپ کو یہ ضرور بتاؤں گا کہ آپ کے خاندان کے وہ بزرگ ولی اللہ کا درجہ رکھتے تھے۔اس کے بعد چچا کئی سو میل کا فاصلہ طے کر کے نانا کے شہر پہنچے اور ان کے گھر والوں کو وہ خبر دی۔''

وہ کہتی ہیں کہ ''ہم آج تک یہ معمہ حل نہیں کر پائے کہ ایک انجانے ڈاکٹر کو کس طرح خواب میں میرے نانا جان کے بارے میں اطلاع ملی؟ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ ایک دن میں سو سے زیادہ مریضوں کو چیک کرتا ہے۔اسے کسی مریض کا چہرہ بھی یاد نہیں رہتا۔لیکن اس نے جب نانا کو خواب میں دیکھا تو فوراً انہیں پہچان لیا۔ہم اس بات پر بھی حیران تھے کہ زندگی کے دوران نانا نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی جس کی وجہ سے ان کی اعلیٰ بزرگی کا پتہ چلتا۔وہ بتاتی ہیں کہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ حیران کن واقعہ پیش آیا۔نانا کی وفات کے بعد ہمارے ایک قریبی رشتہ دار روزانہ قبرستان جا کر سورہ یاسین پڑھا کرتے۔ان کی وفات کے تیسرے روز صبح کی نماز کے بعد وہ قبرستان پہنچے تو وہاں خاموشی اور سرمئی اندھیرے کا راج تھا۔جب وہ نانا اور ماموں کی قبروں کے قریب پہنچے تو انہیں دو افراد کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔وہ اتنے گھبرائے کہ الٹے پاؤں واپس آ گئے۔''

اسی طرح کا ایک واقعہ ش 9 نے بھی سنایا۔وہ کہتی ہیں کہ ان کے والد اوائل جوانی سے ہی تہجد گزار اور ایماندار تھے۔وہ سرگودھا کے ایک دور افتادہ گاؤں میں رہتے تھے۔ایک روز وہ تہجد کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد سرگودھا کی بس پکڑنے کے لئے نکلے۔انہوں نے پرانے قبرستان سے بس اسٹینڈ تک جانے والا شارٹ راستہ اختیار کیا۔وہ درود شریف پڑھتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ انہیں اچانک قبرستان کے دونوں جانب سے درود پڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ایک جانب سے مردوں کی اور دوسری جانب سے عورتوں کی آواز آتی۔وہ بہت خوفزدہ ہوئے اور انتہائی تیز رفتاری سے چلتے ہوئے قبرستان سے باہر نکل گئے۔جیسے ہی انہوں نے قبرستان کی حد پار کی تو وہ آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

ش 1 نے بتایا کہ ان کی بڑی بہن کے ساتھ روضہ امام حسینؑ پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ’’ہماری والدہ پاکستان میں فوت ہوئی تھیں۔اس وقت بڑی بہن روضہ امام حسینؑ پر موجود تھیں۔ وہ والدہ کی فوتگی کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھیں۔اس کے باوجود عبادت کرتے ہوئے ان کی آنکھ لگ گئی۔حالت خواب میں امی کو کفن میں ملبوس دیکھا۔گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ نیند کا جھونکا آیا۔پھر وہی منظر نظر آیا۔اس طرح تین مرتبہ ہوا۔پاکستان فون کر کے امی کی خیریت پوچھی تو انہیں بتایا گیا کہ وہ بیمار ہیں۔وہ اس وقت اکیلی تھیں۔اس کے علاوہ وہ جنازے پر بھی نہیں پہنچ سکتی تھیں۔گھر والوں نے سوچا کہ وہاں نڈھال ہوتی رہیں گی۔لیکن وہ کہتی ہیں کہ انہیں اسی وقت یقین ہو گیا تھا کہ ان کی والدہ اس دنیا میں نہیں رہیں۔‘‘

3۔2۔3۔قریب المرگ واقعات

بعض اوقات انسان کا دل اور دماغ کسی وجہ سے چند لمحوں یا منٹ کے لئے کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ بظاہر وہ انسان مردہ نظر آتا ہے لیکن کچھ دیر کے بعد زندگی کی جانب لوٹ آتا ہے کبھی کبھار بعض افراد کو بے ہوشی یا کومے میں دیکھے گئے خواب یاد رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں عموماً ایسے واقعات کو ضابطہ تحریر میں نہیں لایا جاتا لیکن مغربی معاشروں میں قریب المرگ واقعات پر کافی کام ہو چکا ہے۔موجودہ تحقیق کے دوران بعض شرکا نے قریب المرگ واقعات بھی بیان کئے۔

ش 1 نے بتایا کہ ایک مرتبہ ان کے والد کے ناک، منہ اور کانوں سے اچانک خون نکلنا شروع ہو گیا اور وہ بیہوش ہو گئے۔ انہیں ہسپتال پہنچایا گیا جہاں فوری طبی امداد کی بدولت چند گھنٹوں میں ان کی طبیعت بحال ہو گئی۔ بعد میں والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ عالم بیہوشی میں انہوں نے ایک دریا دیکھا۔بادل اس دریا کے قریب چل رہے تھے۔انہوں نے خود کو اڑ کر دریا پار کرتے ہوئے دیکھا۔وہ کہتے تھے کہ انہوں نے اس روز بعد از موت کا جہان دیکھا تھا۔کچھ عرصے بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا۔وہ کہتے تھے کہ حملے سے پہلے ان کی آنکھوں کے سامنے بہت تیز بجلی کے جھماکے ہوئے۔ان جھماکوں میں برق رفتاری سے ان کے خاندان کے مرحوم اڑتے

ہوئے آتے اور غائب ہو جاتے۔ اس منظر میں اتنی شدت تھی کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور بیہوش ہو گئے۔ بعدازاں اس حملے سے بھی وہ صحت یاب ہو گئے۔ چند سالوں کے بعد ایک جوان رشتہ دار کی موت واقع ہوئی۔ ایک دن جب وہ انتہائی افسردگی کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے تو ان پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ رقت گریہ میں بدل گئی۔ اسی دوران ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ان کے تمام مرحومین قطار لگائے آ گئے اور بجلی کی سی تیزی سے ان کے سامنے سے اڑتے ہوئے غائب ہونے لگے۔ اس مرتبہ بھی وہ بے ہوش ہو گئے۔ ان کے پھیپھڑوں پر نمونیہ کا شدید حملہ ہوا اور وہ بہت کمزور ہو گئے۔ اسی حالت میں ایک سال کا عرصہ گزرا اور وہ فوت ہو گئے۔

عیسائی شریک تحقیق ش 8 نے بتایا کہ وہ اپنی زندگی میں تین مرتبہ قریب المرگ واقعات سے گزریں۔ ان کے بتائے ہوئے واقعات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

''میرے والد کا انتقال جوانی میں ہو گیا تھا۔ میرا اپنے والد صاحب سے بہت گہرا تعلق تھا۔ والد کی وفات کے بعد میں بتگ بیمار پڑ گئی اور اپنڈکس کا آپریشن ہوا۔ حالت بیہوشی میں، میں اپنے آپ کو آپریشن ٹیبل پر پڑا دیکھ رہی تھیں۔ ڈاکٹرز مجھے آکسیجن دے رہے تھے اور میرا دل پمپ کر رہے تھے۔ ایک ڈاکٹر نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر گردن اوپر اٹھائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ میں ابو کے پیچھے جا رہی تھی۔ اچانک ابو ایک اندھیری جگہ پہنچ کر غائب ہو گئے اور مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میں اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ لہٰذا میں واپس آ گئی۔ اس کے بعد میں نے ایک لمبی سانس لی اور ہوش میں آ گئی۔''

انہوں نے مزید بتایا کہ ''اسی طرح ایک مرتبہ میری امی بیمار تھیں۔ وہ ہسپتال میں داخل تھیں۔ اچانک صبح کے وقت وہ گھر آ گئیں اور میرا پوچھا کہ میں کہاں ہوں۔ دراصل انہوں نے یکے بعد دیگرے میرے والد اور مرحومہ دادی جان کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ دونوں میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اسی رات میری بھانجی نے خواب میں میرا ایکسیڈنٹ ہوتے دیکھا۔ ابو مجھے ساتھ لے گئے لیکن مرہم پٹی کروا کر واپس چھوڑ گئے۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی رات میں نے بھی ابو کو خواب میں دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں دو ٹکٹیں تھیں۔ وہ مجھے ایک انتہائی دلکش سبزہ زار میں لے گئے۔ وہاں خوشگوار ہوائیں چلتی تھیں۔ ایک جانب گہرے سرمئی بادل تھے اور دوسری جانب

سنہری دھوپ۔ جب ہم بلندی پر چڑھنے لگے تو دیکھا کہ ٹکٹ پر میرا نام نہیں لکھا تھا۔ ابو نے کہا کہ میں تمہیں ساتھ لے کر نہیں جا سکتا اور مجھے واپس بھیج دیا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ جب میری امی گھر آئیں تو میں شدید پائیلز میں مبتلا تھی اور نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ امی نے فوراً انجکشن منگوا کر لگایا۔ جس کے بعد بتدریج میری حالت بہتر ہوتی گئی۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ایک اور مرتبہ اینٹی الرجی کھانے سے مجھے شدید ری ایکشن ہو گیا۔ نیم بے ہوشی میں، میں نے دیکھا کہ میرا جسم بستر پر پڑا ہے اور میں ہوا میں معلق اپنے جسم کو دیکھ رہی ہوں۔ اسی کے ساتھ میں امی اور بھائی کو اپنے جسم کے ساتھ کھڑا دیکھ رہی ہوں۔ امی چھوٹے بھائی سے کہہ رہی تھیں کہ یہ تو گئی۔ بھائی نے کہا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ امی نے کہا اس کا دل پمپ کرو۔ میرے بھائی نے میرا دل پمپ کیا اور کچھ دیر میں، میں ہوش میں آ گئی۔ مجھے یقین ہے کہ عالم بے ہوشی میں میری روح بدن سے جدا ہو گئی تھی اور میں نے اس کے جسم کے ساتھ ہونے والے تمام معاملات دیکھے۔"

4۔2۔3۔ سچے خواب

ش 3 نے اپنے تجربات کچھ اس طرح بیان کئے کہ "انسان اپنی زندگی میں جو کام سب سے زیادہ کرتا ہے شاید وہ خواب دیکھنا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کب سے سچے خواب دیکھنا شروع کئے۔ شاید اس وقت سے جب میرا رجحان تزکیہ نسا اور عبادت کی جانب زیادہ ہوا۔ خواب تو کئی ایک نظر آتے ہیں لیکن جن خوابوں میں اشارہ چھپا ہو ان کی کچھ اور ہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں اکثر اوقات ایسے خواب دیکھ کر پریشان ہو جاتی تھی۔ میری عادت تھی کہ جب تک ایسے خوابوں کا حقیقی زندگی میں نتیجہ نہ نکل آئے تو ان کا ذکر کسی سے نہیں کرتی تھی۔ درحقیقت اس کے پیچھے بھی کچھ وجوہات ہیں۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بچپن میں اگر کوئی غیر معمولی خواب دیکھتی تو صبح اٹھ کر سب کو سنا دیتی تھی۔ میری نانی مرحومہ (خدا ان کے درجات بلند کرے) نے مجھے منع کیا کہ اپنے خواب کسی کو نہ سنایا کرو اس سے پریشانی آتی ہے۔ نیز یہ کہ جب مختلف لوگ خواب سنتے ہیں تو اپنی سمجھ کے مطابق ان کی تعبیر بتاتے ہیں۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ خواب

پرندوں کے پنجوں میں ہوتے ہیں اور جو پہلی تعبیر بتائی جاتی ہے وہ اسے اڑا کر آسمان پر لے جاتے ہیں۔ بہرحال یہاں میں اپنے چند خوابوں کا ذکر کرتی ہوں۔

ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہی ہوں۔ خواب دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد ہم سب گھر والوں کا اچانک عمرے کا پروگرام بنا اور ہم عمرہ کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔''

انہوں نے مزید بتایا کہ ''اسی طرح کسی عزیز کے گھر میں کوئی خوشی یا غمی آنے والی ہو تو مجھے پہلے ہی خواب میں اشارہ مل جاتا ہے۔ جب میرے تایا جان کا انتقال ہوا تو چند دن پہلے میں نے دیکھا کہ ان کے گھر میں سفید چادر بچھی ہے اور ٹوکری میں سفید پھلیاں پڑی ہیں۔ ایسی پھلیاں ہمارے ہاں کسی کی وفات کے موقع پر قل پڑھنے کیلئے تیار کی جاتی ہیں۔ اسی طرح جب میری ایک کزن کی منگنی ہوئی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ اس کا لباس کسی اور نے پہن لیا ہے۔ پھر منظر بدل گیا اور دیکھا کہ ایک گھر کے دروازے پر اس کی نند بیٹھی ہوئی ہے۔ چاند اس گھر میں داخل ہونا چاہتا ہے لیکن نند اس چاند کو گھر میں داخل ہونے سے روک دیتی ہے۔ کچھ روز کے بعد پتا چلا کہ کزن کی منگنی اسی نند کی وجہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ ایک مرتبہ میں نے اپنی دو پروفیسرز کو ایک خواب میں دیکھا۔ ان میں سے ایک پہلے خانہ کعبہ کے طواف کے لئے جاتی ہیں اور دوسری بعد میں اور حقیقتاً ہوا بھی ایسا ہی۔ ایک پہلے حج کے لئے گئیں اور دوسری بعد میں عمرہ کے لئے گئیں۔''

ش 7 نے کہا کہ ان کی دادی کی زندگی کے حالات غیر معمولی تھے اور وہ خود بھی چند غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ وہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات پہلے سے ہی خواب میں دیکھ لیتی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں بعض روحانی صلاحتیں اپنی دادی سے وراثت میں ملی تھیں اور کچھ ان کی وراثتی کمی کی وجہ سے۔ ان کے والدین پیدائشی طور پر گونگے تھے۔ اس وجہ سے وہ والدین کی عمومی تربیت سے محروم رہ گئی تھیں۔ اس کمی نے انہیں اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیا اور ان کی روحانی صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا ہوا۔ وہ سچے خواب بہت زیادہ دیکھا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ جو خیال ان کے ذہن میں آتا وہ کچھ ہی دیر میں حقیقت میں بدل جایا کرتا تھا۔ یہاں

تک کہ وہ اپنے خیالات سے خوفزدہ ہوگئیں کیونکہ بعض خیالات برے بھی ہوتے تھے۔

انہوں نے مزید بتایا کہ ''جب میں چھٹی جماعت میں تھی تو خواب میں ایک ٹیچر کو دیکھا۔ وہ اسکول کے آفس میں کھڑی تھیں کہ اچانک ایڈمن کی ایک خاتون کے ساتھ ان کی لڑائی ہوگئی۔ انہوں نے اسی وقت استعفیٰ دے دیا۔ صبح اٹھ کر میں نے اپنی بہنوں کو وہ بات بتائی اور اسکول جا کر سہیلیوں کو بھی بتائی۔ اس کے بعد ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ وہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا جیسے میں نے خواب میں دیکھا تھا۔'' انہوں نے مزید بتایا کہ ''اسی طرح اسکول کے دنوں میں میں بارہا خواب میں سورج اور ایک ستارہ دیکھا کرتی تھی۔ میں خواب کے دوران ہی سوچتی کہ سورج اور ستارہ دونوں اکٹھے کس طرح نمودار ہو سکتے ہیں۔ ایک دن میں نے اپنا خواب ایک ٹیچر کو سنایا۔ وہ کہنے لگیں کہ کسی سے پوچھ کر اس خواب کی تعبیر تمہیں بتاؤں گی۔ کچھ روز بعد انہوں نے بتایا کہ اس خواب کی دو تعبیریں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہیں بہت زیادہ علم حاصل ہوگا اور دوسرا یہ کہ تمہارا خاوند بہت خوبصورت ہوگا۔ وقت آنے پر دونوں تعبیریں سچ ثابت ہوئیں۔'' انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ''اسی طرح بیٹھے بٹھائے میرے ذہن میں کوئی خیال آجاتا اور کچھ ہی دیر میں وہ خیال حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا۔ وہ سلسلہ کبھی کبھار پریشان کن بھی ثابت ہوتا کیونکہ کبھی کوئی برا خیال بھی پورا ہوجاتا تھا۔ میری ایک دوست شادی کے بعد امریکہ منتقل ہوگئی تھی۔ اس کی ساس اپنے کسی مقدمے کی پیشی کے سلسلے میں پاکستان آرہی تھیں۔ انہوں نے کئی دن پہلے مجھے پیغام بھیجا کہ میرے لئے ایک عبایا خرید کر رکھ لینا۔ میں اس کے بغیر کورٹ نہیں جاؤں گی۔ اب کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ مصروفیت کی وجہ سے میں عبایا نہ خرید سکی۔ جس دن میں نے عبایا خریدنے کا ارادہ کیا وہ جمعہ کا دن تھا۔ اس دن ہمارے ہاں تمام بازار بند ہوا کرتے تھے۔ اسی روز ان کی فلائیٹ بھی تھی۔ میں بہت پریشان ہوگئی کہ اب وہ کورٹ کس طرح جائیں گی۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ آج اگر ان کے گھر میں کوئی فوت ہوجائے تو وہ اپنی پیشی ملتوی کر دیں گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ ابھی آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ بھائی نے بتایا کہ تمہاری دوست کے گھر اچانک فوتگی ہوگئی ہے۔''

انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''ایک مرتبہ عید قربان پر میرے والد، تایا اور چچا سب بھائی اکٹھے

ہوئے۔ وہ کافی عرصے کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے اور سب بہت خوش تھے۔ میں ان کی تصویریں بنا رہی تھی کہ اچانک ذہن میں خیال آیا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک فوت ہو جائے تو یہ دوبارہ کبھی بھی اس طرح خوش نہیں ہوں گے۔ اسی شام میرے تایا ابو کو کھانسی ہوئی۔ انہیں ہسپتال پہنچایا گیا لیکن ان کی کھانسی زیادہ ہو گئی۔ چند گھنٹے پہلے جب وہ قربانی کر رہے تھے تو بالکل ٹھیک تھے لیکن شام کو ان کی طبیعت بگڑتی چلی گئی حتیٰ کہ انہوں نے تائی سے کہا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے اب میں زندہ نہیں بچوں گا اور وہی ہوا اسی رات وہ فوت ہو گئے۔''

انہوں نے بتایا کہ ''شادی کے بعد جب وہ امید سے ہوئیں تو ایک مرتبہ انہوں نے قرآن پاک میں پڑھا کہ حضرت ذکریا کو وحی ہوئی کہ تمہیں ایک بیٹا عطا کیا جائے گا۔ اس کا نام یحییٰ رکھنا ایک ایسا نام جو اس سے پہلے کسی نے نہ رکھا ہو۔ قرآن پڑھتے ہوئے خود بخود میرے دل سے نکلا کہ میرے بچے کا نام بھی ایسا ہو جو کسی نے نہ رکھا ہو۔ اسی رات خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں سفید لباس میں ملبوس ایک نوزائیدہ بچہ ہے۔ ہر طرف سے آوازیں آ رہی ہیں کہ اخوت ہمیں دے دو اخوت ہمیں دے دو۔ میں نے وہ خواب گھر والوں کو سنایا تو انہوں نے کوئی توجہ نہ دی سوائے میرے شوہر کے۔ بعد ازاں میرے ہاں بچی کی پیدائش ہوئی۔ میرے خاوند نے فیس بک پر اس کا نام شیئر کر دیا۔ میرے سسرال والے ناراض ہو گئے کہ ہم سے مشورہ کئے بغیر بچی کا نام رکھ دیا۔ ایک دن وہ سب اکٹھے ہوئے اور میرے گھر والوں کو بھی بلایا کہ سب لوگ بچی کا نام تجویز کریں۔ انہوں سے سب کو کہا کہ اپنی پسند کا نام پرچی پر لکھیں۔ ہم قرعہ ڈالیں گے اور جو نام قرعہ میں نکلے گا وہی بچی کا نام ہو گا۔ یقین مانیے کہ تین مرتبہ قرعہ نکالا گیا اور تینوں مرتبہ اخوت نام کا قرعہ ہی نکلا۔ آخر سب نے اس نام کو قبول کر لیا اور کہا کہ قدرت نے اس بچی کا یہی نام رکھا ہے۔''

ش 1 نے اپنے سچے خوابوں کے بارے میں اس طرح بتایا کہ ''جب میں میٹرک میں پڑھتی تھی تو بارہا خواب میں کسی انجانے پہاڑی مقام پر ایک بل کھاتی ہوئی سڑک دیکھتی جو پہاڑ پر چڑھتی تھی۔ اس سڑک کے دونوں اطراف میں بلند درخت قطار لگائے کھڑے ہوتے اور ان درختوں پر انگور کی بیلیں چڑھتی تھیں۔ وہ بیلیں انگور کے گچھوں سے بھری ہوتیں۔ موسم انتہائی

خوشگوار ہوتا اور مست ہوا اسے اور بھی دلفریب بنا دیتی۔ میں اکثر حیران ہوتی کہ بارہا ایک ہی خواب کیوں دیکھتی ہوں؟ وہ عقدہ کئی سال کے بعد اس وقت کھلا جب مجھے ایک پہاڑی مقام پر معلمہ کے فرائض سرانجام دینے کا موقع ملا۔ ایک سال تک میں روزانہ اپنے خوابوں کی سڑک پر چلتی ہوئی سکول پہنچتی اور اسی پر چلتی واپس گھر آتی۔ میرے لاشعور نے کئی سال پہلے مجھے اس تجربے کی اطلاع دے دی تھی۔"

انہوں نے مزید بتایا کہ "ایک مرتبہ میری بہن نے مجھے بتایا کہ اس نے خدا سے دعا مانگی کہ وہ اس کی برزخی آنکھ کھول دے۔ اس رات اس نے خواب میں سرسبز گھاس دیکھی۔ گھاس کی ہر پتی کی نوک پر شبنم کا ایک قطرہ ہیرے کی مانند چمک رہا تھا۔ بہن نے اللہ اللہ کی مسحور کن لے سنی۔ جب اس نے غور کیا تو پتا چلا کہ پتیاں ہوا کے زور پر دائیں لہراتیں تو یک زبان آواز آتی 'اللہ' اور جب بائیں جاتیں تو دوبارہ یک زبان پکار اٹھتیں 'اللہ'۔ بہن کہتی ہے کہ ان آوازوں میں ایسی ہم آہنگی اور سر تھا کہ دل چاہتا تھا کہ وقت ٹھہر جائے اور انسان وہیں بیٹھا ان آوازوں کو سنتا رہے۔"

اسی طرح ش 9 نے بیان کیا کہ "ایک مرتبہ ہمارے گھر میں شارٹ سرکٹ ہوا اور سارا گھر جل گیا۔ اس سے کچھ پہلے میں اور میری بہن نے مرحوم والد صاحب کو خواب میں دیکھا کہ وہ جانوروں والے کمرے میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ ہم بہت حیران ہوئے کہ دو بہنوں نے ایک ہی رات میں ایک جیسا خواب دیکھا اور وہ بھی جانوروں والے گندے کمرے میں نماز پڑھتے ہوئے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ گھر جل گیا اور اس کی تعمیر نو ہوئی۔ جہاں جانوروں کا کمرہ تھا اب وہاں میرا اور امی کا کمرہ ہے۔ نہ صرف ہم وہاں نماز پڑھتے ہیں بلکہ تہجد بھی پڑھتے ہیں۔

انہوں نے مزید بتایا کہ "جب میرے تایا ابو زندگی کے آخری دنوں میں تھے۔ وہ اکثر کہتے کہ دیکھو دیواروں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ جا کر آگ بجھاؤ۔ جب ہم جا کر دیکھتے تو سب ٹھیک ہوتا۔ کچھ ہی عرصہ پہلے تائی جان فوت ہوئی تھیں۔ ہم سمجھے کہ شاید ان کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ کچھ دنوں بعد آگ لگی تو ہمیں پتا چلا کہ تایا ابو شاید عالم غنودگی میں اسی آگ کو دیکھا کرتے تھے۔ اس طرح ہمیں پہلے سے اس آگ کے متعلق اشارے مل رہے تھے۔ لیکن ہمارا شعور اتنا

پختہ نہیں تھا کہ ان اشاروں کو سمجھ پاتے۔اس گھر میں ہم تین خاندان آباد ہیں ۔ یہ خدا کا کرم تھا اور بزرگوں کی دعا کہ اتنی خوفناک آگ کے باوجود بھی کسی انسانی جان کا نقصان نہ ہوا۔‘‘

5۔2۔3۔حالت خواب میں مرحومین سے ملاقات

خواب میں مرحومین سے ملاقات کے بارے میں مختلف مکاتب فکر میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔بعض کے افکار کے مطابق مرحومین کی روحیں دوسرے جہان پرواز کر جاتی ہیں اور اس دنیا سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔تاہم اہل سنت اور اہل تشیع کے مطابق مرحومین کی روحیں گاہے بگاہے اس دنیا میں واپس آتی ہیں۔لہٰذا خواب میں ان سے ملاقات ممکن ہے۔ایسے ہی چند واقعات ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

ش 1 نے بتایا کہ جب میری دادی جان کا انتقال ہوا تو میری عمر دس سال تھی۔جس دن تدفین ہوئی اسی رات کو میں نے انہیں خواب میں دیکھا۔وہ ایک سرسبز و شاداب لان کی جانب چلتی جا رہی تھیں۔لان کے اردگرد خوشبودار پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ہوا کے جھونکے چل رہے تھے اور وہ ہوا ایسی مسحور کن خوشبو پھیلاتی تھی جس کا تصور اس دنیا میں ممکن نہیں۔لان کے بیچوں بیچ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ان کرسیوں پر دادی کے مرحوم بہن بھائی اور والدین بیٹھے تھے۔خواب کی حالت میں ہی میں نے محسوس کیا کہ وہاں موجود دادی جان کے بہن بھائی پہلے سے وفات پا گئے تھے۔اب قصہ یوں تھا کہ چھوٹی عمر کی وجہ سے میں دادی کے والدین اور مرحوم بہن بھائیوں کو نہ پہچانتی تھی لیکن خواب میں میں نے ان سب کو پہچان لیا۔دادی کے پہنچنے پر تمام لوگ کھڑے ہو گئے اور خوشگوار موڈ میں ان کا استقبال کیا۔ان کے والدین خوش ہو کر کہہ رہے تھے کہ بیٹی ہم عرصہ دراز سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔صبح جب میں نے اپنا خواب اپنے بہن بھائیوں کو سنایا تو انہوں نے خوب مذاق اڑایا۔ان کا خیال تھا کہ اگر میں نے کچھ دیکھا بھی تھا تو وہ بس دادی کی یاد تھی اور وہ ایک سچا خواب نہیں تھا۔‘‘

انہوں نے مزید بتایا کہ ایک مرتبہ ان کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔وہ تقریباً ساری رات اپنے مرحوم شوہر کو خواب میں دیکھتی رہیں۔جیسے ہی آنکھ لگتی وہ خوبصورت پینٹ شرٹ پہنے بیڈ

کی پائنتی کی جانب کھڑے نظر آتے۔ ان کے چہرے پر اندھیرا ہوتا اور باقی جسم پر روشنی پڑ رہی ہوتی۔ وہ انہیں دیکھتیں تو ڈر جاتیں اور ان کی آنکھ کھل جاتی۔ شاید ایسا پانچ مرتبہ ہوا یا اس سے بھی زیادہ۔ صبح اٹھ کر انھوں نے اپنی والدہ کو سارا ماجرہ سنایا۔ وہ بھی گھبرا گئیں اور کہنے لگیں کہ خدا خیر کرے۔ بچوں کا صدقہ نکالو۔ انہوں نے فوراً صدقہ نکالا اور بچوں کو سکول بھیج دیا۔ واپسی پر بچوں کی گاڑی والے نے بتایا کہ ان کے بڑے بیٹے کی شرٹ پر خون تھا۔ دیکھا تو سر کا پچھلا حصہ زخمی تھا۔ اسکول فون کرنے پر پتا چلا کہ وہ جھولے کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ لوہے کا جھولا تیزی سے آ کر اسے لگا۔ وہ کہتی ہیں کہ شکر ہے کہ مجھے اس پریشانی کا پہلے سے ہی اندازہ ہو گیا تھا اور میں نے صدقہ نکال دیا۔ ورنہ لوہے کا جھولا اتنا بھاری تھا کہ اس سے بڑا نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ اسی رات وہی مرحوم ان کی بہن کی خواب میں بھی آئے۔ ساتھ میں ان خاتون کے مرحوم والد صاحب بھی تھے۔ بہن نے بتایا کہ خواب میں وہ اپنے بہنوئی کی سوچیں پڑھ سکتی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں ناراض تھے کہ میرا بیٹا زخمی ہو گیا اور اس نے حال بھی نہ پوچھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی بہن کی خواب میں بھی آئے اور ڈانٹ کر کہنے لگے کہ 'تمہیں نظر نہیں آتا۔ میرا بیٹا گر گیا ہے'۔ وہ کہتی ہیں کہ ایسا لگتا تھا جیسے تمام رات مرحوم کی روح اپنے بچے کے لئے بے چین رہی۔

ش 9 نے بتایا کہ ''ہمارے گھر کے ساتھ ایک قبرستان تھا۔ جب ہم چھوٹے تھے تو اس قبرستان کی ایک قبر منہدم ہو گئی۔ ابو مزدور پیشہ انسان تھے۔ ہماری گزر اوقات تنگی میں ہوتی۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک سو اینٹیں اور سیمنٹ منگوایا اور اپنی نگرانی میں قبر تیار کروائی۔ ہم حیران ہوتے کہ والد صاحب نے اس قبر پر اتنے پیسے کیوں خرچ کیے۔ اس وقت ہمارا کوئی رشتہ دار بھی اس قبرستان میں دفن نہ تھا۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ وہ قبر ایک سیدزادی کی تھی۔ اس نے خواب میں آ کر ان سے درخواست کی تھی کہ قبر گر گئی ہے وہ اس کی تعمیر نو کروا دیں۔''

ش 9 بتاتی ہیں کہ ''ہم لوگ مشترکہ خاندان میں تایا تائی کے ساتھ رہتے تھے۔ ہمارے گھر میں سب سے پہلے میرے والد کا انتقال ہوا۔ اس کے کچھ عرصے بعد میں نے والد صاحب کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے سفید کرتا پہن رکھا تھا اور کندھے پر سفید رومال تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مسجد سے نماز پڑھ کر آئے ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ میں تمہاری ماں کو لینے آیا ہوں۔ میں نے

ان کے کندھے سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا اور اصرار کیا کہ ابھی امی کو لے کر نہ جائیں۔ ابو نے کہا بیٹا حکم آ گیا ہے۔ اس کے باوجود میں روتی رہی۔ وہ مجبور ہو کر بولے کہ حکم تو آ گیا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں اور واپس جانے کے لئے مڑے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ان کا کرتا کمر کی جانب سے میرے آنسوؤں سے تر تھا۔ اسی لمحے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے دیکھا کہ میری قمیض بھی آنسوؤں سے تر تھی۔ اس خواب کے ایک ہفتے بعد میری تائی فوت ہو گئیں۔ اس واقعے کو کئی سال گزر گئے ہیں۔ میری والدہ ابھی تک حیات ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ اس طرح سے والد صاحب کا خواب میں آنا اور میرا ضد کرنا کیا مطلب رکھتا تھا۔''

ش 17 نے بتایا کہ ''میرے والد صاحب کی وفات کے سترہ سال بعد میں نے ایک روز انہیں خواب میں دیکھا۔ وہ ایک وسیع و عریض مکان کی صفائی میں مصروف تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ اس گھر کی صفائی کیوں کروا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ کوئی مہمان آنے والا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کون ہے؟ تو کہنے لگے کہ بس کوئی ہے۔ ایک ہفتے کے بعد میرے خاوند کی اچانک وفات ہو گئی۔ تب مجھے سمجھ آئی کہ والد صاحب نے اسی واقعہ کا اشارہ میرے خواب میں دیا تھا۔ اسی طرح سے ایک مرتبہ میں نے اپنی مرحومہ دادی جان کو دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ میں کسی کو لینے آئی ہوں۔ میں نے پوچھا کہ کس کو؟ تو کہنے لگیں کہ بس آئی ہوں۔ اب وہ میرے ساتھ ہی رہے گا۔ ان دنوں میں بیرون ملک تھی۔ وہ خواب دیکھنے کے بعد میں روزانہ وطن فون کر کے عزیز و اقارب کا حال پوچھا کرتی۔ ایک ہفتے کے بعد پتہ چلا کہ چچا جان فوت ہو گئے ہیں۔''

مندرجہ بالا واقعات کی رو سے مرحومین کی روحیں مختلف اوقات میں مختلف وجوہات کی بنا پر ہم سے ملاقات کے لئے آتی ہیں۔ لیکن مرحومین کی ملاقات کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ یعنی کہ بعض اوقات نیند کے دوران ہماری روح پرواز کرتی ہوئی عالم ارواح تک پہنچ جاتی ہے اور ہماری ملاقات مرحومین کی روحوں سے ہوتی ہے۔ اسی قسم کے کچھ واقعات قارئین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

ش 1 کا کہنا ہے کہ ''میں نے 2019ء میں خواب میں ایک نا معلوم سا مقام دیکھا۔ میں سڑکوں پر چلتی جا رہی تھی کہ اچانک ایک عالی شان عمارت نظر آئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا

جیسے کوئی امام بارگاہ ہو یا کسی امام کا روضہ۔ چلتے ہوئے ایک اور زیرِ تعمیر عمارت نظر آئی۔ غیر معمولی حد تک طویل قامت اشخاص اس کی تعمیر میں مصروف تھے۔ کچھ افراد غیر معمولی حد تک بڑے ہتھوڑوں سے پتھر توڑ رہے تھے۔ جب میں اس عمارت کے قریب پہنچی تو ایک ہتھوڑے کی خوفناک دھمک سے گر گئی۔ ایک اور ہتھوڑا آ کر میرے سر کے قریب لگا لیکن میں اس کی ضرب سے بچ گئی۔ وہاں موجود تمام افراد ہنسنے لگے کہ کس طرح سے خدا نے جان بچا لی۔ میں بھی ہنسی۔ ماحول بہت خوشگوار تھا۔ حالت خواب میں مجھے ادراک تھا کہ میری ملاقات فرشتوں سے ہو رہی ہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے چل پڑی۔ راستے میں ایک بلند حویلی نظر آئی۔ میں حویلی میں داخل ہو گئی۔ وہاں مجھے غیر معمولی حد تک لمبے برآمدے اور بلند و بالا محرابیں نظر آئیں۔ برآمدوں کے ستون اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ اینٹیں دیدہ زیب نقش و نگار سے سجی ہوئی تھیں اور ان میں رنگین شیشے جڑے ہوئے تھے۔ شیڈوں کے آر پار روشنی کا گزر ہوتا تو وہ ہیروں کی طرح جھلملاتے نظر آتے۔'' انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''طویل و عریض آنگن کا فرش کچی مٹی کا تھا۔ آنگن کے پار میری مرحومہ پھوپھی بیٹھی تھیں۔ وہ لکڑیوں کی آگ پر بہت بڑا کڑاہ رکھے کچھ پکا رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی میرے مرحوم والد صاحب، دادا اور چند اور افراد چل پھر رہے تھے۔ ان مرحومین میں سے کچھ میری پیدائش سے بھی پہلے وفات پا چکے تھے۔ لیکن خواب میں، میں انہیں جانتی تھی۔ میں صحن پار کر کے پھوپھی کے پاس پہنچی اور کھڑے کھڑے انہیں اپنی اگلی منزل کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد میں بائیں دروازے سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد میرے ماموں مرحوم اور بھائی تیزی سے چلتے ہوئے میرے قریب آن پہنچے۔ راستے میں ایک بلند و بالا درخت دیکھا جس پر ایک پتا بھی نہیں تھا لیکن اس کی ٹنڈ منڈ شاخیں انجانی قسم کے پھل سے لدی ہوئی تھیں۔ پھل سیب اور چکوترے کی کوئی درمیانی قسم تھی۔ اس کا رنگ دلفریب اور حجم بہت بڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ کاش ان میں سے ایک مجھے مل جائے۔ ماموں نے میری سوچ پڑھ لی۔ وہ جوانی اور شرارت سے بھرپور دلفریب کھنکھناتی ہوئی ہنسی میں ہنسے اور اپنا جوتا اتار کر پھل کو مارا۔ ایک دانہ آ کر میرے ہاتھ پر گرا۔ ماموں نے کہا یہ لو۔ جس عمارت

تک میں پہنچنا چاہتی تھی وہ بہت قریب تھی۔ یہاں پر آ کر خواب ختم ہو گیا۔ خواب بہت خوشگوار تھا۔ میں ہشاش بشاش موڈ میں جاگی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے خواب میں مرحومین کی اگلی زندگی کا مشاہدہ کیا ہے۔''

ش 4 نے بتایا کہ ''میرے والد بے حد عبادت گزار اور فقیر منش انسان تھے۔ زندگی کے آخری سالوں میں وہ سخت آزمائش سے گزرے۔ بیماری اتنی بڑھی کہ بستر پر پڑ گئے۔ جسم کا گوشت گل گیا اور صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں۔ ایک روز صبح صادق کے وقت میں نے خواب دیکھا کہ وہ میرے اور خاوند کے درمیان آ کر لیٹ گئے ہیں۔ اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ میرے دل کو یقین ہو گیا کہ والد صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ اسی وقت میں نے عالم تصور میں بھائی کو دیکھا کہ اس نے گاڑی نکالی اور وہ ابو کی فوتگی کی خبر دینے ہمارے گھر آ رہا ہے۔ ان کے اور میرے گھر میں پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا۔ میں نے دل میں منصوبہ بنایا کہ بھائی کے سامنے کمزوری کا اظہار نہیں کروں گی تاکہ وہ مضبوط رہے۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد گھنٹی بجی۔ میرے خاوند نے جا کر دیکھا تو بھائی ابو کی فوتگی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ابو کی روح جسم کی قید سے آزاد ہونے کے فوراً بعد میرے پاس آئی اور مجھے اس خبر کے لئے تیار کیا۔''

انہوں نے مزید بتایا کہ ''میرے دیور نے خواب میں میری مرحومہ ساس کو دیکھا۔ وہ اپنی قبر کی پائنتی پہ گلاب کے پھول لگا رہی تھیں۔ دیور نے پوچھا کہ یہ تو پیدل چلنے والوں کی رہ گزر ہے آپ یہاں پھولوں کے پودے کیوں لگا رہی ہیں؟ وہ کہنے لگیں کہ دیکھو تو کیسے خوبصورت پھول آئے ہیں۔ خواب یہاں ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد اچانک بلدیہ والوں نے قبرستان میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ گزرگاہ کہیں اور منتقل کر دی اور والدہ کی پائنتی والی جگہ مزید قبروں کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ میرے دیور کہا کرتے تھے کہ میری قبر والدہ کی پائنتی کی جانب بنانا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ میرے خاوند کا ان سے پہلے انتقال ہو گیا اور انہیں اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں ان کی والدہ نے گلاب کے پودے لگائے تھے۔''

انہوں نے مزید بتایا کہ ''خاوند کی وفات کے بعد میں بہت بیمار ہو گئی۔ ان دنوں نند کے ساتھ میری ناراضگی چل رہی تھی۔ ایک روز میں نے ارادہ کیا کہ نند کو بلا کر کہوں کہ زندگی کا کوئی

بھروسہ نہیں۔ بہتر ہے کہ ہم دونوں آپس میں معافی تلافی کر لیں۔ اسی رات میرے خاوند نند کی خواب میں آئے اور میرا نام لے کر کہا کہ وہ بہت بیمار ہے اور تمہیں بلا رہی ہے۔ اس نے اگلے روز فون کر کے خواب سنایا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسے گھر بلانا چاہتی تھی۔ اس طرح سے ہماری ناراضگی ختم ہو گئی۔''

6۔2۔3۔ عالم خواب میں غیر معمولی ہستیوں سے ملاقات

ش 11 نے اپنے ماموں کا قصہ اس طرح سنایا کہ ان کا تعلق ملتان کے ایک اہم اہل سنت خاندان سے تھا۔ ان کی شادی کو تقریباً بارہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ان کی ایک بیٹی تھی۔ اس کے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی۔ وہ بیٹے کے متمنی تھے۔ انہوں نے بیوی سے دوسری شادی کی اجازت چاہی۔ کافی تردد کے بعد مامی نے اجازت تو دے دی لیکن خود ذہنی تناؤ کا شکار ہو گئیں۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ دوسری بیوی بہت جلد امید سے ہو گئیں۔ ان کی بیٹی نے ایک دن صبح اٹھ کر بتایا کہ اس نے خواب میں بی بی فاطمہ زہرا کی زیارت کی ہے۔ ماں اور دادی نے پوچھا بھلا وہ کیسے؟ اس نے بتایا کہ اس نے ایک بہت خوبصورت سبزہ زار دیکھا۔ وہاں خوشگوار ہوا چلتی تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک بی بی کو دیکھا جنہوں نے سر سے لے کر پاؤں تک چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ انہوں نے پیار سے اس بچی کو اپنے پاس بلایا اور بتایا کہ وہ رسول اللہؐ کی بیٹی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری امی کو ایک بیٹا عطا کیا ہے۔ اس کا نام میرے بیٹے کے بیٹے کے نام پر اکبر علی رکھنا۔ جب بچی نے خواب سنایا تو دادی نے کہا کہ وہ امام حسینؑ کے فرزند کا ذکر کر رہی تھیں جن کا نام اکبر علی نہیں بلکہ علی اکبر تھا۔ شاید بچی بھول گئی ہو۔ انہوں نے بچی کو تاکید کی کہ اس خواب کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ کچھ ہی ہفتے گزرے تھے کہ بڑی مامی امید سے ہو گئیں۔ جب پیدائش کا وقت آیا تو انہوں نے بیٹے کو جنم دیا اور دوسری بیوی کی بچی پیدا ہوئی۔ بی بی کی ہدایت کے مطابق اس بچے کا نام علی اکبر رکھا گیا۔

ش 1 نے بتایا کہ ''ہماری ایک عزیزہ سخت حالات کا شکار تھیں۔ ان کے شوہر نے دوسری شادی کر لی تھی اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر انہیں ذہنی اذیت پہنچاتے رہتے۔ وہ نیک خصلت اور

صابر شاکر خاتون تھیں۔ وہ صوم وصلوٰۃ کی بھی پابند تھیں اور جب بھی وقت ملتا تو تسبیح وتحلیل میں مشغول ہو جاتیں۔ مصیبت کے دنوں میں خدا سے اور بھی لو لگالی تھی۔ ایک رات بی بی فاطمہ زہرا ان کے خواب میں تشریف لائیں۔ وہ ایک محراب کے اندر بیٹھی تھیں اور نور کی لہروں نے انہیں گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ روشنی اتنی زیادہ تھی کہ وہ نہ تو ان کا چہرا مبارک دیکھ سکتی تھیں اور نہ ہی جسم مبارک۔ بس ایک ہیولہ نظر آتا تھا۔ بی بی کے قدموں میں ان کی ایک عزیزہ بیٹھی ہوئی تھیں اور محراب کے باہر ایک اور قریبی عزیزہ کھڑی تھیں۔ بی بی زہرا نے اشارہ دیا کہ اگر کسی بھی وقت تمہیں مدد کی ضرورت ہو تو ان دونوں سے رجوع کرنا۔ خواب دیکھنے والی خاتون اہل سنت تھیں اور خواب میں نظر آنے والی دو خواتین اہل تشیع تھیں۔ زہے نصیب ان تینوں خواتین کیلئے جنہیں بی بی کی زیارت نصیب ہوئی اور خواب میں بی بی کا قرب نصیب ہوا۔''

بزرگ خاتون ش 4 نے بتایا کہ 1930ء کا واقعہ ہے جب میری والدہ حج کے لئے گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک عورت ان کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ حضوؐر نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ وہ فوراً اٹھ کر ان کے ساتھ چل پڑیں۔ کافی دیر چلنے کے بعد ایک بڑی مسجد نظر آئی جس کا فرش گلابی رنگ کا تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو سامنے حضوؐر کو چند لوگوں کے ساتھ کھڑے پایا۔ وہ مٹی اٹھا کر دے رہے تھے۔ امی کے منہ سے بے ساختہ نکلا: میری جان سے زیادہ عزیز حضوؐر تیری مٹی کے صدقے تیرے اوپر جان نچھاور کردوں۔ وہ آگے بڑھیں لیکن حد ادب کے طور پر حضوؐر سے کچھ دور رک گئیں۔ حضوؐر نے فرمایا کہ باقاعدگی سے نماز پڑھا کرو۔ گو کہ امی جان نمازی اور عبادت گزار تھیں لیکن خواب میں حضوؐر سے عرض کرنے لگیں کہ میرے بچے چھوٹے ہیں میں باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھ سکتی۔ حضوؐر نے فرمایا کہ یہ عورت تمہیں نماز پڑھائے گی۔ اس کے بعد امی کی آنکھ کھل گئی۔ اگلے روز مسجد نبوی میں امی کو خواب والی عورت نظر آئی۔ وہ انہیں مسجد قبا میں لے گئی جس کے فرش گلابی تھے۔ وہ عورت کہنے لگی کہ میرے ساتھ چلو۔ اس مقام پر امی کو شک ہوا کہ نہ جانے وہ کون ہے اور کہاں لے جائے گی؟ امی نے بہانے سے انکار کردیا۔ اس نے امی کو ایک پوٹلی دی۔ اس پوٹلی میں ایک روٹی کا ٹکڑا، ایک مٹی کا ڈھیلا اور ایک کھجور کی گٹھلی تھی۔ وہ پوٹلی ادھر ادھر رکھی رہتی اور کوئی بھی اس کی پرواہ نہ کرتا۔ لیکن بتدریج اس پوٹلی کی عجیب

تاثیر سامنے آئی۔ انہوں نے مزید بتایا کہ ہم بہت سی بہنیں تھیں۔ سفید پوش لوگ تھے۔ جب بھی کسی بہن کی شادی کا وقت آتا تو اخراجات کی پریشانی گھیر لیتی۔ اسی کے ساتھ ہی وہ پوٹلی مل جاتی اور کسی غیبی مدد کے ذریعے تمام اخراجات پورے ہو جاتے۔ بعض اوقات تو گھر میں پیسے اور برکت کی ریل پیل ہو جاتی۔ آخری مرتبہ وہ پوٹلی سب سے چھوٹی بہن کی شادی میں ملی اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔ شاید وہ اپنا کام پورا کر چکی تھی۔ امی جان جب تک زندہ رہیں افسوس کرتی رہیں کہ وہ عورت کے کہنے پر اس کے ہمراہ کیوں نہ گئیں؟''

ش 1 نے بتایا کہ ان کی والدہ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں اور حقوق العباد کا بھی خیال رکھتی تھیں۔ وہ بچپن سے موت سے بہت ڈرتی تھیں۔ ایک مرتبہ خواب میں انہوں نے سفید چادر سے ڈھکا ایک جسم دیکھا۔ اچانک چادر چہرے سے خود بخود ہٹ گئی تو معلوم ہوا کہ وہ حضورؐ تھے۔ ان کی ریش مبارک خط کی ہوئی تھی۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں اور فرمایا کہ تم موت سے ڈرتی کیوں ہو؟ میں ہوں نہ شفاعت کے لئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھ کھل گئی۔

7۔2۔3۔تذکرہ کچھ روحانی صلاحیتوں کا

ذیل میں اسی مضمون کے حوالے سے چند شرکائے ریسرچ کے ذاتی تجربات اور محسوسات بیان کئے جاتے ہیں۔

ایک عزیزہ کا بیان تھا کہ وہ انسانی جسم کی شعائیں محسوس کرتی ہیں، جن میں منفی جذبات کے لحاظ سے غیبت اور حسد کی وائبز تیز ترین ہوتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے حاسدوں کو افسردہ اور غمگین پایا۔ ان میں سے اکثر ڈیپریشن کا شکار تھے۔ ڈیپریشن ذہنی اور جسمانی بیماریاں پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات وہ بیماریاں اگلی نسل میں بھی منتقل ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے مزید بتایا کہ میں نے غاصبوں کو انتہائی بزدل پایا۔ وہ ہر گھڑی اپنے اعمال کا عقدہ کھلنے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں اور ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی انہیں چوکنا کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں نے جھوٹے افراد کو کج بحث اور خود مدافعتی پایا۔ آخر میں میں کہوں گی کہ حاسد اپنی ہی جلائی ہوئی ایک ایسی آگ میں جلتا ہے جس کے اثرات قدرتی آگ سے

زیادہ سخت ہوتے ہیں۔قدرتی آگ تو آکسیجن کی بدولت بھڑکتی ہے اور بھڑک کر بجھ جاتی ہے۔جبکہ حسد کی آگ حامل کے دماغ سے نکلنے والے زہریلے مادوں سے نمو پاتی ہے جن کی ترسیل کبھی نہیں رکتی۔ یہ آگ نہ بھڑکتی ہے نہ بجھتی ہے بس مسلسل جلتی رہتی ہے اور حامل کو موت کی وادیوں کے قریب تر کرتی رہتی ہے۔ البتہ یاد رہے کہ یہ ذہنی علت بند گلی نہیں بلکہ خدائے ذوالجلال نے واپسی کے راستے بھی کھلے رکھے ہوئے ہیں۔تاہم اس امر کے لئے خود آگاہی، مضبوط قوت ارادی، کثرت استغفار اور تزکیہ نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔حاسد کے لئے اپنے جذبات پر قابو پانا اتنا ہی مشکل ہے جیسے کسی کے جسم سے تمام زہریلا خون نکال لیا جائے اور اس کی جگہ نیا لہو ڈال دیا جائے۔اس لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ آغاز سے ہی ان ناپسندیدہ جذبات پر بند باندھنے کی کوشش کی جائے۔

دوسری جانب انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اسی معاشرے میں ان کی ملاقات ولیوں جیسے انسانوں سے بھی ہوئی۔ وہ آج کے دور میں بھی خودغرضی اور حسد جیسے ناپاک جذبات سے کوسوں دور تھے۔ وہ ایماندار، ہمدرد، سچ کہنے والے اور حق کا ساتھ دینے والے تھے۔یعنی کہ دنیا سچے لوگوں سے ابھی خالی نہیں ہوئی اور شاید یہی گنے چنے لوگ کل کے معاشرے کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔

مندرجہ ذیل حصے میں ایک اور شریک تحقیق (ش 1) کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے جس کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی شفا رکھی تھی۔

ان کا کہنا تھا کہ انہیں ایک لمبے عرصے تک اپنی علیل والدہ کا خیال رکھنے کی توفیق نصیب ہوئی۔شاید ماں کی خدمت کا نتیجہ تھا کہ خدا نے ان کے ہاتھوں میں شفا عطا کر دی۔ جب انہیں اس خدائی تحفے کا احساس ہوا تو انہوں نے تھراپی سیکھی اور بلا معاوضہ خواتین کی تھراپی شروع کر دی۔ وہ کہتی ہیں کہ جب میں کسی کے کندھوں پر ہاتھ رکھتی ہوں تو میری آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں اور میں اپنے اندر کی دنیا میں ضم ہو جاتی ہوں۔اس وقت میں مریض کے جسم سے نکلنے والی شعاعوں کو محسوس کرتی ہوں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میرے جسم کی مثبت شعائیں اس کے جسم میں داخل ہو رہی ہیں اور اس کی منفی شعائیں فضا

میں تحلیل ہوتی جارہی ہیں۔ اکثر ان کے پاس سر درد، کمر درد، پٹھوں کے کھچاؤ یا ٹینشن میں مبتلا خواتین آتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی ہر تھراپی کامیاب ہوتی ہے۔ البتہ منفی سوچ رکھنے والے مریض وقتی طور پر تو شفا پا جاتے ہیں لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کے درد لوٹ آتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو تھراپی کے لئے آتے تو ہیں لیکن میری صلاحیتوں پر پورا یقین نہیں رکھتے انہیں فائدہ نہیں پہنچتا۔

ان کا بیان امریکی نفسیات دان کارل روجرز سے بہت ملتا جلتا ہے۔ کارل روجرز نے جدید علم نفسیات میں انسانیت پسند نقطہ نظر کی بنیاد رکھی۔ روجرز کا کہنا تھا کہ: ''میں اس وقت بہترین تھراپسٹ ہوتا ہوں جب میری الہامی کیفیت جاگ اٹھتی ہے۔ جب میرا رابطہ نا معلوم اندرونی طاقتوں سے ہو جاتا ہے تو میرا وجود کلی طور پر شفا بن جاتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری روح مریض کی روح کے ساتھ منسلک ہوگئی ہو اور ہم ایسے میڈیم میں سفر کر رہے ہوں جہاں پر زیادہ صحت مند شعائیں موجود ہوں۔ (xv)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مذکورہ بالا عزیزہ جسمانی فزیو تھراپی کرتی تھیں جس میں وہ مریض کی گردن اور کندھوں کو اپنے ہاتھوں سے چھوتی تھیں۔ جبکہ کارل روجرز نفسیاتی تھراپسٹ تھا۔ وہ صرف مریض کی بات غور سے سنتا تھا اور اس کے حالات کے مطابق مشورہ دیتا تھا۔ بغیر کسی جسمانی لمس کے اس کی ذہنی لہریں مریض کی ذہنی لہروں سے رابطہ قائم کر لیتی تھیں اور وہ شفایاب ہو جاتا تھا۔ کیا ہمارا دل یہ نہیں چاہتا کہ اس نظام کی تحقیق کریں؟ کیا آپ اس مقام پر محسوس کرتے ہیں کہ روحانیت انسانیت کی مدد کرتی ہے۔ جہاں مادیت کا دائرہ کار ختم ہو جاتا ہے وہاں سے روحانیت کا دائرہ کار شروع ہوتا ہے اور اس کا دائرہ اثر مادیت سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے جس میں ایک نفسیات دان نے روحانیت پر یقین کے بل بوتے پر علم نفسیات میں انقلاب برپا کر دیا۔ تاریخ ایسے لاتعداد واقعات سے بھری پڑی ہے۔ کیا ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم بھی اپنی روحانی قوتوں کو جلا بخش کر خود کو اور دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔ کیوں نہیں؟ یقیناً یہ سب ہمارے دائرہ کار میں ہے۔

3.3۔شرکاء کے انٹرویو اور ان کے جوابات

انٹرویو کے دوران شرکاء تحقیق سے پوچھا گیا کہ

(1)ان کے خیال میں روحانیت کیا ہے؟

(2)ان کے خیال میں نوجوان نسل روحانیت سے کیوں دور ہوگئی ہے؟

(3) کیا انہیں روحانیت کی جانب راغب کیا جا سکتا ہے، اگر کیا جا سکتا ہے تو کیسے؟

شرکاء کے جواب کچھ اس طرح تھے۔

سوال #1: روحانیت کی تعریف

سوال نمبر 1 کے جواب میں ش 2 نے کہا کہ ''روحانیت ایک نور ہے۔ ہمارے درمیان آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو روحانیت کی اعلیٰ منازل پر فائز ہیں۔ جو لوگ اللہ، اس کے رسولؐ اور آل رسولؐ کے قریب ہوتے ہیں انہیں ایسے مظاہر کا ادراک بھی ہو جاتا ہے جو دوسروں کو نہیں ہوتا۔ نور اور غلاظت ایک جگہ اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ نور غلاظت کو صاف کرتا ہے لیکن جہاں غلاظت غالب آجائے تو نور اس جگہ داخل نہیں ہو سکتا۔''

''ہمارا وجود سوراخ دار ڈرم کی طرح ہے۔ اگر ہم عبادت الٰہی کریں مثلاً نماز، روزہ وغیرہ اور خصوصاً تسبیحات کا اہتمام کریں تو ہمارے اندر نور بھر جاتا ہے۔ ہماری غلطیاں ہمارے سوراخ ہیں جن سے نیکیاں ہمارے وجود سے باہر نکلتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات ہم ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن کا ہمیں ادراک بھی نہیں ہوتا۔''

''ماحول کے بھی مثبت اور منفی اثرات ہوتے ہیں۔ جب ہم بچے تھے تو ذرائع آمدنی زیادہ نہیں تھے۔ ایک شخص کماتا تھا اور سارا خاندان کھاتا تھا۔ قناعت پسندی عام تھی۔ صبح ہمیں چائے کے ساتھ پراٹھا ملتا تھا۔ جو مزہ اس ناشتے میں ہوتا تھا آج کے فاسٹ فوڈ میں وہ مزہ کہاں؟ ہمارے والدین رات کو مونگ پھلی اور چائے کی محفل سجاتے اور باتوں ہی باتوں میں خدا، اس کے رسولؐ اور آل رسولؐ کے واقعات سنایا کرتے۔ اب تو ہمارے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ ہی ویسا خلوص تو پھر ہم اپنے بچوں پر کس طرح سے مثبت دنیاوی اور روحانی اثرات ڈال سکتے ہیں؟''

اسی سوال کے جواب میں عیسائی شریک تحقیق ش 8 نے کہا کہ ''مذہب کے سلسلے میں ہمارے رویے بے لچک ہو گئے ہیں۔ اسے ضرورت سے زیادہ قاعدہ قانون کا پابند کر دیا گیا ہے جبکہ نوجوان نسل بہت زیادہ پابندیاں برداشت نہیں کرتی۔ مزید یہ کہ ہم مذہبی اصولوں کو تفصیل سے بیان کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر عیسائی مذہب کی رو سے ہمائے کا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ کٹر پادریوں کے مطابق ہمسائے کا مطلب صرف عیسائی ہمسایہ ہے جبکہ اکثر نوجوانوں کا خیال ہے کہ ہمسایہ کسی بھی مذہب یا مکتب فکر سے تعلق رکھنے والا ہو سکتا ہے۔ ان بندشوں کی وجہ سے نئی نسل نہ صرف دین سے دور ہوتی جا رہی ہے بلکہ روحانیت پر اس کا اعتقاد بھی ختم ہو رہا ہے۔ انسان اس وقت روحانیت کا قائل ہوتا ہے جب اسے اپنی توجیہات پیش کرنے کی اجازت ہو اور آزادانہ اظہار خیال کی وجہ سے اس پر فتویٰ نہ لگایا جائے۔ اس طرح اس کا ذہن تحلیل و تجزیہ کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس کی سوچ میں گہرائی پیدا ہوتی ہے اور وہ دین و دنیا کی ایک مکمل تصور دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔''

ش 17 نے کہا کہ ''روحانیت اپنی تخلیق، وقت اور حیثیت کا مقصد سمجھنے کا نام ہے۔ ہم کیوں پیدا ہوئے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ ہمارا وقت اور خاندان ہم سے کیا تقاضا کرتا ہے؟ جن لوگوں سے ہم ملتے ہیں کیوں ملتے ہیں؟ جو تجربات کرتے ہیں کیوں کرتے ہیں؟ ان مشاہدات اور تجربات کا جواب جس طرح دیتے ہیں کیوں دیتے ہیں؟ اپنے رب کے ساتھ ہمارا کیا رابطہ ہے؟ اس کی مخلوقات کے ساتھ ہمارا رابطہ کیا ہے؟ فطرت میں توازن برقرار رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں کون سی صلاحیتوں سے نوازا ہے؟''

ش 14 نے پہلے سوال کے جواب میں کہا کہ ''پاکستان میں روحانیت کا مطلب دنیاوی معاملات سے دوری اور مادی زندگی سے بیزاری کے طور پر لیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے دنیاوی اور روحانی دنیا کو دو مختلف ڈبوں میں بند کر دیا ہے۔ ہم دوغلے معیار کا شکار ہیں۔ ہمارے نزدیک جسمانی ضروریات کچھ اور ہیں اور روحانی کچھ اور۔ ہم صرف نماز روزے کو ہی روحانیت سمجھتے ہیں۔ صرف تسبیح گھمانے سے روحانی بالیدگی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ایمانداری اور خلوص نیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ روحانیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ظاہر اور باطن ایک ہو۔

میرے خیال میں انسان جب اپنے فرائض پوری تندہی سے سرانجام دیتا ہے تو وہ روحانی بالیدگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔"

ش13 نے اس سلسلے میں کہا کہ "روحانیت اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ معرفت کے لئے قلبی اور باطنی تعارف کی ضرورت ہوتی ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ خدا کائنات میں کہیں نہیں سماتا لیکن مومن کے دل میں سماجاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ

دل بینا بھی کر خدا سے طلب

آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

"قرآن ہماری ظاہری نظر کو ایک دھوکا کہتا ہے جبکہ اندرونی آنکھ حقیقی ہے۔ روحانیت اس آنکھ سے فائدہ اٹھانے کا نام ہے۔ باطن میں اترنے کے مختلف راستے ہیں جن میں سے ایک غوروفکر ہے۔ حضوؐر غار حرا میں عبادت الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی خلقت پر غوروفکر کیا کرتے تھے اور اسی مقام پر آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ لہٰذا غوروفکر مسلمان کا ورثہ ہے۔ ہم غوروفکر کے ذریعے بھی روحانیت حاصل کرسکتے ہیں۔"

ش16 نے کہا کہ "ہر وہ شے جو ہمیں خدا سے ملادے وہ روحانیت کہلاتی ہے۔ چاہے وہ نماز ہو، قرآن پاک کی تلاوت ہو، پیغمبروں پر ایمان یا چودہ معصومین اور خصوصاً واقعات کربلا۔"

ش10 نے جواب دیا کہ "روحانیت کا مطلب ہے متقی ہونا۔ ہم جتنا زیادہ تقویٰ اختیار کرتے جائیں گے اتنی ہی روحانی بالیدگی حاصل ہوتی جائے گی۔"

عالم دین شریک تحقیق ش 5 نے کہا کہ "روحانیت کا مطلب انسان کا خدا سے رشتہ ہے۔ موجودہ دور میں مادی خواہشات کی بہتات کی وجہ سے روحانیت کمزور پڑتی جارہی ہے۔ انسان کو مادی خواہشات دیدہ زیب بنا کر دکھائی جارہی ہیں۔ نوجوانوں میں روحانیت اجاگر کرنے کے لئے انہیں اسلام کی اصل روح سے آشنا کروانا پڑے گا۔ انہیں ان کی زندگی کا مقصد بتانا ہوگا اور مادی خواہشات کی بہتات کے نقصانات سے آگاہ کرنا ہوگا۔"

سوال #2 اور 3 کے جوابات: روحانیت کی کمی کی وجوہات اور نوجوانوں کو روحانیت کی جانب راغب کرنے کی تجاویز

اس سلسلے میں ش 8 نے کہا کہ ’’جہاں تک نوجوانوں کو روحانیت کی جانب مائل کرنے کی بات ہے تو فی زمانہ ہمیں تحمل اور شفقت کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ نوجوانوں کو دین کے بارے میں آزادانہ بات کرنے اور اپنے شکوک کا اظہار کرنے کی اجازت دیں۔ انھیں انعکاس سوچ اور غور وفکر کے مواقع میسر ہونے چاہئیں۔ یہ امور نوجوانوں میں ذمہ داری اور روحانی بالیدگی پیدا کرنے کے لئے چراغ راہ ثابت ہوسکتے ہیں۔‘‘

ش 2 نے اظہار خیال کیا کہ ’’سوشل میڈیا کے نقصانات زیادہ اور فوائد کم ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ صبح جب بچے اسکول وین کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں تو ان کے سر موبائل فون پر جھکے ہوتے ہیں۔ وہ موسیقی سننے یا مووی دیکھنے میں محو ہوتے ہیں۔ میڈیا کی وجہ سے عریانی عام ہوگئی ہے۔ اچھے برے کی پہچان نہیں رہی۔ اگر میں صرف اپنے ہی محلے کی مثال لے لوں تو سب چھوٹے بڑے، حتیٰ کہ بزرگ بھی ان علتوں میں گرفتار ہیں۔ جب ہمارے حواس خمسہ ماحول سے ہر قسم کی برائی جذب کر کے ہمارے اندر اتاریں گے تو روحانی بالیدگی بھلا کہاں سے آئے گی؟‘‘

انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ’’روحانیت دو طرح کی ہوتی ہے جیسے حضرت علیؑ نے فرمایا کہ گندگی میں رہ کر خود کو پاک کرو۔ دوسرے یہ کہ اکیلے میں اپنے نفس کو پاک کرو۔ روحانیت صرف عبادت کا نام نہیں۔ اپنا تجزیہ کرنا پڑتا ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں کھڑا ہوں؟ ایسا تو نہیں کہ کسی گڑھے میں جا گرا ہوں۔ اور اگر گرا ہوں تو اس کی کیا وجوہات ہیں اور میں اپنے آپ کو اس جگہ سے باہر کس طرح نکال سکتا ہوں؟ رزق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو آپ کے پیچھے آتا ہے اور ایک وہ جس کے پیچھے آپ بھاگتے ہیں۔ جو آپ کے پیچھے آتا ہے وہ آپ کے نصیب کا ہے۔ جس کے پیچھے آپ بھاگتے ہیں وہ شاید آپ کی دنیاوی حرص کا نتیجہ ہو۔ ہمیں اپنا تجزیہ کرنا چاہیے کہ اگر ہم رزق کے پیچھے بھاگ رہے ہیں تو ایسا کیوں ہے؟ مادی دنیا ایک جھوٹی شناخت ہے۔ اس کے پیچھے بھاگ کر روحانی دنیا کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔‘‘

ش 5 نے دوسرے سوال کے جواب میں کہا کہ ’’روحانیت کا انحطاط اس وجہ سے واقع

ہو رہا ہے کیونکہ ہم فطرت کے اصولوں کے الٹ چل رہے ہیں۔ بلکہ ہم تو خود اپنی ذاتی فطرت کے بھی خلاف چل رہے ہیں۔ ہم فطری قوتوں کے استعمال میں اپنی حدوں سے تجاوز کر چکے ہیں۔ مادی اشیا کے جنون نے ہماری عقل پر پردے ڈال دیئے ہیں۔"

تیسرے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "نوجوانوں میں بامعنی قصے کہانیاں پڑھنے اور سننے کے رجحان سے روحانیت کا دوبارہ سے اجراء کیا جا سکتا ہے۔ سادہ اور آسان قصوں کے ذریعے انہیں ایسے......اور مناظر دکھائے جا سکتے ہیں جن پر موجودہ تیز رفتار زندگی نے پردہ ڈال دیا ہے۔ انہیں تنقیدی سوچ کا عادی بنائیں تا کہ وہ ہر نئے نظریے کو من وعن قبول کرنے کی بجائے اس کا تنقیدی جائزہ لیں۔"

دوسرے سوال کے جواب میں ش 14 نے کہا کہ "آپ نوجوانوں کو زندگی کا مقصد دیں۔ اگر میں اپنی مثال لوں تو کالج میں مجھے اکنامکس ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھنا پڑا۔ جبکہ اکنامکس میرا فیلڈ نہیں تھی۔ میں ذہنی طور پر لٹریچر کا بندہ ہوں لیکن چونکہ میرا مقصد کالج میں اچھے نمبر حاصل کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لینا تھا اس لئے میں نے اس مضمون پر بھی پوری توجہ دی۔ آخر کار میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی اور ایم اے کرنے کے بعد آج اپنی مرضی کے کیرئیر میں ہوں۔"

سوال نمبر 3 کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "آج ہمارے نوجوان بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے پیر کامل کی تلاش میں رہتے ہیں اور جعلی پیروں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ میری نظر میں اگر ہم اپنا کام نیک نیتی اور تندہی سے کر رہے ہوں تو ہمیں جسمانی اور روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم دوسروں کے لئے مشعل راہ بھی بن جاتے ہیں۔ ہمارا موجودہ طریقہ تعلیم ہمیں زندگی کا مقصد فراہم نہیں کرتا۔ اگر ہم ایک مسلمان کے طور پر بات کریں تو ہماری تعلیم وتربیت میں کمی ہے۔ ہمیں اس کمی کو پورا کرنے کی ضرورت ہے۔ با مقصد زندگی گزارنے کی وجہ سے اندرونی آنکھ خود بخود کھل جائے گی۔"

ش 13 نے دوسرے سوال کے جواب میں کہا کہ "ہم اپنی دنیاوی زندگی میں مصروف

ہیں اور روحانیت کے مقابلے میں مادی ضرورتوں پر ہماری توجہ اور زیادہ ہوگئی ہے۔ روحانیت کو چھوڑ کر مادیت کے پیچھے بھاگنا گول چکر میں دوڑنے کے مترادف ہے جس میں ہم کسی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔''

ش 10 نے دوسرے سوال کے جواب میں کہا کہ ''ہمیں چاہیے کہ ہم نئی نسل کو روحانیت کا عملی نمونہ پیش کریں تا کہ روحانیت کا فروغ ہمارے بچوں اور خاندان کے دوسرے افراد میں ہو۔''

ہم نے اس باب میں شرکاء کے بیان کئے ہوئے چھٹی حس، غیبی امداد، اور سچے خوابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ امور انسانی روح کی طاقت کو اجاگر کرتے ہیں۔ چھٹی حس اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہتھیار ہے جو بعض اوقات ہمیں مستقبل میں پیش آنے والے غیر معمولی حالات کا پتہ دیتی ہے۔ بعض اوقات کسی کی قوت سماعت حالت بیداری میں ماورائے طبعیات آوازیں سن لیتی ہے یا کسی کی قوت بینائی روحانی ہستیوں کا نظارہ کرتی ہے۔ خوابوں میں ہماری روح ماضی یا مستقبل کے حالات کا مشاہدہ کرتی ہے۔ بعض اوقات وہ ہمارے جسم سے جدا ہو کر عالم ارواح کا سفر کرتی ہے اور مرحومین کی روحوں سے ملاقات کرتی ہے۔

چوتھا باب

روحانیت:

کیفیتی تحقیق کا تجزیہ

اس باب میں ہم شرکاء کے بیان کردہ واقعات اوران کی آرا کا جائزہ لیں گے۔ چونکہ خواب ہماری تحقیق کا اہم حصہ رہے ہیں اس وجہ سے جائزہ کا پہلا حصہ ہم خوابوں کے لئے مختص کرتے ہیں۔اس کے علاوہ تقریباً تمام شرکاء نے روحانی بالیدگی کو مندرجہ ذیل عادات وخصائل کا نتیجہ قرار دیا۔

- صوم وصلاۃ کی پابندی اور دیگر عبادات کا اہتمام کرنا۔
- حسد، جھوٹ، بغض، چوری اور چغل خوری کے برے اثرات۔
- نیک نیتی، سچائی اور تقدیر کے فیصلوں پر صبر وشکر۔
- کچھ ذکر قریب المرگ واقعات اور اندرونی آوازوں کا بھی ملتا ہے۔
- مشکل حالات سے گزر کر روحانی بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔

آیئے اب ہم درجہ بدرجہ ان امور کے انسانی زندگی پر اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔

4.1۔ سچے خواب

چونکہ سچے خواب ہماری بحث کا اہم حصہ رہے ہیں اس وجہ سے اپنے باب کا آغاز خوابوں کے تجزیے سے کرتے ہیں۔قدیم مصریوں نے 1250ء قبل از مسیح میں پیپرس پر ایک کتاب لکھی جس کا موضوع تھا کتاب موت (The Book of Dead) اس کتاب کے مطابق نیند موت کا پہلا مرحلہ ہے اور حالت خواب میں مذہبی پیشوا اور بادشاہ دوسری دنیا کے واقعات بھی دیکھ لیتے ہیں۔ 'با' روح کا وہ حصہ ہے جو خواب میں عارضی طور پر اور موت کے وقت مستقل طور پر انسان کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے جبکہ 'را' موت کے بعد دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے[xvi]۔اس قدیم مصری فلسفے کے مطابق سچے خواب مذہبی پیشواؤں اور بادشاہوں کا حصہ تھے لہٰذا روحانی صلاحیتیں اور خدا سے قربت صرف انہی دو طبقات کو حاصل تھی۔جبکہ اسلام میں ایسی کوئی پابندی نہیں، دنیاوی معاملات ہوں یا روحانی، ہر انسان کو خدا تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔

بائبل میں پیغمبروں کے خواب بیان کیئے گئے ہیں اور ان کو طبیعیاتی دنیا اور مابعد طبیعیات کے درمیان رابطہ قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں تالمود میں نیند کو موت کا ساٹھواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔[xvii]

ایرانی مصنف علی ارسلان اپنی کتاب 'قرآن کے نقطہ نظر سے خوابوں کی حقیقت، اقسام اور اثرات' میں لکھتے ہیں کہ قرآن پاک نیند کی حالت میں روح کے جسم سے نکلنے اور مختلف جہانوں میں سفر کرنے کا تذکرہ کرتا ہے۔ البتہ روح کا ایک لطیف تعلق جسم سے باقی رہتا ہے۔ اسی لئے نیند کو ''النوم اخ الموت'' یعنی کہ موت کا بھائی کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ جس طرح خدا نے نینداور بیداری کو پیدا کیا اسی طرح سے موت اور زندگی کو بھی پیدا کیا (الملک:2، الانعام:6، 60)۔ قرآن پاک نیند کی اقسام پر بھی روشنی ڈالتا ہے یعنی کہ

- ہلکی نیند: ایسی نیند کو اردو میں جھپکی، فارسی میں اسنوز اور عربی میں سنا کہتے ہیں۔ البقرہ (2، 255) میں ارشاد ہوتا ہے کہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (ترجمہ: خدا کو جھپک نہیں آتی)۔
- گہری نیند کی جانب مائل ہلکی نیند: یہ نیند گہری نیند کی جانب مائل ہوتی ہے۔ اس نیند کو قرآن پاک میں ناس کا نام دیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ انفال (11) میں ارشاد ہوتا ہے کہ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ۔
- گہری نیند: اسے قرآن پاک میں النوم کے نام سے یاد کیا گیا ہے (البقرہ 2، 255)۔

قرآن پاک کے مطابق انسان گہری نیند سے سکون حاصل کرتا ہے۔ مثلاً جب آپ ہلکے سے سوتے ہیں تو آپ امن اور سلامتی حاصل کرتے ہیں۔ (الانفال:11)۔ ہلکی نیند افسردگی اور ذہنی تناؤ سے نجات دیتی ہے۔ سورہ آل عمران (164) میں ارشاد ربی ہوتا ہے کہ جنگ بدر میں ہلکی نیند سے بیدار ہونے کے بعد مجاہدین کی افسردگی دور ہوگئی۔ مناسب نیند نہ صرف اطمینان قلب کا باعث ہوتی ہے بلکہ موت وحیات کے فلسفے کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ جب انسان سوتا ہے تو تقریباً اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ وہ جتنی گہری نیند میں جاتا ہے اتنا ہی موت سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب وہ بیدار ہوتا ہے تو دوبارہ سے جی اٹھتا ہے۔ روزانہ کی اس موت وحیات

کے الٹ پھیر میں غور وفکر کرنے والوں کیلئے ان گنت راز چھپے ہیں۔

قرآن پاک اس امر کو بھی واضح کرتا ہے کہ نیند کے دوران انسانی جسم کی بیرونی سرگرمیاں بند ہو جاتی ہیں اور بعض اندرونی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ سورہ فرقان: 47 میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ وَالنَّوْمَ سُبَاتًا ایسے ہی الفاظ سورہ نبا: 9 میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ عربی لفظ سبت کے معنی بندش کے ہیں۔

امام جعفر صادق ؑ کے مطابق انسانی روح کا بنیادی مقام اس کا جسم ہے۔ لیکن اس کی پہنچ جسم سے بہت آگے تک ہے۔ نیند کے دوران انسان کی روح دوسرے جہانوں کی سیر کرتی ہے۔ وہ غیر مرئی ماحول، افراد یا فرشتوں کا مظاہرہ کرتی ہے۔ کبھی کبھار اس کا واسطہ ماضی یا مستقبل میں ہونے والے واقعات سے بھی پڑ جاتا ہے۔ یہاں پر ہم صلحاء اور فقہا سے متعلق چند خوابوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ امام معصوم سے یہ بھی منقول ہے کہ سچا خواب انبیا کے اوصاف کا سترہواں (17) حصہ تھا۔ سورہ یوسف میں حضرت یوسفؑ کے کم سنی کے ایک خواب کا ذکر ملتا ہے جس میں انہوں نے گیارہ ستارے دیکھے جو زمین پر اترے۔ ان کے ہمراہ چاند اور سورج بھی تھے۔ ان سب نے حضرت یوسف کو سجدہ کیا۔ حضرت یعقوبؑ نے انہیں ہدایت کی کہ وہ خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کریں۔ ورنہ وہ حسد کے مارے انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

یہاں پر علامہ محمد باقر مجلسیؒ کے ایک عقیدت مند کا قصہ بے محل نہ ہوگا۔ وہ بحرین کا رہنے والا تھا۔ وہ ان سے ملاقات کرنے کے لئے بحرین سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا اصفہان تک پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ آیت اللہ وفات پا گئے ہیں۔ وہ بہت غمگین ہوا۔ سویا تو خواب میں دیکھا کہ ایک مکان میں ایک منبر سجا ہوا ہے۔ اس کے عرشہ پر حضوؐر اور پہلی سیڑھی پر حضرت علیؑ کھڑے ہیں۔ منبر کے سامنے تمام انبیاء صف باندھے کھڑے ہیں۔ ان کے پیچھے بہت سی صفیں ہیں۔ ایک صف میں ملا محمد باقرؒ بھی کھڑے ہیں۔ حضور کی نگاہ ان پر پڑی تو فرمایا: آخوند ملا محمد باقر آگے آؤ۔ وہ چند صفیں آگے آ گئے۔ پیغمبرؐ نے دوبارہ فرمایا: آگے آؤ۔ وہ حضوؐر کے قریب آ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ ملا محمد باقرؒ نے عرض کی، حضوؐر مجھے پیغمبروں کے سامنے شرمندہ

نہ کریں، حضور مسکرائے اور تمام پیمبروں سے فرمایا کہ آپ بھی بیٹھ جایئے تا کہ ملا محمد باقر بیٹھیں (مقدمہ حیات القلوب)۔

نیک خوابوں کی طرح ہم بد خواب بھی دیکھتے ہیں اور کبھی کبھار ان کی تعبیر بھی سامنے آجاتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے برے خواب کے اثرات سے بچنے کے لئے ہدایت کی کہ جب جاگے تو یہ الفاظ کہے، 'میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں اس برے خواب سے جو میں نے دیکھا۔ اس خدا سے جس نے مقرب فرشتے بنائے اور اپنے پیغمبر بھیجے۔ اس کے بعد سورہ الحمد اور الاخلاص کی تلاوت کرے اور اپنی دائیں جانب تین مرتبہ تھوکے۔ ان شاء اللہ برے اثرات سے محفوظ رہے گا'۔

اس کے علاوہ اسلام نے ہمیں سونے کے آداب بھی سکھائے ہیں تا کہ نیند کے دوران جسم و روح پاکیزہ رہیں اور انسان صالح خوابوں سے فیضیاب ہو سکے۔ مثلاً سونے سے پہلے دانت صاف کرنا، وضو کرنا، دائیں کروٹ سونا اور سونے سے پہلے خدا کو یاد کرنا، وغیرہ۔

مغربی محققین انیسویں اور بیسویں صدی کے تجربات کے بعد نیند کے بارے میں ایسے حقائق سامنے لائے جو اسلام آج سے چودہ سو سال پہلے واضح کر چکا تھا۔ مغربی اصطلاح میں گہری نیند کو آر-ای-ایم (REM) کا نام دیا گیا ہے۔ یونیورسٹی آف کینٹکی کے پروفیسر کیلون نیلسن کا کہنا ہے کہ دماغ کا وہ حصہ جو نشاندہی کرتا ہے کہ انسان مادی لحاظ سے کہاں ہے، وہ آر-ای-ایم کے دوران کام کرنا بند کر دیتا ہے اور روح کچھ دیر کے لئے آزاد ہو جاتی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ خواب نہیں دیکھتے۔ درحقیقت ہر شخص خواب دیکھتا ہے لیکن کچھ لوگوں کو خواب یاد نہیں رہتے۔ مزید کچھ لوگ زندگی میں بہت زیادہ مصروف ہوتے ہیں اور وہ خوابوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کچھ اور لوگ اپنے ذہنی اضطراب کی وجہ سے ہر وقت چوکنا حالت میں رہتے ہیں۔ وہ یا تو گہری نیند میں جا ہی نہیں پاتے یا بہت جلد ان کا لاشعور انہیں گہری نیند سے باہر نکال لاتا ہے۔ ایسے لوگ خواب کم دیکھتے ہیں اور دیکھے ہوئے خواب بہت جلد بھول جاتے ہیں۔

حالت خواب یا بیداری میں فرشتوں سے ملاقات: بیانیہ حصے میں ایک عیسائی شریک تحقیق

نے محافظ فرشتوں کا ذکر کر کے سوچ کی نئی راہیں کھول دیں۔ اسلام میں فرشتوں کا ذکر بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن اسکول کی دینیات کی تمام کتابیں چار مقرب فرشتوں اور ان کے فرائض سے آگے نہیں جاتیں۔ یعنی کہ حضرت جبرائیل، میکائیل، عزرائیل اور اسرافیل۔ ان چار میں سے اول الذکر کا تعلق ماضی اور آخر الذکر کا مستقبل کے ساتھ دکھایا جاتا ہے۔ یعنی حضرت جبرائیل وحی لایا کرتے تھے اور جب قیامت آئے گی تو حضرت اسرافیل صور پھونکیں گے۔ حضرت میکائیل کا تعلق ہوائیں چلانے اور بارش برسانے سے ہے۔ لیکن ان کا تفصیلی تذکرہ عام کتابوں میں نہیں ملتا۔ اب رہ گئے حضرت عزرائیل تو گو کہ ان کا واسطہ ہر نفس سے ہے لیکن کچھ اس طرح سے خوف میں ڈوبا ہوا ہے کہ ہم ان کے بارے میں سوچنے سے احتراز کرتے ہیں۔ یہی حال منکر و نکیر کا بھی ہے۔ علاوہ ازیں بچپن سے ہم اپنے دونوں کاندھوں پر بیٹھے نیکی اور بدی کے فرشتوں کے بارے میں سنتے آئے ہیں لیکن ان کے بارے میں بھی زیادہ شعور نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ رزق کے فرشتوں کا تذکرہ بھی گاہے بگاہے آجاتا ہے لیکن ہم اسے ایک خود عیاں حقیقت (for granted) کے طور پر لیتے ہیں اور زیادہ توجہ نہیں دیتے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی مقرب مخلوق ہیں۔ وہ لاتعداد ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ زمین، آسمان اور مابین زمین و آسمان میں لاتعداد فرائض سر انجام دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم کام ہر انسان کی حفاظت بھی ہے۔ میتھوڈسٹ منسٹر ڈاکٹر جان ڈبلیو اپنی کتاب فرشتوں کا مطالعہ (Angelic Study) میں لکھتے ہیں کہ ہر عیسائی کے ساتھ کم از کم ایک محافظ فرشتہ ہوتا ہے۔ قدیم پادریوں کا خیال تھا کہ ہر شہر پر ایک محافظ فرشتہ ہوتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ ان فرشتوں نے کہاں کہاں ہمیں مصیبت سے بچایا۔ اس کے علاوہ لوتھران چرچ (Psalm 9) میں لکھتا ہے کہ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ ہر معاملے میں تمہاری حفاظت کریں۔ وہ تمہیں اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ مشرقی آرتھوڈاکس چرچ سے تعلق رکھنے والے 'سرجل بلگاتو' کے مطابق ہر انسان کا ایک محافظ فرشتہ ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف دوست ہوتا ہے جو برائی سے بچاتا ہے اور اچھی سوچ پیدا کرتا ہے بلکہ وہ ہمارا روحانی رشتہ دار بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارٹن لوتھر ہر صبح دعا مانگتا تھا کہ تمہارے فرشتے میری حفاظت کریں۔

اسلام میں بھی محافظ فرشتوں کا تصور موجود ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کی حفاظت کے لئے فرشتے مامور ہیں (انفطار:10)۔ اس کے علاوہ حدیث نبوی ہے کہ لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کے فرشتوں میں سے محافظین نہ ہوں۔ جو اسے کنویں میں گرنے یا اس پر کوئی دیوار گرنے اور کسی برائی میں مبتلا ہونے سے بچاتے ہیں (المیزان)۔

اسی سلسلے میں ش 1 نے ایک غیر معمولی واقعہ سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ ''زندگی میں ایک وقت ایسا آیا جب میں شدید ذہنی تناؤ کا شکار ہوگئی۔ ایک رات میں دیر تک ماضی کو یاد کر کے کڑھتی رہی اور نماز فجر سے بھی غفلت برتی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس وقت میں آدھی سوئی آدھی جاگی تھی کہ اپنے سرہانے سفید لبادے میں ملبوس کسی ہستی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اچانک اس نے بڑی محبت کے ساتھ مجھے اس طرح بہلانا پھسلانا شروع کر دیا کہ اٹھو (میرا نام لے کر) اٹھو! نماز پڑھو۔ نماز سے بھلا کیا جھگڑا؟ اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز و گداز تھا کہ میں کچھ دیر تک بے حس و حرکت پڑی اس کی آواز سنتی رہی۔ جب تک میں نماز ادا کرنے کے لئے اٹھ نہیں گئی وہ ہستی موجود رہی اور مجھے نماز کی جانب راغب کرتی رہی۔ بعد میں جب میں نے اپنے بچوں کو وہ واقعہ سنایا تو بے ساختہ بول اٹھے کہ ماما آپ نے صبح کی نماز کا فرشتہ دیکھا ہے۔ اس غیر معمولی لیکن دلفریب نظارے کی وجہ سے فرشتوں کے متعلق میرا تصور بدل گیا۔ یوں تو ہم اکثر رحمت کے فرشتوں کا بہت ذکر سنتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ہماری توجہ زیادہ تر عتاب کے فرشتوں پر رہتی ہے۔ اس واقعے کے بعد میں اکثر سوچتی ہوں کہ ایسی پاکیزہ ہستی؟ ایسا شیریں لہجہ؟ ایک انسان کی بہتری کے لئے اتنی زیادہ تشویش؟ یقیناً مہربان رب نے لاتعداد رحمت کے فرشتے پیدا کئے ہیں جو اس جہان میں اور عالم ملکوت میں انسان کی مدد اور رہنمائی کرتے ہیں۔''

4.2۔ صوم و صلاۃ کی پابندی اور دیگر عبادات کا اہتمام

'نماز' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں 'جھک جانا' یا بندگی کا اظہار کرنا۔ جبکہ عربی لفظ 'صلاۃ' کے معنی 'دعا' کے ہیں۔ نماز اسلامی عبادات میں سے پہلی عبادت ہے جو حضورؐ کی مکی زندگی

کے دوران فرض ہوئی۔

اسلام سے پہلے نماز حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی قوموں پر نماز فرض کی گئی تھی لیکن اس کے احکامات مختلف تھے۔ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ زمین پر کثرت سے سجدہ کرتے تھے اس وجہ سے انہیں خلیل اللہ کا لقب دیا گیا (حیات القلوب)۔ دراصل موجودہ نماز کے ارکان یعنی قیام، تکبیر، رکوع، سجود اور قعود ہر زمانے میں رائج رہے۔ قبل از اسلام ادیان میں یہ ارکان مختلف ترتیب اور اعداد کے ساتھ نازل ہوتے رہے۔ البتہ وقت کے ساتھ ان ارکان کی ادائیگی میں افراط و تفریط ہوتی رہی اور بعض اوقات یہی عمل غیر اللہ کی پرستش کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ موجودہ زمانے میں اسلام کے علاوہ نماز کسی بھی مذہب میں فرض نہیں سمجھی جاتی، بلکہ تقویٰ حاصل کرنے کے لئے ایک اضافی رکن کے طور پر ادا کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر مذاہب کے ارکان نماز اور ان کی ترتیب بھی الگ ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں نماز صرف خاص موقعوں پر ادا کی جاتی ہے۔ یہودیت میں نماز صرف اجتماع میں ادا کی جاتی ہے۔ عیسائیت کے مختلف فرقوں میں نماز مختلف طریقوں سے پڑھی جاتی ہے۔ آرتھوڈاکس عیسائیوں میں مسلمانوں کی طرح زمین پر سر رکھ کر سجدہ کیا جاتا ہے۔ جبکہ رومن کیتھولک اور لوتھر الٹا لیٹ کر سجدہ کرتے ہیں۔

بدھ مت کی بعض عبادات نماز کے ساتھ ہلکی سی مماثلت رکھتی ہیں۔ مثلاً عبادت خانوں میں حاضری کے وقت وہ سیدھا کھڑے ہوتے ہیں اس کے بعد گھٹنوں پر جھکتے ہیں اور آخر میں سجدہ کرتے ہیں۔ البتہ ان کے لئے وضو کرنے یا جوتے اتارنے کی شرط نہیں ہے۔ 'بدھ سوتر' کے مطابق سجدے کی وجہ سے خوبصورت بدن اور سنہری رنگت حاصل ہوتی ہے۔ بدھسٹ کے ہاں بھی سجدہ کرنے کے دو طریقے رائج ہیں۔ بعض فرقے الٹا لیٹ کر سجدہ کرتے ہیں اور بعض مسلمانوں کی طرح سجدہ کرتے ہیں۔ کوریا میں رہنے والے بدھسٹ کی عبادت کسی حد تک مذاہب ابراہیمی سے قریب تر ہے۔ وہ روزانہ کسی دری یا یوگا میٹ پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کی نماز سے ملتی جلتی عبادت ادا کرتے ہیں۔ البتہ ان کے ہاتھوں کی حرکات مذاہب ابرہیمی سے مختلف ہیں۔ وہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں جوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ سجدے کے دوران ان کے بازو

زمین پر ہوتے ہیں۔ وہ ہاتھوں کو کانوں کے متوازی رکھتے ہیں اور ان کی ہتھیلیاں اوپر کی جانب ہوتی ہیں۔

بدھ مت کے عقدہ کے مطابق آج کے انا پرست معاشرے میں جھکنے یا سجدہ کرنے کا رواج ناپید ہو چکا ہے لیکن اگر یہ عبادت باقاعدگی سے ادا کی جائے تو یہ جسم کو دماغ کے قابو میں لے آتی ہے۔ مزید یہ کہ جب انسان کا سر اس کے پاؤں کے برابر آ جاتا ہے تو اس کی انا کا خاتمہ ہو جاتا ہے (lotusheartzen.org)۔ بعض اوقات ہندو برہمن سورج کی پوجا کے دوران اپنا ہاتھ کانوں تک بلند کرتے ہیں (تصویر #8)۔

تصویر #8



انیسویں صدی میں ایک برہمن سوریہ پوجا کرتے ہوئے

حضورؐ کی امت کو پانچ وقت کی نماز تحفے کے طور پر عطا ہوئی۔ معراج کے دوران حضورؐ نے فرشتوں کو قیام، رکوع اور حالت سجدہ میں دیکھا۔ حضورؐ کی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے اس عظیم عبادت کی سعادت ان کی امت کو عطا کی (حیات القلوب، حصہ 2)۔ نماز اپنے رب کے سامنے مکمل بندگی کا نام ہے۔ قیام، تکبیر، رکوع، قعود اور سجود سب خدا کی مکمل بندگی اور اطاعت کا اعلان کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں کسی اور عبادت کا ذکر اتنی کثرت سے نہیں پایا جاتا جتنا کہ نماز کا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب اسے آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔

سوائے نماز گزاروں کیجو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں (المعارج:230-21)۔ یا یہ کہ ہم نے انسان کو بے صبر پیدا کیا۔ سوائے ان کے جنہوں نے نماز اختیار کی اور وہ اس میں مستقل مزاج رہے (70:19-23)۔

حضور اکرمؐ سے ایک مرتبہ یہودیوں نے نماز کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جس وقت حضرت آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا تو وہ عصر کا وقت تھا۔ عصر کی نماز میری پسندیدہ ترین نماز ہے۔ مجھے حکم ہے کہ اس نماز کی حفاظت کروں۔ جب خدا نے ان کی دعا قبول فرمائی تو وہ مغرب کا وقت تھا۔ اس وقت انہوں نے تین رکعات نماز ادا کی۔ لہٰذا میری قوم پر بھی مغرب کے وقت تین رکعات نماز فرض کی گئی (حیات القلوب)۔

گزشتہ قوموں میں نماز اور دوسری عبادات مخصوص مقامات کے علاوہ اور کہیں بھی قبول نہیں ہوتی تھیں۔ اس کے برعکس حضورؐ کی امت کے لئے تمام زمین کو پاک قرار دیا گیا۔ سید جلال رضوی ہمدانی اپنی کتاب 'تجلیات نماز' میں لکھتے ہیں کہ اس عالم کی مثال ایک عظیم مصلے جیسی ہے جس کی محراب فلق اور شفق جیسی ہے (7)۔ اس کے علاوہ سابق کتابوں میں لکھا ہے محمدؐ کی امت ہر مقام پر خدا کی حمد کرے گی اور تکبیر کہے گی۔ ان کی اذان کی آواز شہد کی مکھی کی طرح آسمانوں میں گونجے گی۔ قیامت کے روز ندا دی جائے گی کہ حمد کرنے والے سامنے آئیں تو حضورؐ کی امت سامنے آئے گی (حیات القلوب 2)۔

نماز اوقات کے ساتھ فرض ہوئی ہے۔ قرآن پاک کے مطابق 'ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً' ترجمہ: بے شک نماز صاحبان ایمان کے لئے ایک معین وقت مقرر کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔ حضرت علیؑ جنگ کے دوران بار بار آسمان کو دیکھتے رہتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نماز کا وقت آن پہنچے اور وہ جنگ میں مصروف رہیں۔ امام حسینؑ نے زندگی کی آخری نماز خون کے دریا میں ڈوب کر ادا کی۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ:

مسلمان بی نمازی ناسپاسی است
نماز اول قدم در خود شناسی است

ترجمہ: بغیر نماز کے مسلمان ہونا ناشکری ہے اور نماز خود شناسی کی منزل میں پہلا قدم ہے۔

خوشا آنان کہ دائم در نماز ند

تمام عمر قائم بر نماز ند

ترجمہ: خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ہمیشہ نماز میں مشغول رہتے ہیں اور تمام عمر نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ نماز ہر قسم کی زمینی اور آفاقی بلاؤں سے حفاظت کرتی ہے۔ باقاعدگی سے نماز ادا کرنے کے لاتعداد دنیاوی اور روحانی فوائد ہیں۔ ان میں سے چند ایک ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔ نماز خشوع وخضوع سے پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے یعنی کہ نماز کے دوران توجہ مالک حقیقی کی جانب رہنی چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وہ ایمان والے یقیناً فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں (المؤمنون: 2-1) نفسیات کی زبان میں خضوع وخشوع کو ذہنی یکسوئی یا (single mindedness) کا نام دیا جاتا ہے۔ ذہنی یکسوئی کے ذہنی اور جسمانی فوائد پر جدید سائنسی آلات کی مدد سے تجربات کئے گئے۔ ایسے ہی ایک تجربے کے دوران نماز کا خود اختیاری اعصابی نظام پر اثرات کا تجزیہ کیا گیا۔ خود اختیاری نظام، ہمدردانہ اور غیر ہمدردانہ اعصابی نظام پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہمدردانہ نظام انسان کو ہنگامی حالات سے نپٹنے کی صلاحیت دیتا ہے۔ جبکہ غیر ہمدردانہ نظام حالت سکون کا موجب بنتا ہے۔ اس تجربے میں تیس مسلمان مردوں نے شرکت کی۔ یہ تجربہ تین نشستوں پر مشتمل تھا۔ پہلی نشست میں شرکاء کو سیدھا لیٹ کر آرام کرنے کی تاکید کی گئی۔ اس حالت میں ان کی ای-سی-جی اور ای-ای-جی (Electroencephalography) ریکارڈ کی گئیں۔ ای-سی-جی میں دل کی حرکات، جبکہ ای-ای-جی میں دماغ کی برقی لہریں ریکارڈ کی جاتی ہیں۔ دوسری نشست میں شرکاء نے نماز پڑھی۔ اس دوران دوبارہ ان کی ای-سی-جی اور ای-ای-جی نوٹ کی گئی۔ ان رپورٹس نے ثابت کیا کہ نماز کے دوران ہمدردانہ نظام غیر فعال اور غیر ہمدردانہ نظام فعال ہو جاتا ہے۔ اس طرح نمازی کے خود اختیاری اور مرکزی اعصابی نظام میں ربط پیدا ہو جاتا ہے اور وہ حالت سکون میں چلا جاتا ہے۔ اس تجربے سے ثابت کیا گیا کہ باقاعدہ نماز پڑھنے والے افراد کے اضطراب میں بتدریج کمی واقع ہوتی رہتی ہے[(viii)]۔

انسانی جسم میں سب سے اہم سر کی پوزیشن ہوتی ہے۔ اگر سر قدرے سیدھا رکھ کر چلنے کی عادت ہو تو اس سے متعلق تمام اعضاء میں بہتری پیدا ہوتی ہے۔ نظر تیز ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں سر کو دائیں بائیں حرکت دینے سے گردن کے پٹھے حرکت میں آتے ہیں۔ عام حالات میں انسان سامنے دیکھتا ہے اور سر کو دائیں بائیں حرکت نہیں دیتا لیکن اس حرکت کی وجہ سے انسان کے اندر خوشی اور آزادی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اہل سنت حضرات سر کو دائیں بائیں حرکت دے کر آخری سلام ادا کرتے ہیں۔ جبکہ اہل تشیع حضرات تین مرتبہ تکبیر کہہ کر آخری سلام ادا کرتے ہیں۔ لیکن کچھ ممالک میں اہل تشیع بھی سر کو دائیں بائیں حرکت دے کر آخری سلام ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بازو چاہے کسی بھی زاویے پر حرکت کریں کندھوں کے پٹھے حرکت میں آجاتے ہیں۔ کہنی کا تعلق کندھے کے پٹھوں سے ہوتا ہے۔ اگر کہنی حرکت میں رہے تو کندھے مضبوط ہوجاتے ہیں اور انسان زیادہ سخت کام کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ چلتے ہوئے گھٹنے کی سیدھی حرکت تیز اور باوقار چال کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ پٹھوں کا توازن نہ صرف اندرونی نظام ترسیل کو بحال کرتا ہے بلکہ جسمانی طاقت کا باعث بھی بنتا ہے۔ جس شخص کے پٹھے مضبوط اور متوازن ہوں وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ کام کرسکتا ہے اور اس کے پاس ترقی کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پٹھوں کا توازن بیرونی طور پر خوبصورتی اور شان کا باعث بنتا ہے اور جذباتی طور پر اطمینان اور سویز رٹی دیتا ہے۔ نمازی تکبیر کے دوران ہاتھ کانوں تک بلند کرتا ہے، اس طرح بازو، کہنیاں اور کندھوں کے پٹھے حرکت میں آتے ہیں۔ یوں چار رکعات نماز میں بارہ سے پندرہ مرتبہ ایک نمازی کی کہنی اور بازو کے جوڑ اور پٹھے حرکت کرتے ہیں۔ حالت سجدہ میں نمازی کا سر دل سے نیچے چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے دماغ کی جانب دوران خون بڑھ جاتا ہے۔ خون کی فراوانی کی وجہ سے غذا اور آکسیجن کی وافر مقدار دماغ تک پہنچتی ہے۔ نتیجتاً نمازی کی یادداشت، قوت ادراک، ارتکاز اور حتیٰ کہ قوت بینائی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

مغربی ماہرین کے مطابق عمر کے ایک حصے میں پہنچ کر انسان اپنا جسمانی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ اسے نہ صرف حرکات وسکنات میں مشکل پیش آتی ہے بلکہ اندرونی اعضا بھی متاثر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار توازن کا مسئلہ انسان کو مکمل طور پر مفلوج بھی کردیتا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں

جسمانی توازن برقرار رکھنے کے لئے اوائل شباب سے ہی باقاعدہ مشقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہم نماز کی حرکات وسکنات پر غور کریں تو تمام ارکان نماز توازن کی مثال پیش کرتے ہیں۔ مثلاً قیام کے دوران سیدھے کھڑا ہونا۔ ہاتھ، پاؤں کا متوازن مقام پر ہونا۔ سر سیدھا ہونا اور نگاہ کا جائے سجدہ پر مرکوز ہونا۔ تکبیر کے دوران دونوں ہاتھوں کا یکساں اٹھنا اور یکساں مقام پر جا کر رک جانا اور ایک ہی وقت میں نیچے آنا۔ رکوع اور سجود کی حالت میں تمام اعضا کا متوازن رہنا وغیرہ۔ باقاعدگی سے نماز ادا کرنے کی وجہ سے جسمانی توازن برقرار اور اندرونی مائعات کے بہاؤ کا نظام بھی فعال رہتا ہے۔ اس طرح نہ صرف غذائی اجزا بلکہ ہارمونز اور اعصابی پیغامات کی ترسیل بھی احسن طریق سے ہوتی ہے۔ پٹھوں کے توازن کی وجہ سے اندرونی مائعات اپنے صحیح مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔ متوازن مائعات دل کے افعال میں بہتری لاتے ہیں۔ جس طرح کسی بھی معاشرے کی اکانومی کو تقویت پہنچانے کے لئے ایک فعال نظام آمدورفت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح انسانی جسم کے مائعات اور دوسرے پیغامات اندرونی آمدورفت کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا آج کے تیز رفتار معاشرے کا مقابلہ کرنے کے لئے متوازن جسم کا ہونا بہت ضروری ہے[xix]۔

نماز کا کشش ثقل کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔ انسانی جسم اور کشش ثقل دونوں طاقت کے میدان (energy fields) ہیں۔ صحت کے لئے جسمانی توازن برقرار رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر توازن بگڑ جائے تو جسمانی اور اعصابی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ توازن کا حقیقی معنی تو یہ ہے کہ ایک انسان کا کشش ثقل کے ساتھ کیا رابطہ ہے؟ کشش ثقل کا حد غایت اثر 90° کے زاویئے پر ہوتا ہے۔ قیام کے دوران نمازی کی جسمانی پوزیشن اس عمودی لکیر کے قریب تر آجاتی ہے۔ اس طرح وہ کشش ثقل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ سیدھا کھڑا ہونے سے اندرونی مائعات کا بہاؤ بہتر ہوجاتا ہے۔ آج کل سیل فون کے زائد استعمال کی وجہ سے نوجوانوں کو کندھے جھکانے کی عادت ہوگئی ہے۔ یہ وضع مختلف بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔ باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی وجہ سے ایسی بگڑی ہوئی وضع کو درست کیا جاسکتا ہے۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ بعض انسانوں میں کولہے کی ایک ہڈی اونچی اور دوسری نیچی ہوجاتی ہے۔ اگر کولہے کی ہڈی اپنی جگہ سے ہل جائے تو ریڑھ کی ہڈی کے آخری پانچ مہرے بھی ہل جاتے ہیں۔ ان مہروں کو اردو میں عظم عجز

اور انگریزی زبان میں (sacrum) کہا جاتا ہے۔ فیلڈن کریس کے مطابق اگر عظم عجز اپنے مقام سے سرک جائے تو دائمی خوف، غم یا غصہ کے شدید جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ فیلڈن کریس اسرائیلی تھراپسٹ تھا جس نے بیسویں صدی میں انسانی بدن اور دماغ میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ورزشوں کا ایک نظام قائم کیا۔ دوسری جانب نماز کے دوران انسانی جسم کے تمام عضلات، پٹھے اور جوڑ حرکت میں آجاتے ہیں۔ باقاعدگی سے نماز ادا کرنے کی وجہ سے عظم عجم تمام عمر اپنے مقام پر قائم رہتی ہے۔

علاوہ ازیں قیام کی حالت میں نمازی کشش ثقل سے عمودی لکیر پر کھڑا ہوتا ہے اور اس کی غیر مرئی قوتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ تکبیر میں کہنیوں کے جوڑ مکمل طور پر مڑتے ہیں۔ رکوع میں کولہے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی نوے درجے کا زاویہ بناتی ہیں۔ جبکہ قعود میں معاملہ اس کے الٹ ہوجاتا ہے۔ یعنی کہ کولہے کی ہڈی افقی جبکہ ریڑھ کی ہڈی عمودی حالت میں آجاتی ہے۔ ران پنڈلی کے اوپر آجاتی ہے جس کی وجہ سے گھٹنے کے جوڑ مکمل طور پر مڑ جاتے ہیں۔ انسانی جسم سے فالتو اور زہریلے مادوں کے مکمل اخراج کے لئے جوڑوں میں لچک اور ان کا مکمل مڑنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر جسمانی جوڑوں کی لچک ختم ہوجائے تو کئی اقسام کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ دوزانو بیٹھنا نہ صرف مکمل تابعداری کی نشانی ہے بلکہ بہترین جسمانی توازن کی مثال بھی ہے۔ آلتی پالتی میں توازن قائم کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے مقابلے میں تقریباً ہر شخص معمولی سی مشق کے بعد دوزانو بیٹھ سکتا ہے۔ یہاں پر ایک اور پہلو پر بھی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ حالت نماز میں نمازی کا ہر جوڑ قدرتی رخ پر مڑتا ہے[xx]۔ اس کے برعکس یوگا میں جسم کو غیر قدرتی رخ پر موڑا جاتا ہے۔

نماز کا ایک تعلق برقی مقناطیسی شعاعوں سے بھی ہے۔ انسانی جسم ہر وقت زیریں سرخ، ریڈیو لہریں اور دوسری غیر مرئی شعاعیں خارج کرتا رہتا ہے۔ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف سٹینڈرڈ اینڈ ٹیکنالوجی یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف کامرس کے مطابق اگر انسان کو زیریں سرخ شعاعوں کے سامنے کھڑا کیا جائے تو وہ کسی ستارے کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے لیکن شعاعوں کا اخراج ہر وقت اور ہر قسم کے موڈ میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ ان لہروں کی اقسام اور ان کا تعدد بدلتا رہتا ہے۔ جس وقت انسان کی سوچ منفی ہوتی ہے تو اس کے جسم سے خارج ہونے والی تھرمل تابکاری کا تعدد زیادہ

ہوجاتا ہے۔تعدد کے ساتھ شعاعوں کی گرمی بھی بڑھ جاتی ہے۔اس کے برعکس جب انسان کی سوچ مثبت ہوتی ہے توان شعاعوں کا تعدد کم ہوجاتا ہیاوروہ نسبتاً ٹھنڈی شعاعیں خارج کرتا ہے۔ نماز کے دوران شعاعیں ٹھنڈی اور پرسکون ہوتی ہیں۔فروکی نماز کے دوران نمازی ٹھنڈی شعاعیں جذب کرتا ہے۔ظہراورعصر کے دوران یہی ٹھنڈی شعاعیں زمین میں منتقل ہوتی ہیں۔ لہٰذا جب دوسرے ماحولیاتی ذرائع سے زمین پرخطرناک حدتک گرم شعاعیں پڑرہی ہوتی ہیں اس وقت نمازی کرہ ارض کوٹھنڈ پہنچانے کاباعث بنتا ہے۔نماز کے دوران جب مومن سیدھا کھڑا ہوتا ہےتو مثبت شعاعوں کوجذب کرتا ہے۔جب تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہےتو نمازی کے ہاتھ مفید شعاعوں کوجذب کرتے ہیں۔سجدے کے دوران جب وہ اپنا سراور ہاتھ زمین پر رکھتا ہےتو اس کے ہاتھوں کی شعاعیں زمین میں منتقل ہوجاتی ہیں اورزمین اپنے اضطراب سے قرار پاتی ہے۔اس طرح سے مؤمنین نماز کے دوران چھوٹے چھوٹے راڈار بن جاتے ہیں۔نماز باجماعت کے بےشمارفوائد ہیں۔لیکن ایک فائدہ ماحولیاتی بھی ہے۔یعنی جب نمازیوں کی ایک کثیر تعداد مل کرنماز ادا کرتی ہےتوان کے جسم سے خارج ہونے والی مفید لہروں کا اجتماعی اثر زمین پر پڑتا ہے۔اسی طرح جب کرہ ارض پر پھیلے ہوئے لاکھوں نمازی نماز ادا کرتے ہیں تو تابکاری کی زدمیں آئی مضطرب زمین کوقرار آجاتا ہے۔شیطان کے نماز سے حسد کرنے کی بیشمار وجوہات ہیں لیکن ان میں ایک اہم وجہ شاید زمین کا قرار پانا بھی ہو۔وہ نہ صرف حضرت انسان بلکہ اس کرہ ارض سے بھی خار رکھتا ہےجس نے انسان کواپنی گود میں پناہ دی ہوئی ہے۔البتہ وہ جتنا ارض کونقصان پہنچانا چاہتا ہےاذان کی مسلسل صدائیں اورکرہ ارض پرنمازیوں کے اذکاراورارکان نماز اتنا ہی اسے دوام بخشتے ہیں۔

پانچ نمازوں کے علاوہ نماز شب کی بھی اپنی اہمیت ہے۔حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ پیغمبروں کا آخرروز نمازشب سے ہوتا ہے(حیات القلوب)۔اس کے علاوہ ائمہ کرام اورمراجع دین نے ہمیشہ نمازشب کاخصوصی اہتمام کیا۔امام خمینیؒ نے اپنے آخری لمحات میں بھی نفل شب ادا کئے۔(المزمل:73)کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دن کوکام اوررات کوآرام کے لیے بنایا۔انسان کی اندرونی گھڑی اس آفاقی گھڑی کے ساتھ منسلک ہوتی ہے۔اسی لئے نیند کی سب سے سودمند قسم

رات کی نیند ہے جب انسان کی اندرونی گھڑی آرام کا الارم بجا دیتی ہے۔رات کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے اندرونی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور انسان کئی ایک ذہنی اور جسمانی عارضوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔قرآن پاک اول شب میں سونے اور آدھی رات کو جاگ کر نماز شب کا مشورہ دیتا ہے (السجدہ: 15-16)۔نماز شب کے روحانی فوائد تو بیشمار ہیں لیکن جسمانی فوائد بھی کچھ کم نہیں۔مثال کے طور پر انسانی جسم میں نظام تحول (میٹابولزم) بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔نظام تحول کے دو حصے ہیں۔تعمیری تحول (اینابولزم) اور فرودی تحول (کیٹابولزم)۔تعمیری تحول میں ہماری خوراک چھوٹے ذروں میں تبدیل ہو کر خون میں شامل ہو جاتی ہے اور جسمانی طاقت کا سبب بنتی ہے۔فرودی تحول کے دوران فالتو مادے خوراک سے الگ ہو کر اخراج کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔کچھ مادے تو غیر ارادی طور پر خارج ہوتے ہیں جیسے پسینہ وغیرہ اور کچھ ارادی طور پر اخراج کے محتاج ہوتے ہیں۔اگر انسان اولین شب میں سو جائے تو نصف شب تک تحول کا عمل پورا ہو جاتا ہے۔اگر اس وقت انسان نیند سے بیدار ہو کر احتیاج ضروریہ سے فارغ ہو جائے تو فالتو مادوں کا بروقت اخراج ہو جاتا ہے۔یوں انسانی بدن غیر ضروری زہریلے مادوں سے بروقت نجات حاصل کر لیتا ہے۔فالتو مادوں کے اخراج کو آسان بنانے کے لئے قدرت نے انہیں مائعات میں ملا دیا ہے۔اگر یہ مادے مناسب وقت پر خارج نہ ہوں تو ان کے مائعات دوبارہ سے انسانی جسم میں جذب ہو جاتے ہیں اور فربہی کا باعث بنتے ہیں۔مزید یہ کہ فضلات سخت ہو جاتے ہیں اور قبض کا باعث بنتے ہیں۔قبض کئی ایک دیگر امراض کا باعث بنتا ہے اسی لئے اسے ام الامراض کہا گیا ہے۔

نماز کا ایک بڑا فائدہ روزانہ کے تھکا دینے والے معمول سے وقفہ بھی ہے۔آج کے تیز رفتار دور میں ہر انسان کو وقفے کی اشد ضرورت ہے یعنی ایک ایسا وقت جب اس کا تھکا ہوا دماغ ہر جھمیلے سے فراغت پا کر آرام کر سکے۔نیند میں بھی ہمیں ایسا وقفہ نصیب نہیں ہوتا کیونکہ ہمارا تحت الشعور کسی نہ کسی منصوبہ بندی میں مشغول رہتا ہے۔نماز اور دوسری عبادات اسی وقفے کا نام ہیں۔وقفہ تزکیہ نفس کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم اپنے اعصاب کو مختصر وقفہ بھی دیں تو ادراک کی راہیں کھل جاتی ہیں اور بتدریج الجھے معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

انسانی زندگی میں وقفہ بہت ضروری ہے تاکہ ہر وقت کی افراتفری سے الگ ہو کر اپنے حالات کا تجزیہ کرے۔ تجزیہ کی غیر موجودگی میں انسانی کاوشیں کولہو کے بیل کی طرح ہو کر رہ جاتی ہیں جو آنکھوں پر پٹی باندھے گول چکر میں گھومتا رہتا ہے۔

جس وقفے پر ہم نے اب تک بحث کی وہ دنیاوی امور سے وقفہ ہے۔ ایسا وقفہ جس میں انسانی روح معمول کے کاموں سے قرار پا کر اپنے حالات کا تجزیہ کر سکے۔ لیکن وقفے کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ ہے برے کاموں سے وقفہ۔ مثلاً ایک شخص نماز کا عادی ہے لیکن اس کے ساتھ کسی اخلاقی علت کا بھی شکار ہے تو کم از کم نماز کے دوران وہ اس برے کام سے وقفہ کرے گا۔ پہلی بات تو یہ کہ وقفہ اس برے کام کا مزہ کرکرا کر دیتا ہے۔ دوسرا یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقفے کے دوران اسے آفاقی ہدایت حاصل ہو جائے اور وہ اپنی بری عادات کا تجزیہ کر کے ان سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے بجلی کا سرکٹ مسلسل چلتا ہے۔ لیکن سوئچ آف کرنے کی وجہ سے اس کا سرکٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ نماز، روزہ اور حج برائی کا سرکٹ توڑنے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نظام کے ذریعے نفس امارہ کو لگام ڈال دی ہے۔ البتہ یاد رہے کہ شیطان اللہ تعالیٰ کے ہی قائم کردہ اصولوں میں الٹ پھیر کر کے اس کے بندوں کو بھٹکاتا ہے یعنی نماز باقاعدگی سے ادا کرنے سے نمازی ایک تار سے بندھ جاتا ہے اور وہ عبادت الٰہی سے لطف اندوز ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن شیطان کی کوشش ہوتی ہے کہ ایک آدھ نماز قضا یا مؤخر کروا کے اس تار کو توڑ دے اور بعض اوقات یہ ٹوٹا سرا جوڑنے کے لئے تردد اور مضبوط قوت ارادی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پاک پروردگار عالم نے ہمیں نماز، روزہ اور حج بیت اللہ کی صورت میں روزانہ، سالانہ اور زندگی میں ایک مرتبہ وقفے کا موقع عطا کیا تاکہ ہم اپنے ماضی پر نظر دوڑائیں اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل تیار کریں۔ روزہ خوراک اور دوسرے حرام حتیٰ کہ مکروہات سے بھی وقفے کا نام ہے۔ حج اپنے خاندان، عزیز و اقارب، اور طلب روزگار سے وقفے کا نام ہے۔

ایک لمحے کے لئے غور کیجئے کہ اگر نماز فرض نہ ہوتی تو کیا ہر مرد و زن اور چھوٹا بڑا باقاعدگی کے ساتھ روزانہ ایسی مشق کا عادی ہوتا؟ گو کہ نماز صرف اللہ کے حکم اور اس کی بندگی کے لئے ادا کی جاتی ہے لیکن اس اعلیٰ ترین عبادت کے جسمانی اور روحانی ثمرات سے بھلا کون انکار کر سکتا

ہے؟اس کے علاوہ نماز اوقات کے ساتھ فرض ہوئی یعنی کہ فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا، اس کے علاوہ نماز تہجد۔ یہ نہ صرف روزانہ کے معمولات کے لئے بنا بنایا ٹائم ٹیبل ہے بلکہ اوقات کے بدلنے کا الارم بھی بجاتا ہے۔ یہ وہ اوقات ہیں جب دو وقت گلے ملتے ہیں اور اس کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ جب نوری لہروں کہ ہیئت بدلتی ہے اور کرہ عرض پر ان کے اثرات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ جب خدا کے فرشتوں کی ڈیوٹیاں بدلتی ہیں اور زمین آسمان کے درمیان ان کی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ انہی اوقات کا ذکر قرآن کی مختلف آیات میں آیا ہے مثلاً سورۃ اللیل، سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الشّمس وغیرہ۔ اوقات کا بدلنا سائنسی تحقیق کے لحاظ سے ایک بڑا میدان ہے۔ مسلم نوجوانان بدلتے اوقات کے ساتھ سائنسی اور برقی مقناطیسی لہروں کی تبدیلی اور ان اوقات میں نماز ادا کرنے کی افادیت پر تحقیق کر سکتے ہیں۔ ایسی کاوشیں دین اور سائنس پر تحقیق کے بڑے میدان کا پیش خیمہ ثابت ہوں گی۔

اس حصے کے آخر میں ہم کچھ ذکر تسبیحات اور ذکر و اذکار کا کرتے ہیں۔ ہر نماز کے بعد تسبیح حضرت فاطمہؑ پڑھی جاتی ہے۔ بعض مراجع دین کے بیان کے مطابق اس کے اذکار یعنی کہ اللہ اکبر، الحمد للہ اور سبحان اللہ اسمائے اعظم میں شمار ہوتے ہیں۔ امام صادق ع کا قول ہے کہ ہم اپنے بچوں کو تسبیح حضرت فاطمہؑ اس طرح سکھاتے ہیں جیسے کہ نماز سکھاتے ہیں۔ قرآن پاک کے مطابق اور کوئی بھی شے ایسی نہیں جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو یہ اور بات ہے کہ تم اس کی تسبیح کو درک نہیں کرتے (الاسراء:44)۔ تسبیحات نہ صرف بے شمار روحانی صلاحیتوں کو ممیز کرتی ہیں بلکہ وقفے کا بھی ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ لیکن افسوس کہ آج کل کی مادیت پرستی کے زیر نظر اس بہترین عبادت کو بھی صرف دنیاوی خواہشات حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔

ہم یہاں مثال کے طور ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔ ایک عزیزہ بتایا کرتی تھیں کہ تعلیم کے حصول کے لئے ان کا کافی وقت گھر سے دور ہاسٹل میں گزرا۔ روزانہ عشاء کی نماز کے بعد وہ قدرے طویل تسبیحات کی عادی تھیں۔ وہ عادت انہوں نے اپنی والدہ سے لی تھی۔ دو مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کی ساتھی لڑکیوں نے پوچھا کہ تم جو وظائف کرتی ہو کس مقصد کے لئے کرتی ہو؟ وہ بتاتی تھیں کہ ایسی باتیں سن کر حیرت ہوتی کہ کیا نماز روزے کے علاوہ اضافی عبادت صرف دنیاوی

مقاصد کے لئے ہی کی جاتی ہے اور قرب الٰہی کے لئے نہیں؟ اس مقام پر پہنچ کر شاید میں اپنے موضوع سے کچھ بھٹک جاؤں۔ لیکن تحریر کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ روحانیت صرف کسی مادی مقصد کے حصول کا نام نہیں مثلاً بچی کے اچھے رشتے کے لئے، بیٹے کے روزگار کے لئے، اولاد کے لئے دعا کروالی جائے یا وظیفہ کرلیا جائے وغیرہ۔ یوں تو مثبت اور شرعی کاموں کے لئے دعا کرنے یا کروانے میں کوئی حرج نہیں لیکن روحانیت یہیں تک محدود نہیں۔ روحانیت کا اصل مقصد تو اپنے آپ سے آگاہی حاصل کرنا اور اس آگاہی کے ذریعے اپنے رب سے معرفت حاصل کرنا ہے۔

4.3۔ روزہ

روزہ قبل از اسلام بھی رائج تھا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ 'اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے پہلے ہوئے ہیں۔ تا کہ تم متقی بن جاؤ' (البقرہ)۔

موجودہ دور میں بھی مختلف ادیان کے پیروکار روزہ رکھتے ہیں لیکن فی زمانہ نماز کی طرح روزہ اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب میں فرض نہیں۔ بدھ مت روز اول سے روزے کا قائل تھا۔ 'مہا سیہا نادہ سوتر' (Mahasiha nada suttar) کے مطابق مہا آتما بدھا نے بودھی حاصل کرنے کے لئے چالیس دن کا روزہ رکھا۔ اس دوران وہ دن میں صرف ایک مرتبہ 'کولا' کا پھل تناول کرتے تھے یہاں تک کہ ان کا گوشت ختم ہوگیا اور صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں۔ کولا بیر کی ایک قسم ہے جس کی غذائی افادیت بہت کم ہے۔ چین میں بدھ مت کی تاریخ میں بار بار روزے پر پابندی لگائی گئی۔ غیر بدھ حکمرانوں کا خیال تھا کہ بدھ بھکشو روحانیت روزے کی وجہ سے حاصل کرتے ہیں اور اس روحانی طاقت کی وجہ سے حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات حکومتی فوجیں معبد خانوں کا رخ کرتیں اور اگر بھکشوؤں کو روزے کی حالت میں پاتیں تو تمام افراد کو قتل کردیتیں۔ موجودہ دور میں بدھ مت کے پیروکاروں میں دو طرح کے روزے رائج ہیں۔ پہلی قسم کو دھوتنگا (dhutanga) کہا جاتا ہے۔ دھوتنگا کا مطلب ہے جھنجھوڑنا یا جگانا۔ یہ روزہ بھکشو رکھتے ہیں۔ دوسری قسم کو چینی زبان میں زائی (zai) کہا جاتا ہے اس کا لفظی مطلب ہے

'سبزی خور'۔ اگر عوام میں سے کوئی روزہ رکھنا چاہے تو وہ چند مقررہ روز کے لئے گوشت کو اپنی خوراک سے حذف کر دیتا ہے۔ اس طرح نفس پر قابو حاصل ہوتا ہے۔

یہودی مذہب میں روزہ رکھنا ایک عظیم الشان عمل سمجھا جاتا ہے۔ توریت کی روایات کے مطابق حضرت موسیٰ ؑ نے طور پر اور حضرت الیاس ؑ نے حوریت نامی پہاڑ پر چالیس دن روزے رکھے۔ جبکہ حضرت دانیال نے تین ہفتے روزے رکھے۔ اس کے علاوہ یہودیوں کے لئے ساتویں مہینے کے دسویں دن روزہ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دن کو 'روز کفارہ' کہا گیا ہے۔ یہودی یہ دن عبادت گاہوں میں گزارتے ہیں۔ توریت پڑھتے ہیں اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ بائبل میں کئی مرتبہ روزے کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً ایکٹس 14، 23- لیوک 2، 37- میتھیو 6، 16 وغیرہ۔ میتھیو 4، 2 کے مطابق حضرت عیسیٰ ؑ نے ایک مرتبہ چالیس روز کا روزہ رکھا۔ لوتھر چرچ سے تعلق رکھنے والی شریک تحقیق ش 8 نے روزے کے بارے میں بتایا کہ "ہمارے سالانہ روزے چالیس دنوں کے ہوتے ہیں۔ روزے فروری، مارچ یا اپریل میں آتے ہیں۔ لوتھر چرچ کے روزے ہمیشہ بدھ سے شروع ہوتے ہیں۔ اتوار کے دن سبت کا روز ہوتا ہے اس لئے اس دن روزہ نہیں رکھا جاتا۔ البتہ کچھ عبادت گزار لوگ اتوار کے دن بھی روزہ رکھتے ہیں۔ ان چالیس روزوں کے علاوہ آپ سال کے دوران کبھی بھی روزہ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا کوئی بھی روزہ فرض نہیں ہوتا۔ روزہ کسی بھی مقصد کے لئے رکھا جا سکتا ہے مثلاً ایمان کی مضبوطی کے لئے، تقویٰ حاصل کرنے کے لئے، بیماری سے شفا کے لئے، کسی کام میں کامیابی کے لئے، دعا کی قبولیت کے لئے وغیرہ۔ روزہ ایک، تین، پانچ، سات، دس یا چالیس روز کا ہو سکتا ہے۔ دوسرے ادیان میں بھی یہ جفت اعداد اہم تصور کئے جاتے ہیں۔ روزہ رکھنے سے پہلے اس کی نیت باندھنا ضروری ہوتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ زیادہ تر روزے چوبیس گھنٹوں کے ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی اتنا لمبا روزہ نہ رکھ سکے تو وہ بارہ حتیٰ کہ چھ گھنٹے کا روزہ بھی رکھ سکتا ہے۔ میرے ابو کہتے تھے کہ روزے کی نیت ہونی چاہیے چاہے ایک گھنٹے کا روزہ ہی کیوں نہ ہو۔ روزہ کے اوقات بھی مختلف ہیں۔ زیادہ تر لوگ مغرب سے مغرب تک کا روزہ رکھتے ہیں۔ لیکن کچھ صبح سے صبح تک کا بھی رکھتے ہیں۔ روزے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم میں کچھ مخصوص اشیا سے پرہیز کیا جاتا ہے مثلاً

کچھ لوگ گوشت اور اس سے متعلق دوسری اشیا کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی پسندیدہ اشیا سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے روزے میں کھانے پینے کی مکمل پابندی ہوتی ہے۔''

دین اسلام میں روزے کا ذکر نماز کے ساتھ آتا ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ روزہ خدا کے لئے ہے اور اس کا اجر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ذمے ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ روزہ دار کا خواب عبادت ہے۔ حالت خواب میں اس کی روح اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ پیشہ ورانہ زندگی کے دوران ہمارے ساتھ دو مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سیکولر غیر ملکیوں نے رمضان کے پورے تیس روزے رکھے اور ان کی افادیت کا اظہار کیا۔ پہلی مرتبہ ہاسٹل میں رہنے والی ایک برٹش خاتون نے ہمارے ساتھ مل کر تیس روزے رکھے۔ وہ سحر اور افطار کے اوقات سے بہت خوش تھی اور کہتی تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی اتنی طمانیت محسوس نہیں کی جتنی روزے رکھنے سے کی۔ دوسری مرتبہ فیلڈ اسکول میں ایک امریکی جوان نے تیس روزے رکھے۔ وہ فجر کے وقت بیدار ہو جاتا۔ ہمارے ساتھ سحری کرتا اور منہ اندھیرے ہی اپنا کام شروع کر دیتا۔ سارا دن اپنے کام میں مصروف رہتا اور شام کو ہمارے ساتھ افطار کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کھانے پینے کے لئے بہترین روٹین ہے۔ سحری تمام دن کے کام کے لئے طاقت بخش ہوتی ہے۔ میں سارا دن اطمینان سے کام کرتا ہوں۔ اس دوران مجھے لنچ یا چائے کی طلب بھی نہیں ہوتی۔ نیند بھی نہیں آتی۔ اس طرح میرے کام کی رفتار دگنی ہوگئی ہے۔ سر شام کھانا کھانے سے رات کو بہترین نیند سوتا ہوں اور اگلے روز تر و تازہ دماغ کے ساتھ کام کا آغاز کرتا ہوں۔

4.4۔ تجلیات قرآن

مندرجہ بالا ابواب میں ہم نے تجلیات قرآن کے چند ایک واقعات ملاحظہ کئے۔ سچ تو ہے کہ قرآن اور خوبصورت آواز کا روز اول سے ساتھ رہا ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ 'ہر شے کی ایک زینت ہے اور قرآن کی زینت اچھی آواز ہے'۔ حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ 'گھر میں با آواز بلند قرآن پڑھنے سے اس کے اثرات تمام گھر والوں پر پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ جس گھر میں قرآن پڑھا جاتا ہے اور اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے وہاں خیر و برکت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس گھر میں

فرشتے آتے ہیں۔ آسمان والوں کو وہ گھر اس طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے جیسے زمین والوں کو ستارہ' (اصول الکافی: کتاب فضل القرآن)۔ اس کے علاوہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ 'حضرت داؤدؑ دشت و بیابان میں نکلتے اور جب زبور کی تلاوت کرتے تو کوئی پہاڑ، چرند، پرند ایسا نہ ہوتا جو ان کے ساتھ ہم آواز نہ ہوتا ہو' (حیات القلوب)۔ اس کے علاوہ امام جعفر صادقؑ سے یہ بھی منقول ہے کہ 'قرآن کی تلاوت ضرور کرو کیونکہ جتنی قرآن کی آیتیں ہیں اتنے ہی جنت کے درجے ہیں۔ قیامت کے دن قرآن پڑھنے والوں کو حکم ہوگا کہ پڑھتا جا اور ترقی کرتا جا۔ جب وہ ایک آیت پڑھے گا تو اس کا درجہ بلند ہو جائے گا' (اصول الکافی: کتاب فضل قرآن)۔ آیت اللہ العظمیٰ سید ابالقاسم خوئیؒ فلسفہ معجزہ میں حارث ہمدانی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ 'قرآن ایسی روشنی ہے جس کی قندیلیں گل نہیں ہوتیں، ایسا چراغ ہے جس کی لو ماند نہیں پڑتی، ایسا سمندر ہے جس کی تہہ کا پتا نہیں لگایا جا سکا، ایسی شعاع ہے جس کی چمک کم نہیں ہوتی، حق و باطل میں امتیاز کرنے والا ایسا معیار ہے کہ اس کے دلائل کمزور نہیں پڑتے، ایسی شفا ہے کہ پھر بیماری کا خطرہ نہیں رہتا، قرآن ایمان کا معدن اور مرکز ہے، اس سے علم کے چشمے پھوٹتے ہیں، قرآن اسلام کا سنگ بنیاد اور اس کی اساس ہے، قرآن ایسا نشان راہ ہے جو راہ گیر کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا، قرآن ایسی دوا ہے جس کے بعد کوئی درد باقی نہیں رہتا، قرآن رہنما ہے اس کے لئے جو سوچ بچار کرتا ہو' (نہج البلاغہ: یعلم عجیج الوحوش کے الفاظ سے شروع ہونے والا خطبہ)۔ قرآن پاک کو خضوع خشوع کے علاوہ تدبر اور تفکر کے ساتھ پڑھنے کا حکم ہے۔ صحابہ رسول ابو عبدالرحمن سلمی سے روایت ہے کہ 'جو صحابہ ہمیں قرآن پاک پڑھایا کرتے تھے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہؐ ہمیں ایک وقت میں دس آیات پڑھایا کرتے تھے اور اگلی دس آیات اس وقت تک تعلیم نہیں فرماتے تھے جب تک کہ ہم پہلی دس آیات کی علمی اور عملی تمام پہلوؤں سے واقفیت حاصل نہیں کر لیتے تھے' (بحار الانوار: جلد 19)۔ حضرت علیؑ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ سے سنا کہ 'عنقریب فتنے برپا ہوں گے۔ میں نے پوچھا: اس کا حل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: کتاب اللہ۔ اس میں تمہارا اگلا پچھلا حال ہے، تمہارے جھگڑوں کا فیصلہ ہے، جو ظالم اسے چھوڑ دے گا اللہ تعالیٰ اس کو پاش پاش کر دے گا، جو اسے چھوڑ کر کہیں اور ہدایت طلب کرے گا وہ گمراہ

ہو جائے گا، یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے اور صراط مستقیم ہے' (فلسفہ معجزہ)۔

4.5۔ حسد، غیبت، جھوٹ اور چوری کے برے اثرات

حسد، غیبت، بغض اور دیگر اخلاقی علتیں بنی نوع انسان کے ساتھ ہی اس دنیا میں معرض وجود میں آئیں۔ انسان کا حسد کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شیطان نے بنی نوع انسان کے ساتھ حسد کی وجہ سے اسے جنت سے نکلنے پر مجبور کیا۔ قابیل نے جذبہ رقابت اور حسد کی وجہ سے ہابیل کا قتل کیا۔ دنیا کے ہر مذہب میں حسد، غیبت اور بغض کی مذمت کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں جابجا ان علتوں سے بچنے کی تاکید کی گئی اور ان کے برے انجام سے انسان کو آگاہ کیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ 'جب مومن اپنے مومن بھائی پر بدگمانی کر کے تہمت لگاتا ہے تو ایمان اس کے دل میں اس طرح سے پگھل جاتا ہے جیسے کہ نمک پانی میں پگھلتا ہے' (الکافی 362:2) البتہ سب سے زیادہ چونکا دینے والی سورۃ الحجرات کی آیت 12 ہے۔ اس میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ 'تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی بھی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو تم نفرت کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو'۔

قرآنی تفسیر کی تاریخ میں یہ آیت حسد، غیبت اور سوئے ظن کے سلسلے میں باقی آیات سے زیادہ توجہ کا مرکز بنی۔ تاہم زیادہ تر مفسرین نے اس کے معاشرتی اور اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مثلاً یہ کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا انتہائی نفرت انگیز تصور ہے۔ یہ درندگی سے بھی بڑھ کر شقاوت اور سخت دلی کا احساس دلاتا ہے کیونکہ درندے بھی اپنے ہم جنس کا گوشت نہیں کھاتے۔ یا یہ کہ جس طرح ایک مردہ بھائی اپنا دفاع نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح سے جس کی پیٹھ پیچھے غیبت کی گئی ہو وہ اپنی ناموس کا دفاع نہیں کر سکتا (تفسیر الکوثر)۔ البتہ اس آیت کے جسمانی اور نفسیاتی پہلو بہت واضح ہیں۔ خصوصاً جب انسانی تاریخ میں آدم خوری کی روایت ہزاروں سال تک موجود رہی۔ ش 1 کا کہنا ہے کہ "ایک مرتبہ ایک پروفیسر صاحب نے سرسری سا تذکرہ کیا کہ

ماڈرن سائنسی تحقیقات کے مطابق آدم خور اور چغل خور ایک جیسی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اس مجلس میں مزید تفصیلات تو نہ پتا چل سکیں لیکن میرا ذہن اس سلسلے میں ہونے والی سائنسی تحقیق کی جانب چل پڑا اور آخر کار ایک دن میں 'کورو' نامی بیماری تک پہنچ گئی(xxi)۔ مندرجہ ذیل سطروں میں کورو بیماری کا مختصر بیان پیش کیا جائے گا۔

آسٹریلیا کے علاقے نیوگنی میں کچھ گاؤں فور کے نام سے مشہور ہیں۔ یہاں رہنے والے قبائل میں 1950ء کی دہائی تک تدفینی دعوت کا رواج عام تھا۔ ان لوگوں کے قدیم اعتقاد کے مطابق تدفین کی وجہ سے مرحومین کیڑوں مکوڑوں کی غذا بن جاتے ہیں۔ یہ امر ان کی بے عزتی کے مترادف ہے جبکہ عزیز و اقارب کا ان کا گوشت کھا لینا ان کی روح کو آزاد کرتا تھا اور دوسرے جہان میں ان کے گناہوں کی معافی کا سبب بنتا تھا۔ 1950 کی دہائی میں ڈاکٹر مائیکل ایلپر کا تبادلہ اس علاقے میں ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ قبائلی ایک خاص وبائی بیماری کی وجہ سے موت کا شکار ہوتے جا رہے تھے اور اس کی وجہ سے ان قبائل کی آبادی کم ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر ایلپر کی دلچسپی کی وجہ سے اس بیماری کی خبر ماڈرن حلقوں میں گردش کرنے لگی اور کیرلٹن گیجوسک نامی ڈاکٹر نے اس سلسلے میں باقاعدہ ریسرچ کرنے کی ٹھانی۔ بعدازاں ڈاکٹر گیجوسک کو اس کی کاوشوں کی وجہ سے نوبل پرائز دیا گیا۔ کورو کے جرثومے کی وجہ سے دماغی پروٹین کا ڈھانچا بدل جاتا تھا۔ کورو کی مندرجہ ذیل علامات تھیں:

- گاہے بگاہے بے ہنگم ہنسی: جب مریض کو ہنسی کا دورہ پڑتا تو وہ مسلسل ہنسنے کی وجہ سے بے حال ہو جاتا لیکن اس کی ہنسی رکتی نہ تھی۔ بعض اوقات اسی حالت میں مریض کی موت بھی واقع ہو جاتی۔

- مریض کے ہاتھوں، ٹانگوں اور پیروں میں واضح ریشہ: فور کی علاقائی زبان میں کورو کا مطلب کانپنا ہے۔ ریشہ کی وجہ سے مریض کی ٹانگیں اتنی کمزور ہو جاتیں کہ آخر کار وہ کھڑے رہنے کے قابل نہ رہتا اور موت کا شکار ہو جاتا۔

علامات ظاہر ہونے کے بعد مریض کے اعضاء کام کرنا چھوڑ دیتے اور ایک سال کے اندر اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔ ماہرین حیران تھے کہ بیماری پھیلانے والا جرثومہ نہ تو بیکٹیریا تھا اور

نہ ہی وائرس، نہ ہی کسی اور قسم کا طفیلیہ۔ کٹھن اور طویل تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بیماری مریض کے دماغ میں پائی جانے والی ایک خاص پروٹین کی ہیئت بدل جانے سے لاحق ہوتی ہے۔ اس پروٹین کو پرائن کا نام دیا گیا۔ پرائن دماغ میں پھیل کر صحت منداعصابی خلیات کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ مزید برآں وہ دماغ کو کھوکھلا اور اسپنج کی طرح سوراخ دار کر دیتی ہے۔ 1960ء کی دہائی میں مشنریوں اور حکومتی اداروں کی کاوشوں سے قبائیلوں نے تدفینی دعوت کو ترک کر دیا لیکن کورو کے جرثومے 10 سے لے کر 50 سال تک انسانی جسم میں چھپے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے 2009ء میں ان قبائل میں کورو کا آخری مریض رپورٹ کیا گیا۔

کورو کے مرض نے عوامی میڈیا اور لٹریچر کو بھی متاثر کیا۔ مثال کے طور پر (The Book of Eli) میں کانپتے ہاتھوں کو آدم خوری سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بک آف ایلی 2010ء ریلیز ہونے والی ایک مشہور امریکی فلم ہے۔ اس فلم میں ایک جوڑا دکھایا گیا ہے جو نیوکلیائی جنگ کی تباہ کاریوں سے بچ جاتا ہے۔ وہ جوڑا تباہ شدہ دنیا میں گھومتا پھرتا ہے۔ ایک آدم خور جوڑے سے ملتا ہے اور کانپتے ہاتھوں کی وجہ سے ان کی اصلیت پہچان جاتا ہے۔ لہٰذا اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ Miroslav Holub Czeh نے اسے مسکراتی موت سنڈروم کا نام دیا۔ ہولب بیسویں صدی کا چیکوسلوا کی شاعر تھا۔ اس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد رائج کمیونسٹ معاشرے میں پرورش پائی۔ اس کی شاعری معاشرے کی ناہمواریوں کے خلاف گہرے طنز کی مظہر ہے۔ اس کی مذکورہ بالا نظم 'کورو یا مسکراتی موت' اس کے مشہور مجموعے 'پھیپھڑوں کے سنڈروم' (The Lung Syndrome) میں شامل ہے۔ اس نظم میں وہ اپنے ہم وطنوں کی بے حسی اور خاموشی کے متعلق کہتا ہے کہ

''ہم نیوگنی کے فور تو نہیں
ہم روایتی آدم خور تو نہیں
ہمارے اندر کوئی ایسا وائرس تو نہیں
جو ہمارا دماغ یا ریڑھ کی ہڈی کو کھوکھلا کر دے
یا ہمارے اعضاء میں ریشہ پیدا کر دے

یا ڈائمنشیا میں مبتلا ہو کر ہم مخصوص مسکراہٹ کا شکار ہو جائیں
ہم تو بس شرمندہ ہوتے ہیں، مسکراتے ہیں
شرمندہ ہوتے ہیں، مسکراتے ہیں۔ (xxii)

اس کے علاوہ کمپیوٹر گیم (Dead Island) میں ذومبی (انسان کو کھانے والی بلائیں) کورو کے جرثومے سے تشکیل پاتی تھیں۔

کورو کی علامات موجودہ دور کی عام بیماریوں بائی پولرڈس آرڈر اور ڈیمینشیا سے قریبی مماثلت رکھتی ہیں۔ اعصابی نفسیات کے ماہرین کے مطابق حسد اور غیبت جنون کا باعث بنتا ہے۔ حسد، غیبت، جنون اور کورو کی بیماریوں میں انسانی دماغ کا فرنٹل لوب متاثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دماغی پروٹین کی ہیئت بدل جاتی ہے جو درد موت کا باعث بنتی ہے۔ عصبی نفسیات کے مطابق حسد کے شدید جذبات غیبت کا باعث بنتے ہیں۔ حسد اور غیبت مل کر انسانوں میں ڈیپریشن، جنون، اور ڈائمنشیا کا باعث بنتے ہیں۔ فی زمانہ جنون کی سب سے عام قسم بائی پولرڈس آرڈر ہے۔ اس بیماری کے شکار افراد کا موڈ پنڈولم کی طرح ایک انتہا سے دوسری انتہا تک جھولتا رہتا ہے۔ وہ معمولی سے محرک کی وجہ سے ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں یا بے محل مذاق پر اتر آتے ہیں۔ ان کی ہنسی بے ہنگم ہوتی ہے۔ ان کے ہاتھ کانپتے ہیں۔ اگر بروقت علاج نہ کیا جائے تو بائی پولرڈس آرڈر شیزوفرینیا میں بدل جاتا ہے۔ اسی طرح ڈائمنشیا بھولنے کی بیماری ہے جو علاج نہ ہونے کی وجہ سے الزائمر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ الزائمر ایک تکلیف دہ بیماری ہے جو انسان کو بتدریج کرب ناک موت کی جانب لے جاتی ہے۔ الزائمر کے مریض کے دماغ میں پلیک (تختی نما) الجھے ہوئے (ٹیلنگنڈ) پروٹین کے ٹکڑے پائے جاتے ہیں۔ یہ ٹکڑے دیگر اعصابی خلیوں کے درمیان خصوصاً فرنٹل لوب یعنی کہ یادداشت سے متعلق حصوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی نمو کی وجہ سے اعصابی خلیے کم ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ مریض کو موت تک پہنچا دیتے ہیں۔ (xxiii)

بیسویں صدی کی اندھا دھند مادیت پرستی نے ہر میدان زندگی میں مقابلے کی دوڑ اور

خودغرضی کو جنم دیا۔ معاشرے کی رفتار کچھ اس تیزی سے بڑھی کہ زندہ رہنے کیلئے انسانوں کو ایک دوسرے کو پچھاڑنا پڑا۔ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا، چغل خوری، غیبت، حسد اور بغض جیسی نفسیاتی علتیں عام ہو گئیں۔ رشتوں کا احترام کم سے کم تر ہوتا چلا گیا۔ عدم اعتماد بڑھا تو انسان مختلف النوع نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوتا گیا۔ ان لاتعداد بیماریوں میں سے دو کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی کہ بائی پولرڈس آرڈر اور ڈیمینشیا۔ گو کہ ان بیماریوں کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں لیکن ان کا ایک واضح تعلق دور حاضر کی اخلاقی علتوں مثلاً غیبت اور حسد سے بھی ہے۔ ولیم شیکسپیر نے اپنے ڈرامے (Othello) میں لفظ حاسد کی بجائے 'سبز آنکھوں والا دیو' استعمال کیا۔ (Othello) ایسے لوگوں کی کہانی ہے جو حسد کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔ اس کہانی میں انتہا کو پہنچا ہوا حسد محبت، اعتماد، حتیٰ کہ طاقت کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ مزید یہ کہ حسد کی وجہ سے ان کے جگر کے افعال تباہ ہو گئے۔ بعض تبصرہ نگاروں کے مطابق قدیم یونانی دیومالائی داستانوں میں حسد کو سبز رنگ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ تاہم دیگر ناقدین کا خیال ہے کہ وہ استعارہ شیکسپیئر کے اپنے ذہن کی پیداوار تھا۔ اس کے پیچھے یہ عقیدہ کارفرما تھا کہ حسد کی وجہ سے جگر اور اس کے معاون اجزا ضرورت سے زیادہ فعال ہو جاتے ہیں اور زائد رطوبتوں کے اخراج کی وجہ سے جلد اور آنکھیں ہلکے سبز رنگ کی ہو جاتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان جگر کے زور پر زندہ رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں حسد اور غیبت کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ حضوؐر نے فرمایا کہ 'غیبت کی بخشش نہیں ہے جب تک کہ وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی غیبت کی گئی ہو' (الوسائل الشیعہ 280:12) اس کے علاوہ حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ جس شے کے بارے میں مکمل معلومات نہ ہوں اس کے بارے میں بات نہ کرو اور اگر جانتے بھی ہو تو بہتان، الزام تراشی اور تہمت سے احتراز کرو بالکل ایسے جیسے تم اپنے بارے میں ایسی چیزوں کو ناپسند کرتے ہو۔ مراجع اسلام اور فقہاء نے غیبت سے بچنے کے بہت سے طریقے تعلیم کئے ہیں۔ جن میں سب سے اہم کم گوئی اور اس کے بعد لغو گوئی سے بچنا ہے۔ پھر یہ کہ جب کوئی غیبت کرے تو اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے بلکہ اسے نظر انداز کیا جائے۔ البتہ اس سلسلے میں مجھے ایک مزاحیہ واقعہ یاد آ گیا۔ ایک عزیزہ نے بتایا کہ ایک مرتبہ حوزہ میں طلباء نے عہد کیا کہ

غیبت نہ کریں گے اور اگر یہ گناہ سرزد ہو جائے تو ایک دینار جرمانے کے طور پر ادا کریں گے۔ ایک روز وہ سب صحن حرم میں بیٹھے تھے تو ان میں سے ایک نے دینار نکال کر سب کے سامنے ڈال دیا۔ اس کے ساتھیوں نے جب اسے سوالیہ انداز میں دیکھا تو کہنے لگا کہ معافی چاہتا ہوں لیکن وہ دیکھو سامنے سے جو مولانا صاحب آ رہے ہیں کتنے مضحکہ خیز نظر آ رہے ہیں۔ ان کا عمامہ کچھ زیادہ بڑا نہیں ہو گیا؟

یہ قصہ تو ازراہ مزاح بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اگر غیبت یا کوئی بھی گناہ سرزد ہونے کے فوراً بعد ہم اپنے اوپر جرمانہ عائد کریں یا صرف اپنے نفس کو سرزنش ہی کر لیں تو یہ طفل ناداں ہمارے قبضے میں آ جائے گا۔ عین ممکن ہے کہ اس طرح ہماری اخلاقی علتوں کی شدت میں کمی آ جائے۔ غیبت چھوڑنے کا ایک اور مجرد طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم عہد کر لیں کہ ایک ہفتے تک زبان کو غیبت کرنے اور کانوں کو غیبت سننے سے روکے رکھیں گے۔ اگر علت پرانی ہو گئی ہو اور اس وقفے کے بعد بھی طبیعت غیبت کی جانب مائل رہے تو بتدریج وقفہ بڑھاتے جائیں یہاں تک کہ گوہر مقصود کو پا لیں۔ اسی سلسلے میں آیت اللہ ملا محمد باقر مجلسی کا ایک خوبصورت واقعہ صرف نظر ہے۔

وہ ایک مرتبہ ایک شخص کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ فلاں فقیہ کربلا شراب کو پاک تصور کرتا ہے۔ آپ نے کہا کہ وہ غلط کہتا ہے۔ اس کے بعد آپ اٹھے اور کربلا کے لئے روانہ ہو گئے۔ سیدھے اس کے گھر گئے اور کہا کہ مجھے معاف کر دو میں نے تمہاری غیبت کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ شراب کو پاک سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے لوگ شراب سے احتراز نہیں برتتے۔ جب اس مراجع نے کہا کہ میں نے آپ کو معاف کر دیا تو امام حسینؑ کی زیارت کے لئے گئے (مقدمہ حیات القلوب)۔ اگر غور کیا جائے تو آیت اللہ نے نہ تو غیبت کی تھی، نہ ہی ہتک آمیز الفاظ استعمال کئے تھے۔ لیکن چونکہ گفتگو کے دوران ایک ہم عصر کا ذکر آ گیا تھا اس لئے اس سے معافی مانگنی ضروری سمجھی۔

حسد کا غیبت اور جھوٹ کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جھوٹ معاشرے کو بے سکونی اور رزق کی تنگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جھوٹ کا تعلق خوف اور جرم کے ساتھ منسلک ہے۔ جھوٹ کی تعریف کچھ یوں کی جاتی ہے کہ کسی بھی طرح کے حقائق کو بڑھا چڑھا کر یا توڑ موڑ کر بیان کرنا لیکن

اعصابی نفسیات کی تعریف اس سے بڑھ کر ہے۔ اگر کوئی شخص منہ سے کچھ نہ بولے لیکن اس شخص کے غیر لفظی رویے کی وجہ سے لوگ سچ کو جھوٹ سمجھنے لگیں تو اسے ''تمارض'' کہا جاتا ہے۔ تمارض کی علامات نامیاتی عارضوں کے بہت قریب ہوتی ہیں۔ ایک جھوٹا شخص اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لئے چہرے کے تاثرات بدل لیتا ہے لیکن مکمل طور پر اپنے جسمانی رویئے کو چھپانا ممکن نہیں ہوتا۔ ڈارون نے 1872ء میں لکھا کہ جب کوئی شخص اپنے اوپر جھوٹی کیفیت طاری کرتا ہے تو وہ اصلی کی طرح نہیں ہوتی اور مہین جذباتی ذرے اس کی اصلی کیفیت کو واضح کر دیتے ہیں۔ مہین جذباتی ذروں سے مراد ایک ایسی کیفیت ہے جس میں حقیقی جذبات ایک سیکنڈ کے پانچویں حصے سے لے کر پچیسویں حصے تک چہرے سے چھلک پڑتے ہیں۔ اعصابی نفسیات کی زبان میں اسے جذبات کے رسنے کا نام بھی دیا گیا ہے۔

عصبی نفسیات کے مطابق جھوٹ کا تعلق دماغ کے ادراکی افعال سے ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنے والے انسان کے دماغ کا سامنے والے حصے کو (frontal lobe) معمول سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے مثلاً سچ اور اپنے حقیقی جذبات کو چھپانے کی کوشش اور کوئی جھوٹی کہانی گھڑنا وغیرہ۔ (frontal lobe) کا تعلق رکاوٹ، نگرانی، قوت فیصلہ اور جذبات پر قابو پانے سے ہوتا ہے۔ رکاوٹ ایک ایسا قدرتی عمل ہے جس کی وجہ سے ہم صحیح اور غلط کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ یہ حصہ انسان کے اندر ناپسندیدہ افعال سے رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور اسے معاشرے میں رہنے کے قابل بناتا ہے۔ زیادہ شراب نوشی کی وجہ سے بھی رکاوٹ کا عمل رک جاتا ہے۔ قرآن پاک میں جھوٹ کی کثرت سے مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یھدِی مَنۡ ھُوَ۔

ترجمہ: بے شک اللہ اس شخص کی ہدایت نہیں کرتا جو جھوٹا اور ناشکرا ہو (الزمر: 3)۔

اسی طرح سے سورہ صف میں ارشاد ہوتا ہے کہ 'اے ایمان والو! اسے کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک بڑی ناپسندیدہ بات ہے کہ جو کہو اس کو نہ کرو'۔ حضورؐ کا قول ہے کہ 'خدا کے نزدیک بہت بڑی خطا کار ہر وقت جھوٹ بولنے والے کی زبان ہے' (کنز العمال)۔ یا یہ کہ 'جھوٹ سے پرہیز کرو کیونکہ یہ فسق و فجور تک لے جاتا ہے اور یہ دونوں جہنم میں لے جاتے

ہیں' (تنبیہ الخواطر)۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ 'سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے' (بحار الانوار)۔ مزید یہ کہ 'جھوٹ میں ہر چیز کے لئے فساد ہوتا ہے'۔ امام جعفر صادقؑ بحار الانوار میں فرماتے ہیں کہ 'کذب بیانی بہت بڑا اسود ہے'۔ اسی کتاب میں ایک اور مقام پر امام صادقؑ سے منقول ہے کہ 'سب خیانتوں کو ایک گھر میں بند کیا گیا ہے اور اس کی چابی جھوٹ ہے۔ سید محمود امامی اصفہانی اپنی کتاب ثمرات الحیات میں لکھتے ہیں کہ جھوٹ بولنے سے انسان کی برزخی شکل تبدیل ہوجاتی ہے'۔

اسی طرح سے جھوٹ اور چوری کا بھی قریبی تعلق ہے۔ امام جعفر صادقؑ کا قول ہے کہ عین ممکن ہے کہ کسی شخص کی روح حد سے زیادہ خنک ہوجائے یا گرم۔ جب گرمی فوقیت حاصل کر لے تو وہ گستاخ اور ضدی ہوجاتا ہے، قتل، چوری اور ڈاکہ زنی میں لطف حاصل کرتا ہے، گناہ کرتا ہے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے برعکس گناہ کرنے اور غلط وقت پر کھانا کھانے سے روح خنک ہوجاتی ہے۔ اگر روح خنک ہوجائے تو انسان مرجھایا ہوا اور افسردہ رہتا ہے (Nafs, Ruh, Qalb)۔

چوری کرنے کے کئی ایک اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً گھر یا گلی محلے کا ماحول، بچے کی عزت نفس پر حملہ کرنا، بچپن میں جسمانی یا ذہنی ایذا پہنچانا وغیرہ۔ چوری کے نقصان دہ اثرات کے بارے میں دو عام فہم مثالیں پیش خدمت ہیں۔

پہلا واقعہ ش 1 نے سنایا، اس وقت میری عمر سات یا آٹھ سال رہی ہوگی۔ میں دادی جان کے ساتھ کسی کے گھر مدعو تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے میزبانوں کے ایک بچے کے ساتھ کھیلنا شروع کردیا۔ کھیلتے ہوئے اچانک میری نظر اس کے پنگ پانگ گیند پر پڑی۔ روئی کے گالے کی طرح سفید، ننھی منی سی گیند مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے نظر بچا کر وہ اٹھالی۔ اٹھا تو لیا لیکن وہ ننھی منی سی بے ضرر گیند میرے لئے مصیبت بن گئی۔ میرے پاس نہ تو کوئی بیگ تھا اور نہ ہی میرے لباس میں کوئی جیب تھی۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو گیند اپنی دائیں بغل میں چھپالی اور خاموشی سے ایک جانب بیٹھ گئی تاکہ کوئی میری چوری نہ پکڑ لے۔ خدا خدا کر کے واپسی کا وقت آیا تو میں خوش ہوگئی کہ چلو اب مصیبت ٹل جائے گی۔ لیکن کہاں؟ ان کی بڑی بیٹی مجھے ملنے کے

لئے آگے بڑھی تو میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے ہاتھ ملانے کی کوشش کی تو میں نے ہاتھ تو ملایا لیکن بازو اپنے جسم کے ساتھ پیوست کرلیا۔ وہ کچھ حیران ہوئی لیکن بولی کچھ نہیں اور دوسرے مہمانوں کو خدا حافظ کہنے کیلئے آگے بڑھ گئی۔ میرا برا حال تھا، دل دھڑک رہا تھا، چہرہ سرخ اور جسم پسینے سے شرابور تھا۔ گھر واپسی پر میں اپنی شرمندگی بھول گئی اور میرے وجود میں چوری نہ پکڑے جانے کی سرشاری تھی اور وہ گیند مجھے اپنے تمام کھلونوں سے زیادہ بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ساری شام اس گیند سے کھیلتے ہوئے گزاری۔ دادی نے پوچھا بھی کہ گیند کہاں سے آئی تو اس بچے کا نام لے کر کہہ دیا کہ اس نے دی ہے۔ اگر ہم اس واقعے کا باریک بینی سے جائزہ لیں تو چوری کے تین اہم اثرات سامنے آئیں گے یعنی کہ مجرمانہ کیفیت، جھوٹ اور لطف وسرشاری۔ اس وقت جب میں پسینے میں شرابور تھی تو مجرمانہ ذہنیت اور پکڑے جانے کے خوف نے مجھے بے حال کر دیا۔ ذرا سوچئے کہ اس وقت میری بائیوکیمسٹری کیا رہی ہوگی۔ کتنے غیر معمولی ہارمونز خارج ہوئے ہوں گے اور انہوں نے میرے ہمدردانہ اور غیر ہمدردانہ اعصابی نظام کو کتنا متاثر کیا ہوگا۔ اگر ایسے ہارمونز مسلسل خارج ہوتے رہیں تو انسان مجرمانہ ذہنیت کا شکار ہوجاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اتنی شرمندگی کے باوجود بھی مجھے اس گیند سے کھیلنے میں ایسا لطف آیا جو اس سے پہلے کسی کھلونے میں نہیں آیا تھا۔ یہ ایک عام کیفیت ہے کیونکہ شیطان برائی کو لطف سے آراستہ کر کے پیش کرتا ہے تاکہ انسان برائی کا عادی ہوتا چلا جائے۔

انہوں نے کہا کہ، اس مقام پر صالح تربیت کی افادیت سامنے آتی ہے۔ ہمارے خاندان کا ماحول نہ صرف چوری بلکہ کئی ایک دوسری برائیوں سے بھی دور تھا۔ والدین اور خاندان کے دیگر افراد اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ نصیحت کرتے رہتے۔ وسیع خاندان کی بدولت دادا دادی، نانا نانی، خالائیں ماموں، چچا پھوپھیاں، بلکہ گھر کے ملازمین بھی بچوں کی تربیت میں حصہ لیتے تھے۔ ادھر اسکول میں اساتذہ صالح تربیت کرتے حتیٰ کہ اسکول کی آیا جی لڑکیوں کا دھیان اس طرح رکھتیں جیسے اپنی بیٹیوں کا رکھا جاتا ہے۔ گو کہ میری چوری پکڑی نہ گئی لیکن صالح تربیت کی وجہ سے مجھے اس واقعہ کی ندامت اور شرمندگی ہمیشہ کے لئے یاد رہ گئی اور میں نے اس کے بعد کبھی چوری نہ کی۔ اسی طرح بعض اوقات کسی کی رہنمائی ہمارے لئے سود

مند ثابت ہوتی ہے اور ہماری راہیں سیدھی ہو جاتی ہیں۔اسی مقصد کے تحت خدا کے پیغمبر دنیا میں تشریف لائے ،صعوبتیں برداشت کیں،لیکن انسانوں کی رہنمائی سے پیچھے نہ ہٹے، بھٹکے ہوئے انسانوں کو سیدھی راہ دکھائی اور صالح معاشروں کا قیام عمل میں آیا۔

ہماری ایک امریکی انسٹرکٹر نے ایک واقعہ سنایا۔ان کا کہنا تھا کہ جب وہ ہائی اسکول میں تھیں تو ایک دن کچھ سہیلیاں مل کر جنرل سٹور گئیں۔ان کا منصوبہ تھا کہ ایڈونچر کے لئے جنرل اسٹور سے کچھ چھوٹی موٹی چوری کریں گے۔اس خاتون نے اسکول کی ضرورت کی کچھ اشیا اٹھا لیں، اتفاقاً ان کی چوری پکڑی گئی۔پولیس آئی ،ان کے انگلیوں کے نشان لئے گئے ،معمولی سا جرمانہ ہوا اور انہیں گھر بھیج دیا گیا۔انہوں نے بتایا کہ بظاہر وہ ایک بے ضرر واقعہ تھا لیکن اس کے دوررس اثرات سامنے آئے کیونکہ ان کے فنگر پرنٹس تاحیات پولیس کے ریکارڈ میں محفوظ رہ گئے۔امریکہ میں اہم نوکریوں میں تعیناتی سے پہلے ملازمین کے فنگر پرنٹس لئے جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ آج بھی جب میں کسی نئی نوکری کے لئے جاتی ہوں تو تیس سال پرانا چوری کا ریکارڈ سامنے آجاتا ہے۔انہوں نے نصیحت کی کہ کبھی مزے کیلئے یا مذاق میں بھی چوری نہ کرنا اس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا کے ہاں فنگر پرنٹس لینے کا قاعدہ نہیں؟ کیوں نہیں۔اس کے تمام قانون بے عیب ہیں۔عصبی نفسیات دانوں کے مطابق نہ صرف دماغ بلکہ انسان کے تمام اعضاء یاداشت محفوظ رکھتا ہے۔اسی امر کا ذکر قرآن پاک میں کچھ اس طرح سے آیا ہے کہ روزِ حشر مجرموں کے اعضا ان کے خلاف گواہی دیں گے۔اس کے علاوہ کائنات میں پھیلی برقی مقناطیسی لہریں آفاقی پولیس کا کام دیتی ہیں۔روشنی، آواز اور سوچ کی لہریں ہر امر محفوظ کر لیتی ہیں۔روزِ حشر جب اچھے برے تمام کھاتے کھلیں گے تو یہ ریکارڈ سامنے آئیں گے۔یہی ریکارڈ انسان ایک مرتبہ اپنی موت سے قبل بھی دیکھتا ہے۔

آج کا انسان ہر کام براہ راست برقی مقناطیسی لہروں کے ذریعے سر انجام دے رہا ہے۔سیل فون نے ایک چھوٹی سی جادو کی ڈبیا کی شکل اختیار کر لی ہے۔گھر میں بیٹھے بٹھائے جو جی چاہیں کریں مثلاً تحقیق کریں، معلومات اکٹھی کریں، دور بیٹھے لوگوں سے بات کریں، پیغامات بھیجیں، تصویریں کھینچیں، فلمیں یا دوسرے ٹی وی شوز دیکھیں وغیرہ۔ ہر کام خاموشی

اور رازداری کے ساتھ سرانجام پا جاتا ہے۔ اگر کوئی نامناسب کام پکڑے جانے کا خطرہ ہو تو بھی کیا؟ اسے چند لمحات کے اندر ڈیلیٹ کر کے تمام ثبوت ختم کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان لمحات میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو نہ بھولیں کہ مکروا و مکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔ اگر ہم نے برقی مقناطیسی شعاعوں کو کھیل کود سمجھ لیا ہے تو اس نے پہلے سے ہی اس نظام کو خفیہ سوکرٹی کے فرائض تفویض کیے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں ادراک ہو جائے کہ ہم اتنے نڈر ہو گئے ہیں اپنا تمام ریکارڈ براہ راست آفاقی پولیس کے سینے پر تحریر کر رہے ہیں تو شاید خدا کے خوف سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اسی لئے وہ فرماتا ہے کہ تم خدا کے بنائے ہوئے نظام اور اس کی پکڑ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟

اس حصے کی آخری سطور میں ہم عرض کریں گے کہ اگر ہم تقدیر کے فلسفے کو سمجھ جائیں تو حسد، غیبت اور جھوٹ جیسی علتوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہ کائنات مماثلت اور متبادل ہر دو ضدین پر قائم کی گئی ہے۔ مماثلت یوں کہ ہم زندگی میں کئی مرتبہ خوشی اور آسودگی کے ادوار سے گزرتے ہیں۔ ضد اس طرح کہ ہم اپنی ہی زندگی میں دکھ سکھ اور عروج و زوال سبھی کچھ دیکھتے ہیں۔ اسی طرح دو انسانوں کے حالات آپس میں نہیں ملتے۔ ہر مقام پر کچھ لوگ آسودہ اور کچھ غمزدہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب ہم مشکلات سے گزر رہے ہوں تو کوئی دوسرا بہتر حالات میں ہو گا۔ جب ہم بیمار ہوں تو کچھ لوگ تندرست ہوں گے اور پھر یہ حالات بدل بھی جاتے ہیں۔ یہاں ہم رہٹ کے پہیے کی مثال پیش کرتے ہیں جس پر ڈول بندھے ہوتے ہیں۔ پہیا گھومتا ہے اور ڈول اوپر نیچے حرکت کرتے ہیں، کبھی ایک ڈول اوپر دوسرا نیچے اور کبھی اس کے الٹ۔ بالکل اسی طرح سے تقدیر کا الٹ پھیر نظام قدرت ہے۔ لہٰذا اگر کسی دوسرے شخص کے پاس کوئی عمدہ شے دیکھیں تو حسد کرنے کی بجائے سمجھ جائیں کہ قانون قدرت کے مطابق عنقریب ہمارا رب ہمیں اس سے بہتر عطا کرے گا۔ جب خوشحال ہوں تو تنگدستوں کی مدد کریں تاکہ جب آپ کو ضرورت پڑے تو اللہ تعالیٰ کی مدد کے حقدار ٹھہریں۔ درحقیقت تقدیر ایک دانشمند بزرگ کی طرح ہوتی ہے۔ اس نے ہمارے حصے کا رزق کرنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ میں رکھا ہوتا ہے۔ ہمارے روزمرہ کی زندگی کے اخراجات اس آفاقی کرنٹ

اکاؤنٹ سے پورے ہوتے رہتے ہیں۔ جبکہ سیونگ اکاؤنٹ میں رکھا رزق اس وقت عطا ہوتا ہے جب ہمیں اس کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ غور وفکر کی عادت ڈالیں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ اگر مسلسل سعی کے باوجود بھی کسی شے کا حصول ممکن نہ ہو تو شاید اس کے پیچھے تقدیر کا کوئی راز چھپا ہو۔

4.6۔قریب المرگ واقعات

موجودہ تحقیق کے دوران چند ایک شرکاء نے قریب المرگ واقعات بیان کیے۔ اس حالت میں انسان اپنے آپ کو ایک دوسرے جہاں میں دیکھتا ہے۔ اکثر اوقات وہ اپنا جسم اور آس پاس کے لوگوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور ان کی آوازیں سنتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ایسے واقعات پر تجربات ہوئے اور کچھ اشاعت شدہ مواد بھی ملتا ہے۔ لیکن ہمارے ایسے واقعات بہت کم رپورٹ کیے جاتے ہیں۔

سوئس نیورولوجسٹ اولف بلینک [xxiv] کے مطابق قریب المرگ واقعات میں دماغ کا دایاں یا بایاں حصہ متاثر ہوتا ہے۔ اگر بایاں حصہ متاثر ہو تو انسان اپنے آپ کو اڑتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ دوسری جانب اگر بایاں حصہ متاثر ہو تو وہ دیگر روحوں کے ساتھ ملاقات کرتا ہے، دوسرے جہاں کے رنگ دیکھتا ہے اور آوازیں سنتا ہے۔ محققین کا خیال یہ بھی ہے کہ اگر مختصر سے عرصے کے لیئے دماغ کو آکسیجن کی ترسیل بند ہو جائے تو انسان قریب المرگ تجربے سے دوچار ہو جاتا ہے، اس دوران اس کا قوت ادراک بہت بڑھ جاتا ہے اور سوچ کی یلغار ہوتی ہے۔ بعض اوقات آنکھوں کے سامنے روشنی کے جھماکے ہوتے ہیں اور مختلف مناظر نظر آتے ہیں۔ بعض افراد کا ذہن بالکل مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ نہ تو کسی قسم کا درد محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی خوف وہراس۔

بعض کلچرز میں مابعد الطبیعات کو سمجھنے کے لئے کیٹامین (Ketamine) کے ذریعے قریب المرگ تجربات کیئے جاتے ہیں۔ یہ دوائی جسم کے کچھ مخصوص نیوروکیمیکلز کو متاثر کرتی ہے [xxv]۔

4.7۔ فلسفہ مشکلات اور روحانی روئیدگی

موجودہ تحقیق کے نتائج سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بعض اوقات مشکل حالات بھی روحانی بالیدگی کا باعث بنتے ہیں۔ اس تحقیق کے کئی ایک شرکاء نے مشکل حالات سے گزر کر روحانی بالیدگی حاصل کی۔ مثال کے طور پر ایک شریک تحقیق کو مالی طور پر کمزور اور جسمانی طور پر دلکش نہ ہونے کی وجہ سے تمام عمر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک اور شریک تحقیق کی شادی اپنی تعلیمی اور پیشہ ورانہ قابلیت سے کم تر شخص کے ساتھ ہوئی۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ وہ شخص کئی ایک اخلاقی اور نفسیاتی علتوں کا شکار بھی تھا۔ علاوہ ازیں اس کے گھر والے لالچی تھے اور انہوں نے لڑکی کی اعلیٰ ملازمت کی وجہ سے اسے اپنی بہو بنایا تھا۔ شادی کے صرف تین ماہ کے بعد اس کے خاوند نے نشے کی حالت میں چائے بنائی اور جل کر فوت ہو گیا۔ سسرال والوں نے چند دنوں میں ہی ان عزیزہ کو ان کے والدین کے گھر بھیج دیا تا کہ وہ خاوند کی جائیداد میں سے اپنا حصہ نہ مانگ سکیں۔ انہوں نے سخت اذیت میں اپنا وقت گزارا اور نارمل زندگی کی جانب لوٹنے میں انہیں کافی وقت لگا۔

ایک اور شریک تحقیق کے خاوند کا انتقال اس وقت ہو گیا جب ان کے بچے چھوٹے تھے۔ انہوں نے تمام عمر مشکلات کا سامنا کیا۔ مشکل وقت میں اپنے رب کے ساتھ ان کا قریبی رابطہ ہوا۔ صوم وصلوٰۃ، قرآن پاک کی تلاوت اور دیگر فلاحی کاموں میں حصہ لینے کی وجہ سے ان کی ذات میں روحانی بالیدگی پیدا ہوئی۔ ایک اور شریک تحقیق کے دونوں والدین بہرے پن کا شکار تھے۔ وہ والدین کی عمومی تربیت اور ان کی نصیحتوں سے محروم رہیں۔ اس محرومی کے احساس نے انہیں اپنے حقیقی پالنے والے سے قریب کیا اور وہ روحانیت کے ایک اعلیٰ مقام تک پہنچیں۔ اس کے علاوہ ایک اور شریک تحقیق نے اپنا بچپن تنگدستی میں گزارا لیکن حالات کے آگے سپر نہ ڈالی۔ محدود ذرائع کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور آج ایک کامیاب پروفیسر کے طور پر زندگی گزار رہے ہیں۔ مشکل حالات میں کچھ لوگ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور حالات کے سامنے سپر ڈال دیتے ہیں۔ تاہم مشکل حالات آزمائش کا دوسرا نام ہے اور آزمائش سے گزرنے کے بعد انسان نعمت خداوندی کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ تفسیر نور الصادقین میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جنت مشکلات اور صبر میں گھری ہوئی ہے۔

اس تحریر کا ہدف نوجوان ہیں اور خصوصاً ایسے نوجوان جو مشکلات کی وجہ سے زندگی اور روحانیت سے دور ہو چکے ہیں اس لیے فلسفہ مشکلات کی ترویج ہماری اہم ذمہ داری ہے۔ فلسفہ مشکلات ایک آسان اور سادہ فلسفہ ہے۔ اس کے دو ہی پہلو ہیں یعنی کہ عمل ردعمل یا اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجی ہوئی آزمائش۔ غور وفکر کرنے والوں اور علت ومعلول پر یقین رکھنے والوں کے لئے دونوں ہی نعمت خداوندی کا درجہ رکھتی ہیں۔ عمل ردعمل کی وجہ سے کئی ایک گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور روحانی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ دوسری جانب آزمائش کی وجہ سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں اور روحانی اوج حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے پیارے بندوں پر کس قدر آزمائشیں آئیں۔ جب حضرت آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا تو وہ یکا و تنہا تھے۔ وہ زمین کے ایک کونے پر اور حضرت حوا دوسرے کنارے پر تھیں۔ وہ مزون ہوتے اور گریہ کرتے۔ اس وقت حضرت جبرائیلؑ نے انہیں غم واندوہ سے نجات کے لئے یہ دعا تعلیم فرمائی: لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ پیغمبر موسیٰؑ بن عمران کو ہی لے لیجئے۔ پیدائش کے ساتھ ہی آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ان آزمائشوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ زندگی میں کئی مرتبہ فرعون کے غیظ وغضب کا نشانہ بنے۔ جب ایک قبطی کو تھپڑ مارا تو اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ فرعون کے سپاہیوں کے ڈر سے بھاگے اور مصر سے لے کر مدین تک بھاگتے چلے گئے۔ خود دار اتنے تھے کہ تمام راستہ کسی سے کھانے کی درخواست کی اور نہ ہی پانی کی۔ درختوں کے پتے کھاتے اور کنویں کا پانی پیتے۔ اسی اثنا میں حضرت شعیبؑ کی بیٹیوں سے ملاقات ہوئی اور وہ حضرت شعیبؑ تک پہنچے۔ کئی سال حضرت شعیبؑ کی خدمت میں رہے۔ آخر کار ان کی بیٹیوں سے شادی کی اور دوبارہ مصر روانہ ہو گئے۔ جب مصر واپس پہنچے اور ان کی پیغمبری کا اعتراف کر لیا گیا تو اپنی ہی امت نے بارہا زک پہنچائی۔ کچھ روایات کے مطابق عمر کے آخری حصے میں اپنی قوم سے ناراض ہو کر جدا ہوئے اور جنگلوں میں وفات پائی۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے ان کی تدفین کی۔

جب حضرت ابراہیمؑ کو توحید کے اقرار کے جرم میں زندہ جلائے جانے کی سزا دی گئی، تو اتنا بڑا الاؤ سلگایا گیا جس کی حدت میلوں تک جاتی تھی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ انہیں

آگ میں ڈالنے کے لئے بہت بڑا جھولا تیار کیا گیا جبکہ کچھ اور روایات کے مطابق انہیں منجنیق سے آگ میں پھینکا گیا۔ جب انہیں آگ میں پھینکنے کی تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں تو حضرت جبرائیلؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اس وقت کرہ ارض پر تیرا ایک ہی کلمہ گو ہے۔ اسے بھی آج آگ میں ڈال دیا جائے گا اور زمین توحید پر ایمان لانے والوں سے خالی ہو جائے گی۔ کیا تو مجھے اجازت دیتا ہے کہ میں زمین پر جاؤں اور ابراہیمؑ کی مدد کروں؟ ارشاد باری تعالیٰ ہوا وہ میرا بندہ ہے لیکن تم کوشش کر کے دیکھ لو۔ حضرت جبرائیلؑ برق رفتاری سے پرواز کرتے ہوئے زمین پر پہنچے تو جھولا زمین و آسمان کے درمیان معلق تھا۔ انہوں نے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ کیا آپ کی کوئی خواہش ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاں ہے تو مگر تجھ سے نہیں۔ حضرت جبرائیلؑ نے کہا تو پھر تم اپنی حاجت اپنے خدا سے مانگو۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: وہ میرے حال سے واقف ہے۔ امام محمد باقرؑ سے نقل ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پالنے والے سے کچھ اس طرح راز و نیاز کیا:

یا احد، یا احد، یا صمد، یا صمد، یا من لم یلد، ولم یولد یکن لہ کفواً احد توکلت علی اللہ

ترجمہ: اے اکیلے، اے اکیلے، اے بے نیاز، اے بے نیاز، اے وہ کہ جس نے کسی کو نہیں جنا اور نہ جو جنا گیا اور جس کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ میں صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں۔

ان کے صبر و استقامت اور یقین کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آگ گلزار بنا دی۔ آتش نمرود سے زندہ بچ جانے کے بعد انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ انہوں نے سرزمین حجاز کی جانب ہجرت کی۔ حضرت ہاجرہؑ اور نومولود حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کے لق و دق صحرا میں تنہا چھوڑ کر جا رہے تھے تو ہاجرہؑ نے فریاد کی کہ اے خدا کے رسول! ہمیں بغیر زاد راہ اور توشہ کے کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ بے آب و گیاہ زمین جہاں نہ تو پانی کا قطرہ ہے اور نہ ہی دودھ دینے والا جانور۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ یہی میرے رب کا حکم ہے۔ حضرت ہاجرہؑ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو پھر وہ ہمیں اکیلا نہیں چھوڑے گا (قصص الانبیاء)۔

حضرت اسماعیلؑ کا سن اس وقت تیرہ سال کا ہوگا جب حضرت ابراہیمؑ کو شب ترویہ

(آٹھ ذی الحج کی رات) کو خواب میں انہیں قربان کرنے کا حکم ہوا۔ بعدازاں عرفہ اور عید کی راتوں میں اسی خواب کی تکرار ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کررہا ہوں۔ حضرت اسماعیلؑ نے جواب دیا: جو آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے پورا کیجیے آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نوخیز بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے لے کر چلے تو شیطان نے فرداً فرداً حضرت ہاجرہؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے دل میں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کی۔ جواباً اسے لعنت اور پتھروں کا سامنا کرنا پڑا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خدا کے بندوں کا صبر واستقامت ہی شیطان کے منہ پر طمانچے کے برابر ہوتا ہے۔

حضرت ذوالقرنین کا قصہ ہی لے لیجئے جب وہ اپنی فوج لے کر مشرق اور مغرب کی اقوام کی جانب نکل جایا کرتے تھے۔ یہ وہی ذوالقرنین ہیں جنہوں نے یاجوج ماجوج کی خون ریزیوں کو روکنے کے لئے لوہے اور سیسہ کی دیوار کھڑی کی تھی۔ ان کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے یا صرف ایک برگزیدہ بندے۔ بہرحال یہاں پر ان کی والدہ کا قصہ مقصود ہے۔ جب ذوالقرنین چلے جاتے تو وہ اتنا گریہ کرتیں کہ بستی کے لوگ پریشان ہوجاتے۔ انہیں کسی صورت تسلی نہ ہوتی۔ آخر ایک روز دہقان کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس زمانے میں دہقان بڑے زمیندار کو کہا جاتا تھا۔ اس نے منادی کروائی کہ سب لوگ اس کے ہاں اکٹھے ہوجائیں۔ جب سب لوگ اکٹھے ہوگئے تو اس نے اعلان کروایا کہ جو لوگ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں وہ کھڑے ہوجائیں۔ لوگوں نے کہا کہ بھلا وہ کون ہوگا جو کسی نہ کسی مصیبت یا پریشانی میں مبتلا نہ ہو۔ اس نے ہمیں ضیافت کے لئے بلایا اور اب اس کے ہاں ضیافت نہیں تو ادھر ادھر کی باتیں بنا رہا ہے۔ اس وقت دہقان کھڑا ہوا اور اس نے خطبہ دیا کہ اے لوگو میں نے تمہیں ضیافت کے لئے نہیں بلکہ ایک خاص معاملے پر گفتگو کرنے کے لئے بلایا ہے اور وہ ہے ذوالقرنین کی جدائی جس کے غم میں ہم سب مبتلا ہیں۔ لیکن تم لوگ آدم کو یاد کرو جن کے اوپر اس زمانے کی سب سے بڑی ابتلا آئی یعنی انہیں جنت سے جدا ہوکر زمین پر آنا پڑا۔ ابراہیمؑ کو آگ میں، یعقوبؑ کو رنج میں، یوسفؑ کو غلامی میں، ایوبؑ کو بیماری میں، یحییٰؑ کو رنج میں، ذکریاؑ کو مارے جانے میں عیسیٰؑ کو

اسیری میں اور بہت سے لوگوں کو ایسے مصائب میں جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا مبتلا کیا گیا۔ اس مجمع میں حضرت ذوالقرنین کی والدہ بھی تھیں۔ انہیں یہ خطبہ سن کر قرار آ گیا اور انہوں نے کہا کہ اب مجھے معلوم ہوا کہ تم سب بھی ذوالقرنین کے لئے غمگین ہو لیکن صبر کرتے ہو اور خدا کے پیغمبروں پر کیسی کیسی مصیبتیں نہ گزریں۔ یقیناً میں اپنے غم میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرا رب میرے رنج کو دور فرمائے گا۔ میں تمہاری اس مشقت کے لئے دعا کرتی ہوں جو تم نے میرا غم دور کرنے کے لئے اٹھائی (حیات القلوب)۔

اپنے عزیز پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف معاشرتی، بلکہ نجی اور خاندانی آزمائشوں میں بھی مبتلا کیا، تاکہ انسانیت کو نمونہ حیات دکھایا جا سکے۔ اسی سلسلے میں حضرت ہودؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی مثالیں پیش خدمت ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت ہودؑ سے لوگوں کا ایک وفد ملنے کے لئے آیا۔ گھر کے اندر سے سفید بالوں اور ایک آنکھ والی ایک بڑھیا نکلی۔ اس نے آنے کا مقصد پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ ہمارے شہروں میں خشک سالی کی وجہ سے زراعت تباہ ہو رہی ہے۔ ہم ہودؑ سے دعا کروانے کے لئے آئے ہیں۔ وہ بڑھیا کہنے لگی کہ اگر ان کی دعا قبول ہوتی تو اپنے لئے دعا کیوں نہ کرتے۔ ان کی تمام زراعت تباہ ہو چکی ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں ہوں گے؟ اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔ لوگ چلے اور حضرت ہودؑ کو ڈھونڈ لیا۔ ان کی پریشانی سننے کے بعد حضرت ہودؑ نے دو رکعات نماز ادا کی اور ان سے کہا کہ واپس جاؤ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے باران رحمت کا انتظام کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ کے گھر میں ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ حضرت ہودؑ نے پوچھا بھلا وہ کیا؟ لوگوں نے یک چشم بڑھیا کا واقعہ بیان کیا۔ حضرت ہودؑ نے فرمایا کہ وہ میری بیوی ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کی عمر دراز ہو۔ لوگوں نے پوچھا وہ کیوں؟ تو انہوں نے فرمایا: خدا نے ہر مومن کے ساتھ ایک دشمن پیدا کیا ہے۔ میری دشمن میری بیوی ہے جس کا مالک ومختار میں ہوں۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ میرا مالک ومختار ہوتا۔ اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نہ صرف معاشرتی اور معاشی زندگی میں بلکہ ذاتی زندگی میں بھی اپنے خاص بندوں کا امتحان لیتا ہے جیسے کہ حضرت آدمؑ کا قابیل کے ذریعے، حضرت نوحؑ کا نافرمان بیٹے اور بیوی کے ذریعے، حضرت یعقوبؑ کا حاسد بیٹوں کے

ذریعے، حضرت عیسیٰؑ کا حواری کے ذریعے وغیرہ۔

حضرت عیسیٰؑ کا نہ کوئی گھر تھا نہ خاندان۔ جب ان کے مخالفین سولی چڑھانے کے ارادے سے اکٹھے ہو گئے تو حضرت جبرائیلؑ تشریف لائے۔ آپ نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ان کے پروں کی اندرونی جانب لکھا تھا:

اے خدا! میں تجھے تیرے پرشکوہ نام سے پکارتا ہوں۔ الوحید (واحد)۔

اے خدا! میں تجھے تیرے نام الصمد (پناہ دینے والے) سے پکارتا ہوں۔

اے خدا! میں تجھے تیرے یکتا نام العظیم سے پکارتا ہوں۔

اے خدا! میں تجھے تیرے عظیم نام الکبیر سے پکارتا ہوں جس کی وجہ سے ستون اپنے مقام پر کھڑے ہیں میری دن اور رات کی مصیبت مجھ پر سے دور فرما۔

حضرت عیسیٰؑ نے یہ دعا پڑھی اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمانوں پر زندہ اٹھا لیا (بحارالانوار)۔

حضورؐ نے ترویج دین کے لئے کون سی صعوبت برداشت نہ کی۔ ان کی راہوں میں کانٹے بچھائے گئے، پتھر مارے گئے۔ جب خانہ کعبہ کے قریب قرآن کی تلاوت کرتے تو کافر سیٹیاں بجاتے اور شور مچاتے تاکہ قرآن کی آواز کسی کے کانوں میں نہ پڑے۔ ان کا بائیکاٹ کیا گیا اور شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا۔ کبھی کبھار وہاں کھانے کے لئے درختوں کے پتوں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ لیکن ان تمام مصیبتوں کا نتیجہ ایک عالم گیر دین کے کامیاب احیاء کی صورت میں نکلا جس نے تا قیامت انسانیت کا رخ امن اور سلامتی کی جانب موڑ دیا۔ اس کے علاوہ حضورؐ نے فرمایا کہ 'کچھ پیغمبر بھوک، کچھ پیاس اور کچھ بیماری کی وجہ سے وفات پا جاتے تھے۔ کچھ اقوام ایسی بھی تھیں کہ جب انبیاء انہیں خدا کا پیغام سناتے تو وہ فی الفور انہیں قتل کر دیا کرتی تھیں' (حیات القلوب)۔ جہالت کے یہ انداز آج کل کے حالات سے کس قدر قریب ہیں۔ جہاں ایک جانب تو ہلکی سی چپقلش کے نتیجے میں لوگ ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں اور دوسری جانب ایسی بے حسی کا عالم ہے کہ آنکھوں کے سامنے انسانیت کا قتل بھی ہو جائے تو اپنی ناک کے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔

امام حسینؑ کی لازوال قربانی رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے بے مثال ہے۔ فلسفہ شہادت بہت وسیع اور گہرا ہے۔ لیکن اسے دولفظوں میں اس طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے کہ شہید کی جوموت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔ شہید کی مثال ایسی شمع کی سی ہے جو خود جل کر دوسروں کو روشنی عطا کرتی ہے۔ شہید مردہ اجسام میں زندگی کی روح دوڑا دیتا ہے۔ شہید کا مقصد قوم میں سرفروشی کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اسلام کو ہمیشہ شہید کی ضرورت رہتی ہے۔ عصر عاشور میں تمام خاندان اور اصحاب کی قربانی دینے کے باوجود امام کا نفس مطمئنہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ استاد شہید مرتضی مطہریؒ اپنی کتاب انسان کامل میں بیان کرتے ہیں کہ عمر سعد کے ساتھ ایک شخص کربلا کا رپورٹر تھا۔ اس نے شمر کو امام کا سر لاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کہتا ہے کہ امام کے چہرے کی بشاشت نے مجھے اتنی فرصت ہی نہ دی کہ میں ان کے قتل کئے جانے کے بارے میں سوچوں۔ خدا کے پیغمبروں اور دیگر صالحین کی شہادتیں تو روز ازل سے ہی ہوتی رہیں لیکن جو کام شہادت امام حسینؑ نے انجام دیا وہ کسی نے نہ دیا۔ بھوکے پیاسے امام کی قربانی نے تا ابد حلال اور حرام کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی۔ اخلاقیات کے واضح اصول وضع کئے اور تا قیامت طاغوتی طاقتوں کا چہرہ بے نقاب کر دیا۔ کربلا ایک لازوال درس گاہ ہے۔ اس درس گاہ سے چھوٹے بڑے، مرد و زن، امیر غریب، مسلمان اور غیر مسلم سب فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس درس گاہ سے انسانی حقوق، اخلاقیات اور دیگر اعلیٰ اقدار کے ان گنت اصول اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ جو آتا ہے اور جتنی مرتبہ آتا ہے جھولیاں بھر کر لے جاتا ہے۔ کوئی دنیوی دولت کا طلبگار ہو یا روحانی روئیدگی کا اس در پر ہر جنس ملتی ہے۔

آج کے پر آشوب دور میں روحانی بالیدگی حاصل کرنے کے لیے پیغمبروں اور صلحاء کے قصے چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مثالیں بالکل اسی طرح ہیں جیسے استاد ایک بے عیب نمونہ پیش کر دیتا ہے اور طلباء اپنی سمجھ کے مطابق اس کی تقلید کرتے ہیں۔ ذیل میں موجودہ زمانے کی کچھ ایسی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جن کی مدد سے فلسفہ مشکلات سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی۔

ہماری ایک عزیزہ کے خاوند کو جوانی میں ہی فالج ہو گیا اور ان کی دائیں ٹانگ اور بازو بہت کمزور پڑ گئے۔ ان کی قوت گویائی بھی متاثر ہوئی۔ کئی ماہ کی مشق کے بعد چند مخصوص الفاظ

بولنے کے قابل ہوئے۔ سات ماہ بستر پر رہنے کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ اب وہ غصے کے بہت تیز ہو گئے تھے۔ کسی کی بات نہ سنتے اور جب جی میں آتا گھر سے نکل جاتے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کا ایکسیڈنٹ ہوا اور دونوں ٹانگیں کولہے کے قریب سے کاٹ دی گئیں۔ ان کٹی ٹانگوں کے ساتھ وہ مزید سات سال زندہ رہے۔ ان کی اہلیہ مسلسل تکالیف اور ٹینشن کی وجہ سے بیمار ہو گئیں۔ شوگر اور بی پی ہائی رہنے لگا۔ ایک مرتبہ ان کی بیٹی قصص الانبیاء لے آئی اور روزانہ اس کا کچھ حصہ انہیں سناتی۔ گو کہ وہ پیغمبروں کے واقعات سے واقف تھیں لیکن ان سچے واقعات نے گویا ان کے زخمی دل پر مرہم کا کام کیا۔ خصوصاً حضرت ایوبؑ کے قصے نے ان کے دل پر ایک گہرا اثر ڈالا۔ وہ کہتیں: سبحان اللہ! تیری قدرت۔ تیرے پاک و پاکیزہ بندے کیسی سخت آزمائشوں سے گزرے۔ ہم ان ہستیوں کے مقابلے میں کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طرح انہیں اپنے حالات پر صبر آ جاتا۔

موجودہ دور میں کئی ایک مشہور خواتین وحضرات نے زندگی میں شدید مشکلات کا سامنا کیا۔ مثلاً مشہور آسٹرین ڈاکٹر اور نفسیات دان فرینکل [xxvi] 1942ء سے لے کر 1945ء تک نازیوں کے چار نظر بندی کیمپوں میں رہا۔ اس کی حاملہ بیوی اور گھر کے دیگر افراد کیمپ کی سختیاں برداشت نہ کر سکے اور وفات پا گئے۔ اس کا کہنا تھا کیمپ میں دو سو افراد کی جگہ پر پندرہ سو قیدی ٹھونس دیئے جاتے۔ وہ چار اونس ڈبل روٹی پر چار روز گزارتے۔ وہ دوسرے قیدیوں کو مرتا ہوا دیکھتے اور افسردگی اور ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے۔ وہاں ایسے قیدی بھی تھے جو بالکل بے حس ہو گئے تھے۔ اس وقت فرینکل کو احساس ہوا کہ اس مقام پر رہ کر وہ اپنے دگرگوں حال ساتھیوں کی مدد کر سکتا ہے۔ اس نے ان کی دلجوئی اور رہنمائی شروع کر دی اور اس کے ساتھ اپنی مشہور زمانہ کتاب 'Man's Search for Meaning' نازیوں سے چھپا کر تحریر کی۔

نازیوں کے کیمپوں سے چھٹکارا پانے کے بعد اس نے یونیورسٹی آف ویانا میڈیکل اسکول میں نوکری کا آغاز کیا اور پروفیسر آف نیورالوجی اور نفسیات کے عہدے تک پہنچا۔ جب اس کی کتاب چھپی تو چالیس زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور اس کے بارے میں سترہ سو تحقیقاتی مضامین لکھے گئے۔ اس کی کتاب کی شہرت اور ہردل عزیزی نہ صرف موضوع تھا بلکہ طرزِ تحریر

بھی۔فرینکل ایک بہت بڑا داستان گو تھا۔اس نے جا بجا کیمپوں کے قصے اس طرح بیان کیے جو قارئین کے دل پر اثر کرتے تھے۔اس تصنیف میں فرینکل نے نہ صرف مشکلات کو زندگی کا ایک جزو لاینحل قرار دیا بلکہ اس کا خیال تھا کہ مشکلات کے بغیر زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔جبکہ زندگی میں معنیٰ اور مقصد بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔مشکلات کے دور میں انسان کے پاس انتخاب کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقار اور انسانی اقدار کا خیال رکھے یا اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لئے حیوان بن جائے۔مقصد حیات ہمارے دکھوں اور تکالیف کا مداوا کرتا ہے اور ہماری نشو و نما اور اطمینان کا باعث بنتا ہے۔اس کا کہنا تھا کہ کیمپ میں قیدیوں سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ ان کی آزادی، عزت نفس، شناخت، خاندان اور پیشہ لیکن ایک شے ان سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا تھا اور وہ تھا ان کے رویئے کا انتخاب۔بے معنیٰ زندگی خالی پن کا احساس دلاتی ہے۔اس خالی پن کے احساس کی وجہ سے معاشرتی اور اخلاقی اصولوں سے روگردانی پیدا ہوتی ہے۔جب انسان کی زندگی بے معنیٰ ہو کر رہ جاتی ہے تو وہ جارحیت، ڈیپریشن، مایوسی اور نشے کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ قدرت نے انسان کو اتنی طاقت عطا کی ہے کہ وہ آرام وسکون کی غیر موجودگی میں بھی اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے دکھ اور تکلیف برداشت کرے۔فرینکل نے اس تصور کو Theory of Logotherapy کا نام دیا۔لوگوتھراپی انسانی سوچ کا رابطہ روح کے ساتھ پیدا کرتی ہے۔

علاوہ ازیں فلسفہ مشکلات کے دو اہم پہلو اور بھی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہوئی آزمائش اور دوسرے اپنے اعمال کا ردعمل۔آیئے ان دونوں پہلوؤں کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔آزمائش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خدا اپنے عزیز بندوں کی آزمائش کرتا ہے تاکہ انہیں درجہ کمال تک پہنچا سکے بالکل اسی طرح سے جیسے طلباء کا امتحان لیا جاتا ہے تاکہ ان کا درجہ بلند کیا جا سکے۔اس سلسلے میں میرا اپنا ایک فلسفہ ہے۔دنیا کا ہر فلسفہ، مذہب اور اخلاقی درس ہمدردی کا سبق دیتا ہے۔ ہمدردی دو الفاظ ہم اور درد کا مجموعہ ہے۔یعنی دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھنا اور دکھ بانٹنا۔انگریزی زبان کا محاورہ دوسرے کے جوتے پہن کر دیکھنا بھی یہی معنیٰ رکھتا ہے یعنی کہ اپنے آپ کو دوسرے کی جگہ رکھ کر سوچنا کہ جب اس پر تکلیف آئی ہوگی تو اس نے کیسا محسوس کیا ہوگا؟ لیکن کیا دوسرے کے درد کو اس طرح محسوس کرنا جیسا اس نے کیا ہو ممکن ہے؟ میرے خیال میں

نہیں۔ اگر ہمیں کھانا آسانی سے دستیاب ہو اور ہم کبھی شدید بھوک کا شکار نہ ہوئے ہوں تو ہم کسی بھوکے شخص کو کھانا تو کھلا سکتے ہیں لیکن بھوک کی اس کیفیت کو محسوس نہیں کر سکتے جس میں وہ مبتلا ہے۔ اگر ہم زندگی میں کبھی شدید بیماری کا شکار نہ ہوئے ہوں تو بیمار کی دلی کیفیت کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ یہاں ہم ایک ایسے شخص کی مثال پیش کر سکتے ہیں جیسے کہ کوئی ساحل سمندر پر کھڑا ایک ڈوبتے شخص کا نظارا کر رہا ہو۔ وہ ڈوبتے ہوئے شخص کے لئے چاہے کتنا ہی مضطرب کیوں نہ ہو اس کے اور ڈوبنے والے کے جذبات میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ لیکن زندگی میں کبھی وہ بھی اس سے ملتے جلتے تجربے سے گزرا ہو تو اسے اپنی تکلیف یاد آجائے گی اور وہ زیادہ جذبے سے دوسرے فرد کی مدد کر پائے گا۔ بس یہی ہے فلسفہ آزمائش یعنی کہ ذہنی، جذباتی اور روحانی طور پر کسی کو عملی آزمائشوں سے گزار کر جذبہ ہمدردی میں طاق کرنا۔ مثلاً روزے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بھوکے کی بھوک کو محسوس کیا جائے۔ حج کے دوران انسان سفر کی صعوبتیں سہتا ہے۔ خاندان اور بچوں سے دوری برداشت کرتا ہے۔ بیماری میں احساس ہوتا ہے کہ دوسرے مریضوں کے احساسات کیا ہوتے ہوں گے۔ مالی تنگی کے دوران نادار افراد کی پریشانی کا احساس ہوتا ہے۔ لہٰذا آزمائش کے ذریعے اللہ کا بندہ درجہ بدرجہ بلندی کی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔

مشکلات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کبھی کبھار تقدیر ہمیں ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے جو شاید ہمارے لئے کوفت کا باعث لیکن کسی دوسرے شخص کا فائدہ ہو۔ یہاں حضرت شعیبؑ کا واقعہ بے محل نہ ہوگا۔ حضورؐ سے منقول ہے کہ وہ خدا کی محبت میں اتنا روئے کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ خدا نے ان کی آنکھوں کا نور لوٹایا تو دوبارہ اتنا گریہ کیا کہ اندھے ہو گئے۔ ایسا تین مرتبہ ہوا آخر ارشاد ربی ہوا کہ اے شعیب اگر تم جہنم کے خوف سے روتے ہو تو جہنم تم پر حرام کر دی گئی۔ اگر تم جنت کی خواہش میں روتے ہو تو جنت تم پر مباح ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے پاک پروردگار نہ میں جہنم کے خوف سے اور نہ جنت کی خواہش میں روتا ہوں بلکہ تیری محبت نے کچھ اس طرح سے میرے دل میں گھر کر لیا ہے کہ تیرے شوق ملاقات میں گریہ کرتا ہوں۔ اس وقت انہیں وحی ہوئی کہ میں موسیٰؑ بن عمران کو تیرے پاس بھیجتا ہوں تاکہ تیرے دل کو تسلی ہو۔ اب یہاں حضرت موسیٰؑ بن عمران کے واقعہ پر بھی نظر ڈال لیجیئے کہ کس طرح انہوں نے قبطی کو مکا مارا تو وہ

فوت ہو گیا۔ اب حضرت موسیٰؑ فرعون کے سپاہیوں سے ڈر کر دوڑے اور مدین پہنچے۔ یہاں تک کہ حضرت شعیبؑ کی بیٹیوں کے ذریعے ان تک پہنچے۔ یہ تمام واقعات اللہ تعالیٰ کی منشا و مرضی سے وقوع پذیر ہو رہے تھے (حیات القلوب)۔

امام جعفر صادقؑ نے حتیٰ کہ موت کو بھی انسان کے لئے رحمت قرار دیا۔ بعض افراد نے کہا کہ موت تو ایک بڑی مصیبت ہے۔ آپ اسے خدا کی رحمت کس طرح سے قرار دیتے ہیں؟ امام نے فرمایا اگر موت نہ ہوتی تو تمہاری اولادیں اور ان کی اولادیں تم سے بیزار ہو جاتیں۔ تم جب بیمار ہوتے ہو تو وہ تمہیں طبیب کے پاس لے کر جاتے ہیں۔ اگر موت نہ ہوتی تو وہ تمہاری بیماری کی پرواہ بھی نہ کرتے۔ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تم ایک خاص مدت تک زندہ رہو اور پھر اپنے خالق سے جا ملو یا ہمیشہ زندہ رہو اور کوئی تمہارے اوپر معمولی سی توجہ بھی نہ دے؟ اگر لوگ ہمیشہ زندہ رہتے تو زمین انسانوں سے بھر جاتی۔ رہنے کے لئے جگہ نہ بچتی اور انسان ایک دوسرے کو کھانے کے درپے ہو جاتے۔ ایک اور مقام پر امام نے ابوشاکر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر موت نہ ہو تو ظلم بڑھ جائے گا۔ اگر موت نہ ہو تو زندگی کی لذت نہیں۔ والدین اپنے بیٹے پر مہربان ہیں تو اس لئے کہ انہیں علم ہے کہ وہ مر جائیں گے۔ اگر موت نہ ہوتی تو لوگ خدا سے نہ ڈرتے۔ (برین آف اسلام)۔ امام عالی مقام نے یہاں کتنے خوبصورت پہلو کو اجاگر کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں دنیا کے بڑے بڑے کارنامے موت کے خوف سے انجام دیئے گئے۔ عالی شان عمارتیں، طویل و عریض شہر، مملکتوں کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دوڑی جانے والی شاہراہیں، پہاڑوں کو کھود کر اور قدرتی غاروں کے اندر بنائے جانے والے معبد خانے اس لئے تعمیر کئے گئے کہ بنانے والوں کے نام رہتی دنیا تک قائم رہیں۔

اسی لئے حضرت علیؑ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! موت کا ناگہانی حادثہ ایسا نہیں ہے کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ میری مثال اس شخص کی سی ہے جو رات بھر پانی کی تلاش میں رہے اور صبح ہوتے ہی چشمے پر پہنچ جائے (نہج البلاغہ وصیت 23)۔ آپ کا ایک فرمان یہ بھی ہے کہ جس خدا نے موت بنائی اسی نے زندگی بھی بنائی۔ جو حادثات بھیج سکتا ہے وہ ان سے بچانے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔

استاد شہید مطہری اپنی کتاب 'انسان کامل' میں بیان کرتے ہیں کہ امام حسینؑ نے صبح عاشور اپنے اصحاب سے فرمایا کہ موت ایک پل کے سوا اور کچھ بھی نہیں جس کے اوپر سے تم گزر رہے ہو۔ مزید برآں امام جعفر صادقؑ کا قول ہے کہ نیک اعمال والے لوگ اپنے خدا کی جانب اس طرح سے جائیں گے جیسے کوئی تھکا دینے والے سفر سے واپس آتا ہے اور بد اعمال اس طرح سے جائیں گے جیسے کوئی بھاگا ہوا غلام اپنے مالک کے پاس واپس آتا ہے (الکافی)۔

دوسری جانب بعض اوقات ہماری زندگی میں آنے والی مشکلات ہمارے اپنے اعمال کا ردعمل بھی ہوتی ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے ہاتھوں کے کئے میں گرفتار ہے۔ (طور 61)۔ اس سلسلے میں ہمارے ایک قریبی علاقے کے ظالم جاگیردارانہ نظام کا ایک قصہ پیش خدمت ہے: تقریباً بیس سال پہلے وہاں زمین کے ایک معمولی سے جھگڑے پر ایک نوجوان آدمی قتل ہو گیا تھا۔ اس کی ایک نوجوان بیوی اور دو کم سن بیٹیاں تھیں۔ بڑی کی عمر تین اور چھوٹی کی ایک سال تھی۔ جب گولی لگی تو اس نے بڑی بیٹی کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ اس کا بڑا بھائی اور بھابھی ہوشیار لوگ تھے۔ انہوں نے بھائی کا مقدمہ لڑا۔ قاتل کو سزا دلوائی اور اس کے ساتھ ہی چھوٹی بھابھی اور اس کی بچیوں کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے بھابھی کو مختصر سا حصہ دے کر اس کی شادی کر دی۔ اس کا خاوند لالچی، بدمزاج اور سخت گیر تھا۔ اس نے جائیداد کی لالچ میں اس بیوہ خاتون سے شادی کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اسے بچیوں سے ملنے تک کی اجازت بھی نہ دیتا تھا۔ ادھر تایا نے باقاعدہ قانونی کاروائی کے ذریعے بچیوں کی سرپرستی لے لی۔ یوں یتیم بچیوں کی زندگی سے سگی ماں کا عمل دخل بھی نکل گیا۔ تایا کے دو لڑکے تھے جو ایک اعلیٰ درجے کے پرائیویٹ انگریزی میڈیم سکول میں پڑھتے تھے۔ لیکن ان بچیوں کو گورنمنٹ سکول بھی نہ بھیجا گیا۔ وہ سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتیں۔ تقریباً پندرہ سال کے بعد تایا کا بھی انتقال ہو گیا۔ انتقال سے پہلے تایا کو ان بچیوں کا خیال آیا اور اس نے بیوی سے کہا کہ ہم نے ان کی جائداد پر بھی قبضہ کر لیا اور تعلیم سے بھی محروم رکھا۔ البتہ تم ان کی شادیاں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ کر دینا تاکہ ہمارے گناہ کا کفارہ ادا ہو سکے۔ لیکن اس لالچی خاتون نے ایک سال کے اندر ہی بڑی لڑکی کی شادی ایک مزدور پیشہ شخص کے ساتھ کر دی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ان

بچیوں کے باپ کے سزا یافتہ قاتل نے چھوٹی لڑکی کا رشتہ مانگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس رشتے کی وجہ سے خاندانی دشمنی ختم ہو جائے گی اور ہمارے بچے سکون سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ تائی نے اس رشتے کے لئے ہاں کر دی۔ جب بڑی بہن نے سنا تو وہ دوڑی آئی اور تائی کی منتیں کیں کہ اگر بچی آپ پر بوجھ ہے تو اسے میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں۔ لیکن ہمارے باپ کے قاتل کے ساتھ اس کا رشتہ نہ کریں۔ تائی نے انتہائی ڈھٹائی سے جواب دیا کہ اگر خاندانی دشمنی ختم کرنے کا موقع مل رہا ہے تو میں اسے ختم کیوں نہ کروں؟ کیا تم چاہتی ہو کہ میرے بیٹوں کا بھی وہی انجام ہو جو تمہارے باپ کا ہوا؟ اس وقت اس کا بڑا بیٹا لاہور انجنیئرنگ کالج کا طالب علم تھا۔ اس نے بیٹے کے علم میں لائے بغیر شربت کے ایک گلاس پر چھوٹی لڑکی کا نکاح کیا اور اسے رخصت کر دیا۔ اس واقعے کے تقریباً ایک سال کے بعد اس کے بیٹے نے تعلیم مکمل کر لی۔ وہ گھر واپس آیا تو اس کی ماں نے اپنے رشتہ داروں میں اس کا رشتہ طے کر دیا۔ میرے دادا جان جب اس کے نکاح میں شرکت کر کے واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دولاں بہت خوبصورت، تمیز دار اور لائق تھا۔ لڑکی کے جہیز کا سامان اس وقت تک دولہا کے گھر آ چکا تھا۔ علاقے کی روایت کے مطابق جہیز کا سامان مہمانوں کو دکھایا جاتا تھا۔ دادا اس سامان سے بہت متاثر نظر آتے تھے۔ کہنے لگے کہ میں نے اپنے علاقے میں اتنا خوبصورت اور قیمتی ساز و سامان کسی کے گھر نہیں دیکھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی شہزادی کا سامان ہو۔ نکاح سے اگلے روز بارات طے پائی تھی۔ اس علاقے کی ایک قدیم رسم کے مطابق بارات لے کر جانے سے پہلے دولہا کو کھلے میدان میں بٹھا کر بلندی سے اس کے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالا جاتا تھا۔ اس کے بعد دولہے گھر جا کر تیار ہوتا اور بارات دلہن کے گھر روانہ ہو جاتی۔ تقدیر کا لکھا دیکھئے کہ جب اس لڑکے کے سر پر پانی ڈالا گیا تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے ہسپتال پہنچایا گیا۔ اس کے دماغ کے ٹیسٹ ہوئے اور پتا چلا کہ اس کے دماغ میں رسولی تھی جو پریشر سے ٹھنڈا پانی پڑنے کی وجہ سے رسنا شروع ہو گئی تھی۔ شام کے وقت وہ ہوش میں آ گیا اور ماں کو نصیحت کی کہ جو بھی ہوا اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہوا۔ میری بیوی کو منحوس نہ کہنا اور اس کی شادی میرے چھوٹے بھائی سے کر دینا۔ اسی رات اس نوجوان کا انتقال ہو گیا۔ جب دادا اس کے جنازے سے واپس آئے تو افسوس سے ہاتھ مل رہے تھے۔ جہاں سے بارات چلنی تھی

اور خوشیوں کے شادیانے بجنے تھے وہاں موت بال کھولے رقص کناں تھی۔ وہیں موت والے گھر میں لوگوں کو ان یتیم بچیوں کا قصہ یاد آیا اور وہ قصہ چلتا ہوا ہمارے گھر تک بھی پہنچا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ نوجوان زندگی کے آخری ہفتوں میں اداس اور کھویا کھویا رہتا تھا۔ اکثر کھیتوں میں نکل جاتا اور گھنٹوں وہیں گھومتا رہتا۔ اس کے کمرے سے اس کی ڈائری بھی ملی جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس کی ماں شادی کے لئے اصرار کرتی ہے لیکن اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کی ماں نے اس کی منکوحہ کے ساتھ کیا سلوک کیا لیکن ایک بات واضح ہے قدرت کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ گناہ گاروں کی رسی کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن جب اس کی پکڑ عبرت ناک ہوتی ہے تو وہ اسی طرح سے اپنی نشانیاں دکھاتا ہے۔

مشکلات کی دو وجوہات اور بھی ہیں یعنی کہ جلد بازی یا سستی۔ اگر ہم اپنے ماضی پر نظر دوڑائیں تو اندازہ ہوگا کہ بہت سی مشکلات انہی دو اسباب کا نتیجہ تھیں۔ اسی لئے امام حسینؑ عالی مقام دعائے عرفہ میں فرماتے ہیں کہ 'جس چیز کو تو نے دیر میں رکھا ہے اس میں جلدی نہ کروں اور جس شے کو مقدم رکھا ہے اس میں تاخیر نہ کروں'۔

اپنی بحث کو ہم اس طرح لپیٹتے ہیں کہ قومیں مشکل حالات سے نپٹ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہیں۔ دوسری جانب سہل پسندی انہیں زوال کی جانب لے جاتی ہے۔ قدیم قوم سبا ہو یا رومن تہذیب، سب ترقی کی بلندی پر پہنچ کر تعیش اور سہل پسندی کا شکار ہوئیں اور آخر کار ذلت کے گہرے گڑھے میں جا گریں۔ جدید دور میں چینی اور جاپانی قوموں کو سخت جان تصور کیا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنی نوجوان نسل کو سخت کوش بننے کی باقاعدہ تربیت دیتے ہیں۔ ان کے سکول اور کالج کے سلیبس میں کئی گھنٹے سخت جسمانی مشقوں کے لئے مختص کیئے جاتے ہیں۔ چین میں اعلیٰ تعلیمی ادارے مفت ہیں۔ طلباء کو ہر طرح کی تعلیمی سہولیات مہیا کی جاتی ہیں۔ لیکن روزمرہ زندگی میں انہیں سخت کوش بنایا جاتا ہے۔ ان پر ہاسٹل میں رہنے کی پابندی ہوتی ہے تاکہ وہ با اصول زندگی کے عادی ہو جائیں۔

4.8۔شرکاء کے انٹرویوز پر تبصرہ

شرکاء کے جوابات کے مطابق روحانیت کی کچھ تعریفیں سامنے آئیں۔

'ہر وہ شے جو ہمیں اللہ تعالیٰ سے ملا دے وہ روحانیت ہے'۔

'ایسا تقویٰ جو ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے ہم اسے روحانیت کا درجہ دیں گے'۔

'روحانیت ایک نور، پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے'۔

'دین اور دنیا میں نیک نیتی اور ہم آہنگی پیدا کرنا اور اپنے فرائض کو ایمانداری کے ساتھ پورا کرنا روحانیت ہے'۔

'اپنی پیدائش کے مقام، خاندان، کمیونٹی کے مقصد کو سمجھنا اور اس مقصد کو پورا کرنا روحانیت کہلاتا ہے'۔

موجودہ دور میں روحانیت کے انحطاط کے بارے میں بات کرتے ہوئے شرکاء نے کہا کہ مادیت پرستی، گھر کے ماحول اور خصوصاً سوشل میڈیا کی وجہ سے روحانیت کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے۔ ہر گھر میں کیبل اور ہر چھوٹے بڑے کے پاس سیل فون آ گیا ہے۔ فلمیں، ناچ گانا اور اخلاقی اقدار سے گرے ہوئے ڈرامے عام ہو گئے ہیں۔ روحانیت نور ہے جبکہ فحاشی نجاست ہے۔ نور اور نجاست یکجا نہیں ہو سکتے۔ ایک اور شریک تحقیق کے مطابق قدرتی وسائل کا ضرورت سے زیادہ استعمال روحانی انحطاط کا باعث بن رہا ہے۔

نوجوانوں کو روحانیت کی جانب راغب کرنے کے لئے شرکاء نے رائے دی کہ انہیں بامقصد زندگی کا تصور دیں۔ انہیں صالح عادات اور اعمال کا ماڈل بن کر دکھائیں۔ پہلے خود عمل کریں اس کے بعد نوجوانوں سے توقع رکھیں کہ وہ اعلیٰ روحانی اقدار کی پاسداری کریں گے۔ ایک اور شریک تحقیق نے خیال ظاہر کیا کہ نوجوانوں کے ساتھ محبت سے پیش آئیں۔ انہیں دین کے بارے میں اپنے شکوک بیان کرنے کا موقع دیں۔ ان کے دلائل تحمل سے سنیں اور ایسے مشورے دیں جن کی وجہ سے ان کے اندر تنقیدی لیکن تعمیراتی سوچ پیدا ہو اور انہیں تجزیہ و تحلیل کی عادت پڑے۔ ایک شریک تحقیق کے خیال کے مطابق بامقصد قصہ گوئی کا احیاء نوجوانوں کو روحانیت کی جانب متوجہ کر سکتا ہے۔

ایک شریک تحقیق نے رزق کے بارے میں بہت خوبصورت بات کی یعنی کہ رزق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ''ایک وہ جو آپ کے پیچھے آتا ہے اور دوسرا وہ جس کے پیچھے آپ بھاگتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ ہمارے حصے کا رزق ہم تک پہنچ کر رہتا ہے۔ لیکن اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ہم رزق کے حصول کے لئے محنت کرنا چھوڑ دیں۔ بلکہ یہ ہے کہ رزق کے حصول میں حلال اور حرام کی پہچان کریں۔ ہمیں ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے کہ جو رزق ہم کھا رہے ہیں کیا وہ ہمارے حصے کا ہے؟ یا ہم کسی اور کا حصہ کھا رہے ہیں۔ اس امر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ ہمارے اپنے کمائے ہوئے رزق میں دوسرے حق داروں کا حصہ بھی ہوتا ہے مثلاً گھر کے افراد، غریب رشتہ دار، آس پاس رہنے والے غریب افراد وغیرہ۔'' ایک مرتبہ مجلس امام حسنؑ میں ایک مولانا صاحب نے بہت خوبصورت بات کی۔ انہوں نے کہا سوشیالوجی کا ایک خوبصورت اصول 80-20 کا تناسب ہے۔ دینی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے جتنا وقت اور مال ہمیں عطا کیا ہوتا ہے اس میں سے اسی (80) فی صد ہماری ضرورتوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔ باقی بیس (20) فی صد چاہے تو ہم بچا لیں، چاہے تو اس میں سے صدقہ، خیرات یا تحفے تحائف دیں۔ اسی طرح سے ہمارے وقت کا اسی (80) فی صد حصہ آرام اور دیگر کاموں کے لئے کافی ہوتا ہے۔ باقی بیس (20) فی صد حصہ ہم آسانی کے ساتھ نیکی کے کاموں میں صرف کر سکتے ہیں۔ دراصل ہماری غیر موثر منصوبہ بندی کی وجہ سے ہمارے پاس نہ تو زائد رقم بچتی ہے اور نہ ہی وقت۔ عیسائی اور یہودی کمیونٹی میں سختی کے ساتھ چندہ دینے کا رواج ہے۔ ان کے پبلک سکول، یونیورسٹیاں اور دوسرے ویلفیئر کے ادارے عوامی چندے کی وجہ سے چلتے ہیں۔ امریکہ کی تمام ریاستوں میں سکولوں کی ایک بڑی تعداد وقف کی ہوئی زمین پر قائم ہے۔

ایک اور شریک تحقیق نے کیا خوب کہا کہ اپنا کام دیانت داری سے کرنے والا روحانی بالیدگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش خدمت ہے۔

ایک عزیزہ بتایا کرتی تھیں کہ ایک مرتبہ وہ خیبر پختون خواہ کے ایک اہم ادارے کے ڈائریکٹر سے ملنے گئیں۔ انہی دنوں دہشت گردی کے کچھ واقعات ہوئے تھے اور چیدہ چیدہ اداروں کی سیکورٹی سخت تھی۔ مین گیٹ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ٹیکسی اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

ان کے ساتھ سامان بھی تھا لہٰذا پیدل چل کر مطلوبہ آفس تک پہنچنا مشکل تھا۔ایک سفید ریش گارڈ گیٹ پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔انہوں نے اسے اپنی مجبوری بتائی حتیٰ کہ منت سماجت تک کی لیکن وہ کسی صورت بھی ٹیکسی اندر بھیجنے پر راضی نہ ہوا۔آخر انہوں نے ڈائریکٹر صاحب کو فون کیا اور اپنی مشکل بتائی۔ڈائریکٹر صاحب نے کہا کہ اس گارڈ سے میری بات کرواؤ۔انہوں نے فون بڑھایا اور کہا کہ فلاں صاحب سے بات کرو۔گارڈ نے فون ہاتھ میں لینے سے بھی انکار کر دیا اور ان صاحب کا نام لے کر کہنے لگا: میں نہیں جانتا وہ کون ہے۔اسے بتادو کہ مجھے حکم ہے کہ ٹیکسی گیٹ سے اندر نہ جانے دوں۔وہ کہتی ہیں کہ اس وقت تو مجھے بہت غصہ آیا۔لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ وہ فرض شناس اور ایماندار انسان تھا۔جب وہ بات کر رہا تھا تو فون آن تھا۔عین ممکن ہے کہ ڈائریکٹر صاحب نے اس کی گفتگو سن لی ہو۔وہ ادارے کے ایک جانے پہچانے اور اہم افسر تھے۔وہ اس کی نوکری پر اثر انداز بھی ہو سکتے تھے لیکن اس نے کسی کی پرواہ نہ کی۔دہشت گردی کے اس دور میں جب آرمی پبلک اسکول پشاور کا خونین واقعہ پیش آیا اور اس کے علاوہ بھی ایسے حالات تھے کہ دن دھاڑے مخلوق خدا کو ذبح کر دیا جاتا تھا۔اس وقت ایسے ہی فرض شناس انسانوں کی ضرورت تھی جو اپنے مقام پر پہاڑ کی طرح ایستادہ رہیں۔دراصل یہی روحانی طاقت ہے جو قوموں کو مشکل حالات سے نکال کر کامیابیوں کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔

پانچواں باب

نوجوانوں کے نام

حرف آخر

موجودہ تحقیق میں ہم نے کوشش کی کہ بدن وروح کے رابطے اور روحانیت کی افادیت کو اجاگر کرسکیں۔ اس موضوع کو واضح کرنے کے لئے فلسفہ، کیفیتی تحقیق، عصبی نفسیات، بائیوسائنس اور قدیم وجدید دینی افکار سے مدد لی گئی۔ گوکہ تحقیقی لحاظ سے روحانیت ایک وسیع میدان ہے لیکن طوالت سے بچنے کے لئے ہم نے موجودہ تحقیق کو چھٹی حس کے اشاروں اور سچے خوابوں تک محدود کردیا۔ ہمارے حواس خمسہ ادراک اور روحانیت کے لئے کھڑکیوں کا کام دیتے ہیں اس لئے ان سے متعلق دو متبادل نظریات یعنی کہ مادی اور روحانی نظریات کا جائزہ لیا گیا۔ ان نظریات پر بحث کے بعد نتیجہ نکالا گیا کہ حواس خمسہ نہ صرف دنیاوی معلومات کے لئے مجرد آلات ہیں بلکہ اپنی ذات کی معرفت حاصل کرکے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا بھی موثر ذریعہ ہیں۔ موجودہ کاوش کے دوران کیفیتی تحقیق کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا یعنی کہ کیس اسٹڈی، بیانیہ حصہ اور انٹرویو۔ تمام حصوں کے نتائج واضح کرتے ہیں کہ روحانیت ایک اعلیٰ انسانی قدر ہے جو رب کریم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ البتہ اس صلاحیت کو صیقل کرنے کے لئے چند آفاقی اصولوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ اصول حقوق اللہ، حقوق العباد اور اخلاق حسنہ کی پاسداری پر مشتمل ہیں۔

علاوہ ازیں اس تحریر میں ہم نے واضح کیا کہ گزشتہ تین یا چار صدیوں کی لادینیت اور مادیت کی بھرمار نے انسان کو روحانی طور پر بیمار کیا۔ بیماری چاہے جسمانی ہو یا ذہنی، فطرت کے خلاف عمل کرنے سے لاحق ہوتی ہے۔ انسان روز ازل سے ہی ہر قسم کے خلاف فطرت امر سے نبرد آزما رہا ہے اور اس کی بقا اسی جنگ کا صلہ ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں سے انسان نے روحانی خلا کو محسوس کیا اور اپنے پس پردہ رفیق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ لیکن شیطانی قوتوں نے بھی اسی رفتار سے مادی لذت میں اضافہ کرنا شروع کردیا۔ البتہ یاد رہے کہ حق وباطل کی جنگ میں فتح کا جھنڈا ہمیشہ حق کے ہاتھ میں رہا ہے۔

مزید برآں اس تحقیق کے دوران ہم نے روح کی تجلیات کا مظاہرہ کیا اور واضح کیا کہ روح کی پہنچ حواس خمسہ اور دوسرے مادی اعضا کے مقابلے میں ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ وہ ماضی اور مستقبل میں یکساں سفر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، عالم بالا کی سیر کرتی ہے اور فرشتوں اور دیگر مقرب ہستیوں سے ملاقات کرتی ہے۔ البتہ موجودہ تحریر میں ہمارا مطمع نظر روح کی غیر معمولی قوتوں کا بیان نہیں بلکہ اصل مقصد دور جدید میں روحانیت کی افادیت کو اجاگر کرنا، اپنے نفس اور روح کو پہچاننا اور اس کے ذریعے اپنے رب کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ ان واقعات کے ذریعے ہمیں سبق ملا کہ روحانی بالیدگی حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ اخلاقی اوصاف اور عادات کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً تزکیہ نفس، عجز وانکساری، اخلاق صالح، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پاسداری۔

ہر دور میں اقدار کی پاسداری اور صالح افکار کو دوسری نسل تک پہنچانے کا ذمہ نوجوانوں کا رہا ہے۔ حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ 'لوگو تمہارے پاس علم ہے اس تک پہنچو، جوانی میں بڑھاپے سے پہلے اور زندگی میں موت سے پہلے' (الکافی)۔

شہید مرتضی مطہری 'Light Within me' میں فرماتے ہیں کہ جوان آدمی آسانی کے ساتھ روحانیت کی راہ اختیار کر سکتا ہے۔ جتنی محنت ہزاروں نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے کی جاتی ہے اتنی ہی ایک عمر رسیدہ شخص پر کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے راہ راست پر آنے کے لئے بڑھاپے کا انتظار مت کرو۔ ذات سے متعلق ہر شے فنا اور خدا سے متعلق ہر شے بقا ہے۔ اپنی جدوجہد اس وقت تک جاری رکھو جب تک کہ اپنے زیریں نفس پر قابو نہ پالو۔ جب تک ہم اللہ کے تفویض کردہ فرائض سرانجام دے رہے ہیں ناکامی کا کوئی تصور نہیں ہے (143)۔ شہید مطہری کے ان زریں الفاظ کے بعد کچھ کہنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس قسم کی تصانیف کی روایات قائم رکھتے ہوئے ہم اکیسویں صدی میں اخلاقیات اور روحانیت کے علم بردار نوجوانوں کے نام چند گزارشات پیش کرتے ہیں:

- اپنی نیت، ارادے اور افعال میں خلوص پیدا کریں یعنی خالص خدا کے لئے کیونکہ روحانی بالیدگی کے لئے اخلاص شرط اول ہے۔
- جب کبھی حالات کے چنگل میں پھنس جائیں تو سب سے پہلے اپنے نظریہ توحید کا

تنقیدی جائزہ لیں۔شاید کہیں کلمہ لا الہ الا اللہ میں کوئی جھول رہ گیا ہو۔روزانہ صبح آنکھ کھلنے پر خلوص نیت کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھنے سے ہی ہمارے نظریہ توحید میں انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔

- بنیادی ارکان دین مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی پابندی کریں۔اگر آپ حج کی استطاعت رکھتے ہوں تو اس عظیم فرض کے ادا کرنے میں ہرگز تاخیر نہ کریں۔ملائیشیا میں شادی کے فوراً بعد میاں بیوی ہنی مون منانے کی بجائے حج کے لئے جاتے ہیں۔
- مشکل حالات سے گھبرانے کی بجائے صبر اور شکر سے کام لیں۔کیونکہ مشکلات ترقی کے نئے مواقع فراہم کرتی ہیں۔وہ ہماری چھپی صلاحیتوں کو نہ صرف ظاہر کرتی ہیں بلکہ مہمیز بھی کرتی ہیں۔
- کثرت سے 'شکر الحمد للہ' کہنے کی عادت ڈالیں۔یہ مختصر کلمہ اگر خلوص، نیک نیتی اور باقاعدگی کے ساتھ ادا کیا جائے تو یہ انسان کی ذہنی حالت بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
- روحانی بالیدگی حاصل کرنے کے لئے اپنے ناپسندیدہ جذبات پر قابو رکھیں۔کیا آپ نے کبھی ابلتے ہوئے دودھ کا مشاہدہ کیا ہے؟ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دودھ اچانک ابل گیا ہو۔لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔دودھ کا ابال اندر ہی اندر اٹھتا رہتا ہے لیکن نظر اس وقت آتا ہے جب ابال مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔یہی مثال انسانی جذبات کی بھی ہے۔یہ عرصہ دراز تک اندر ہی اندر سلگتے رہتے ہیں۔لیکن ان کا اصل ادراک اس وقت ہوتا ہے جب جذبات کا لاوا بے قابو ہو جاتا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ اپنے جذبات کا بروقت تجزیہ و تدارک کریں اور نامناسب جذبات کا فی الفور محاسبہ کریں۔اگر ایسی کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اپنے لئے سزا خود تجویز کریں۔اس سزا پر سختی سے عمل کریں تا کہ نفس کا گھوڑا قابو میں رہ سکے۔اس کے علاوہ استغفر اللہ ربی و اتوب علیہ کثرت سے کہیں۔
- اخلاقی اقدار کا حد درجہ احترام کریں۔اپنی زندگی میں اعلیٰ اخلاقی اقدار قائم کرنے کا باقاعدہ اہتمام کریں۔
- اپنا ہدف پانے کے لئے مستقل مزاج رہیں لیکن اگر بارہا کوششوں کے باوجود بھی کامیاب نہ ہوں تو توقف کریں۔مشیت خداوندی کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے مطابق اپنی

زندگی کا لائحہ عمل تیار کریں۔

- کچھ وقت ایسے مطالعے کے لئے بھی نکالیں جس کا بالواسطہ تعلق آپ کی تعلیم یا پیشے سے نہ ہو۔ یعنی کہ معلومات حاصل کرنے کے لئے یا اپنی دلچسپی کے موضوعات پر مطالعہ۔ ایسے مطالعہ سے وسعت نظر، بذلہ سنجی اور دوسری لطیف حسیات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس وقت ہمارے معاشرے میں لطیف جذبات کی کمی ہے۔
- کوئی بھی کام کرنے سے پہلے چند لمحوں کا توقف کریں اور سوچیں کہ اگر آپ اپنا یہ فعل امام (ع) کے سامنے پیش کریں تو انہیں کیسا محسوس ہوگا؟ اس عمل کی برکت سے آپ کا ذہن خود بخود ہی حلال وحرام اور مستحب ومکروہ کی پہچان کے قابل ہوجائے گا۔
- اس کے باوجود ہماری عرض ہے کہ انسانی طبیعت قدرتی طور پر افقی اور عمودی زاویوں پر زیر و بم کا شکار رہتی ہے۔ افقی اس طرح کہ کسی ایک ہی امر کے بارے میں انسانی جذبات کبھی شدید ہوجاتے ہیں کبھی معتدل اور کبھی کم تر۔ دوسری جانب عمودی یوں کہ انسانی ذہن مختلف جذبات کے درمیان جھولتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ کبھی مادی ضروریات کی جانب جھکتا ہے تو کبھی روحانی جذبات کی جانب۔ یہ ایک قدرتی امر ہے البتہ ہمیں اچھے اور برے اعمال کے وزن کا اندازہ ہونا چاہیئے تاکہ گناہان کبیرہ سے بچیں اور بڑے ہول والے دن میں قائم ہونے والے میزان کے لئے اپنے نفس کو تیار کرسکیں۔

آخر میں ہم عرض کریں گے کہ ہر دروازے کی ایک کنجی ہوتی ہے۔ پاک و پاکیزہ رب العزت تک پہچانے والی روحانیت کی کنجی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پاسداری اور اخلاق حسنہ ہے۔ یہ موضوع ایک عظیم الشان سمندر کی طرح ہے۔ گو کہ اس مختصر کاوش میں ہم اس کے چند قطرے ہی چن پائے ہیں لیکن اس موضوع پر اس سے پہلے بھی لازوال کاوشیں سامنے آتی رہی ہیں اور آئندہ بھی یہ کوشش جاری رہے گی۔ تاکہ باطل کی پھیلائی دھند میں حق کے دیئے روشن رکھنے کی کاوش تا قیامت جاری رہے۔

ضمیمہ جات

(حصہ اول)

ضمیمہ اول

روحانیت پر تحقیق و تصنیف کے بعد ہم اپنی کوتاہ نظری کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے ایک بھرپور زندگی گزاری، خدا کی مخلوق سے محبت اور رواداری کا سلوک کیا، غریبوں اور محتاجوں کی حتیٰ الامکان مدد کی لیکن مخلوق خدا، حتیٰ کہ قریبی دوستوں اور قرابت داروں کی اندرونی اصلیت سے بے خبر رہے۔ موجودہ دور کے افسانوں اور دوسرے واقعات میں انسانوں کے اندر چھپی برائیوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان کی اندرونی روشنی کا تذکرہ کم تر ہے۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس تحقیق کے دوران ہم نے خدا کی بہترین تخلیق حضرت انسان کے روشن تر پہلو دیکھے اور اس کے بندوں کی اندرونی پاکیزگی کو مزید اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس تحقیق نے موجودہ دور کے انسان کے بارے میں ہمارے خیالات میں انقلاب برپا کر دیا۔ ہمارا پیغام ہے کہ موجودہ دور کا انسان دیدِ بینا رکھتا ہے اس کی نیت صاف، ارادہ مضبوط، زندگی با مقصد اور آفاقی سچائیوں سے قریب تر ہے۔ میں ابھی تک درون خانہ خامیوں سے واقفیت رکھتی تھی لیکن روح کی نورانی تجلیات سے ناواقف تھی۔ اس کاوش نے میری سوچوں کا دھارا بے ظرف سے باظرف انسان کی جانب موڑ دیا۔ ہمیں اعتراف کر لینے دیجئے کہ ماضی کے دریچوں سے جھانکتے بہت سے غریب، لاچار، بیمار اور فالج زدہ لوگ یاد آئے۔ روزگار کی چکی میں پستے ہوئے، پسینے سے شرابور، ہاتھ، بال، چہرے اور جوتے گرد آلود، ان میں سے چند لنگڑا کر چلتے تھے، کچھ لکنت زدہ، اور کچھ آنکھوں سے اندھے یا کانوں سے بہرے تھے۔ لیکن پاک پروردگار کی وہی لازوال تخلیق، خوبصورت آنکھیں اور چمکتی پیشانیاں، قانع ابرو اور پرسوز آواز اور سب سے بڑھ کر خوبصورت روح بھی رکھتے تھے۔ نہ جانے ان میں سے کون روحانیت کے کس درجے پر فائز تھا اور اپنے رب سے کتنا قریب تھا۔ کاش کہ ان میں سے چند کے قریب بیٹھنے اور ان کی اندرونی کیفیات سننے کا موقع ملا ہوتا۔

اس مقام پر ہمیں بلال حبشی یاد آ گئے۔ ذات کے حبشی، پیشے کے لحاظ سے غلام، رنگت

آبنوسی، زبان لکنت زدہ، جو کہ گھمنڈی اور زبان دانی کے ماہر عربوں کے لئے ناقابل قبول تھی۔
لیکن اس پیکر عشق کو جب اذان فجر سے روکا گیا تو ان کے دل کا اضطراب افلاقی اجسام سے ٹکراتا ہوا عرش خداوندی تک جا پہنچا۔ آفتاب نے انسانوں کی کٹ حجتی سے شرما کر اپنا چہرہ چھپا لیا اور طلوع فجر اذان بلال کے انتظار میں معطل ہوگئی۔ تاریخ نے یہ واقعہ من و عن لکھ ڈالا۔ ہم نے پڑھ لیا اور محیر العقل معجزات کے بیان میں بیان کر دیا۔ لیکن کیا یہ معاملہ یہیں اختتام پذیر ہو جاتا ہے؟ نہیں۔ بات صرف اتنی سی نہیں ہے۔ یہ معاملہ اٹوٹ آفاقی، طبیعیاتی اور فلکیاتی اصولوں کا ہے۔ آیئے اس واقعے کا ہلکا سا جائزہ لیتے ہیں اور باقی معاملات کو مستقبل کے سائنس دانوں اور محققین کے لئے ایک عظیم سوالیہ نشان کے طور پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے اس روز سر زمین حجاز پر طلوع فجر میں کتنی تاخیر ہوئی۔ لیکن عقل انگشت بدندان ہے کہ اس وقفے میں اپنے مدار کے گرد گھومتی زمین کی حرکت کا کیا بنا؟ کیا وہ ایک مقام پر کھڑی صوت بلال کا انتظار کرتی رہی؟ اگر اس کا جواب ہاں میں ہے تو کیا معطل ہونے اور دوبارہ حرکت کرنے سے اس کے عظیم وجود کو جھٹکا لگا؟ کیا جھٹکا یا جھٹکے محسوس کئے گئے؟ کیا اس سکوت اور اس کے بعد حرکت کی وجہ سے حرکت کی تراکیب میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی؟ اور اسی طرز کے بہت سے دوسرے سوالات۔
یہاں پر اس بات پر بھی غور کر لیجئے کہ اس آفاقی واقعہ کا بنیادی کردار کون تھا؟ کیا وہ کوئی خدا کا پیغمبر تھا؟ نہیں۔ وہ گہرے رنگ کے حبشی لکنت زدہ غلام بلال کی مضطرب روح تھی جس نے اجسام فلکی کی رگ جاں پہ ہاتھ ڈالا۔

یہاں سے روح کی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں پر کچھ اور جرات مندانہ لیکن عقلی سوالات بھی ابھرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے حضرت علیؑ کو کسی کام سے بھیجا۔ وہ عصر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا نہ کر سکے۔ جب واپس آئے تو حضور نے ان کی گود میں سر رکھا۔ اس کے ساتھ ہی ان پر وحی نازل ہونا شروع ہوگئی۔ اسی اثنا میں نماز کا وقت جاتا رہا۔ حضرت علیؑ کے دلی اضطراب کی بنا پر حضورؐ متوجہ ہوئے اور اپنی انگشت مبارک کے اشارے سے سورج کو پلٹا دیا۔ یوں حضرت علیؑ نے وقت پر نماز ادا کی۔ یہ واقعہ معمولی سی ردوبدل کے ساتھ شیعہ اور اہل سنت حضرات کی کتابوں میں موجود ہے۔ اکثر اوقات یہ واقعہ محفلوں میں بیان کیا

جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے انگشت مبارک کے اشارے سے سورج کا پلٹنا ہی عام انسان کی سانس روکنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن چونکہ ہم حضوؐر کے روحانی درجات سے واقفیت رکھتے ہیں اس وجہ سے یہ واقعہ ہمیں حیرانی میں مبتلا نہیں کرتا۔ لیکن غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس واقعے میں اور بھی اسرار و رموز چھپے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا یہ واقعہ یہیں پر انجام پذیر ہو جاتا ہے؟ نہیں۔ یہاں سے تو کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ عشق و روح کی کہانی، تعلیم و تحقیق کی دعوت دیتی ہوئی اور بہت سے سوال اٹھاتی کہانی۔ مثلاً یہ کہ اس آفاقی واقعے کا مظاہرہ کس کس نے کیا؟ کیا یہ واقعہ حجاز کے باہر بھی دیکھا گیا؟ سورج ایک آفاقی حقیقت ہے لہٰذا اس واقعے کا اثر تمام دنیا پر پڑا۔ بالفرض اگر ہم تصور کر لیں کہ یہ ایک مقامی واقعہ تھا تو خدانخواستہ اس کا مطلب ہوا فقط نظر کا دھوکہ۔ نظر کا دھوکہ جادو ہوتا ہے معجزہ نہیں۔ معجزہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو امر ربی سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت یہودی اور عیسائی دینی ادارے فلکیاتی علوم کے عروج پر تھے۔ علاوہ ازیں سرزمین ہندوستان علم فلکیات کا منبع تھی۔ اگر ایک آفاقی واقعہ پیش آیا تو یقیناً اس کا نظارہ بھی کیا گیا اور جب نظارہ کیا گیا تو بیان بھی کیا گیا اور اگر بیان کیا گیا تو کسی نہ کسی مقام پر وہ بیان محفوظ بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے تحقیق کرنے والوں کے لئے شواہد محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ بندہ مسلم کو صرف کمر باندھنے کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ کچھ اور سوال بھی ذہن میں آتے ہیں۔ کیا سورج پلٹنے کا مطلب ہے کہ زمین اپنے مدار پر الٹا گھومی؟ کیا اس حرکت کا مطلب یہ ہے کہ زمین کے مغرب اور مشرق میں کچھ فرق آیا؟ کیا زمین کا الٹے رخ پر پلٹنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی کشش ثقل اور اس سے متصل اشیا مثلاً سمندر، چشمے اور دریاؤں کے بہاؤ اور ان کے رخ میں کوئی فرق آیا؟ اٹھارہویں صدی کے مشہور فلاسفر ہیوم نے اسی لئے معجزے کا انکار کیا کیونکہ اس کے زمانے میں چاند اور سورج کے پلٹنے کو سائنس کے لحاظ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن آج فلکی اور دوسری سائنسی تحقیقات کی بنا پر ہیوم اور دوسرے لادین نظریات کا پانسہ پلٹا جا سکتا ہے۔ یہ قصہ بالکل ایسا ہے جیسے ہیمفرے (1(xvii)) نے اٹھارہویں صدی میں رائل کو سفارشات پیش کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان اپنی تاریخ اور تہذیب پر بہت نازاں ہیں۔ لہٰذا ان کے علاقوں میں علم آثار قدیمہ کی شاخیں

مضبوط کی جائیں۔ نئے آثار کی کھدائی کر کے گم گشتہ تہذیبوں کے نشان ڈھونڈے جائیں تا کہ مسلمانوں کا غرور توڑا جا سکے۔ مزید یہ کہ ان کا دھیان غیر اسلامی تہذیبوں کی جانب بٹ جائے اور وہ بنیادی اصولوں سے روگردانی برتنے لگیں۔ گو کہ اسے اسلامی علوم پر دسترس حاصل تھی لیکن نیک نیتی کے فقدان کی وجہ سے اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ وہ بھول گیا کہ ان گم گشتہ تہذیبوں کا ذکر پہلے ہی قرآن پاک، حدیث نبوی اور دیگر اقوال میں موجود ہے۔ لہٰذا خدا کی جتنی نشانیاں آثار قدیمہ کے ذریعے واضح ہوئیں اتنی اور کسی علم کے ذریعے نہیں ہوئیں۔ زمین کی گہرائیوں میں چھپی تہذیبوں کا تو ذکر ہی کیا اسلامی علوم کی رسائی تو کائنات کی وسعتوں میں پھیلی دوسری مخلوقات تک بھی ہے۔ جیسے کہ احادیث اور دیگر اقوال میں تو زمین کے علاوہ دیگر سیاروں میں آباد مخلوقات کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

یہاں پر ہمیں قرآن پاک کی وہ آیات یاد آتی ہیں جن میں مشرق ومغرب، مشرقین اور مغربین، مشارق ومغارب کی تمثیلات بیان کی گئی ہیں۔ کیا یہ تمثیلات دعوت فکر نہیں؟ فقہاء دین نے بارہا ان تمثیلات کی روحانی وضاحتیں پیش کیں۔ لیکن میرا ذہن کہتا ہے کہ وہ تمثیلات ایک سے زیادہ مرتبہ مشرق ومغرب کے اپنے مقام سے کھسکنے کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ میں ایک عام سی محقق ہوں جو فقہی اور شرعی باریکیوں سے واقف نہیں۔ یہاں میں مراجع دین سے سوال کرنے کی جسارت کرتی ہوں کہ آیا آج کے ترقی یافتہ دور میں ان سوالوں کے جوابات ڈھونڈے جا سکتے ہیں؟ یا ہمیں اس رہبر کامل کا انتظار کرنا چاہیے جو طبیعیاتی اور غیر طبیعیاتی علوم کے ماہر ہیں اور جن کے علمی، عقلی اور روحانی اداروں میں طلبا ہمہ وقت تحقیق میں مصروف رہیں گے۔

ہمفرے کی یادداشتوں کے نام سے یہ کتاب 1980ء کی دہائی میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے عوام میں مقبول ہو گئی۔ البتہ آج یہ...... کتاب ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں میں تفرقے کو ہوا دینے b کے لئے لکھی گئی۔

ضمیمہ دوم

موجودہ تحقیق کا آخری حصہ انعکاس سوچ (Reflective thought) پر مشتمل تھا لیکن اس حصے کے بہت کم جوابات موصول ہوئے۔

اس سلسلے میں ش 8 نے کہا کہ اس ریسرچ میں حصہ لینے کی وجہ سے مجھے اپنی گزشتہ زندگی پر غور و فکر کا موقع ملا۔ اس طرح میرے اوپر انکشاف ہوا کہ میں نے ہمیشہ مشکل حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنی زندگی کو بہتر بنایا۔ ماضی کے مقابلے میں آج میں بہت بہتر حالات میں ہوں۔ اگر انتہائی دگرگوں حالات میں میں نے سپر نہیں ڈالی تو آج میں اپنی زندگی کو بہترین طرز پر گزار سکتی ہوں۔

ش 7 نے کہا کہ میرا رجازن ہمیشہ سے روحانیت کی جانب تھا۔ اس کے بعد ایک دور ایسا آیا کہ میرا رجحان بدل گیا۔ البتہ میں نے کبھی اس امر پر توجہ نہیں دی۔ اس تحقیق میں حصہ لینے کے بعد میرے اوپر انکشاف ہوا کہ شادی سے پہلے میں غور و فکر زیادہ کیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ تعلیم کے سلسلے میں سفر کرتی تھی اور اس دوران تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتی تھی۔ گھر کے کاموں کے دوران بھی میرے ہونٹ ذکر اذکار میں مصروف رہتے تھے۔ وہ شاید عبادت کی کرامات تھیں کہ میری چھٹی حس تیز تھی اور مجھے سچے خواب بھی بہت آیا کرتے تھے۔ شادی کے بعد ایک تو میں بچوں میں مصروف ہوگئی لیکن بچوں سے زیادہ ڈیجیٹل فون نے مجھے مصروف کر دیا ہے۔ ہر وقت موبائل ہاتھ میں رہتا ہے اور میں اس پر کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔ اس تحقیق میں حصہ لینے کے بعد میں نے تہیہ کیا ہے کہ دوبارہ سے عبادات کا اہتمام کروں گی، تا کہ اپنی کھوئی ہوئی صلاحیتوں کو واپس لا سکوں۔

ش 14 نے کہا کہ مجھے ہمیشہ سے روحانیت سے دلچسپی تھی لیکن اس سلسلے میں دوسروں سے بات کرتے ہوئے جھجھک محسوس ہوتی تھی۔ اس تحقیق میں حصہ لینے کے بعد وہ جھجھک ختم ہوگئی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اب رفقا اور طالبات سے اس سلسلے میں بات کروں گی تا کہ وہ بھی روحانیت کی

کرامات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

دو شرکاء تحقیق نے انعکاس کے علاوہ اس تحقیق کی کرامات کا بھی ذکر کیا۔ ان میں پہلی شریکہ نے حصہ اول اور دوسری نے حصہ دوم میں معاونین کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔

ش 9 نے کہا کہ اس تحقیق کے لئے کام کرتے ہوئے ایک عجیب خوشگوار سا احساس ہوا۔ ہر وقت ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے یہ کام کر رہے ہوں اور ہمارا شوق اس کام کے لئے اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس تحقیق کی برکت سے میرے بہت سے مسائل حل ہو گئے۔

ایک اور شریکہ تحقیق نے کہا کہ اس تحقیق میں حصہ لینے کے فوراً بعد میری بیٹی کی شادی طے ہوئی اور کچھ ہی دنوں میں اس کی رخصتی بھی ہو گئی۔ یہ میرے کمزور عقائد نہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ اس تحقیق کی برکات کی وجہ سے ہوا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مصنفین کو بھی اس تحقیق کی کرامات محسوس ہوئیں۔ اول تو یہ خیالات اس تواتر سے ذہن میں آتے اور کاغذ پر منتقل ہوتے جاتے جیسے بارش کے قطرے زمین پر گرتے ہیں۔ مہینوں کا کام ہفتوں میں اور ہفتوں کا دنوں میں طے پا تا گیا۔ اس کے علاوہ کثرت سے مرحومین کو خواب میں دیکھا گیا۔ بلکہ ایک شریک تحقیق نے بھی بیان دیا کہ اس کے مرحوم والد نے خواب میں آ کر اس تحقیق میں حصہ لینے کا اشارہ دیا۔ الحمدللہ رب العالمین

حصہ دوم: مجالس امام حسینؑ

پہلا باب

تعارف

بعد از ثناء خدائے بزرگ و برتر اور درود بر محمدؐ و آل محمدؐ۔ عرض خدمت ہے کہ مجالس امام حسینؑ پر لکھی جانے والی یہ مختصر تحریر ایک قصہ عشق اور ایک ادنیٰ ترانہ سرمستی و آ گاہی ہے۔ ہم نے اپنے مختصر عرصہ حیات میں کرہ ارض کے جس حصے کی بھی مسافرت اختیار کی چاہے وہ سمندر ہو یا بیاباں، سربلند پہاڑ ہوں یا گہری وادیاں، مرغزار ہوں یا سبزہ زار یا پھر آسماں کی بیکراں وسعتیں ہمیں ہوا کے ہر ذرے، ہر لہر اور ہر شعاع پر اسم عشق لکھا نظر آیا اور اس اسم اعظم کے لفظ پر نام حسینؑ کی سنہری مہر کندہ تھی۔ اس کے علاوہ جہاں بھی کسی سچے عاشق حسینؑ سے ملاقات ہوئی تو دل پکار اٹھا کہ یہی تو ہیں جن کے دم سے زمانے میں برکت پائی جاتی ہے۔ ہمیں کہہ لینے دیجئے کہ مؤمنین ان سربلند پہاڑیوں کی طرح ہیں جن کے سینوں میں نایاب موتی پنہاں ہوں، ہدایت کے سرچشمے ان کے سینوں سے پھوٹتے ہوں اور دھرتی کو سیراب کرتے ہوں، ان کا درود و سلام رحمت کے فرشتوں کے نزول کا باعث بنتا ہو، ان کا گریہ زہریلی فضا کو صاف کرتا ہو۔ وہ زمین کے سینے پر گڑھی ان کیلوں کی طرح ہوں جو صدیوں سے نامساعد حالات کے باوجود زمین کا توازن برقرار رکھے ہوئے ہوں، اگر وہ نہ ہوتے تو زمین کائنات کی بے کراں وسعتوں میں روئی کے گالوں کی طرح اڑتی ہوئی نظر آتی۔

ان انمول مؤمنین کو تعلیم اور تربیت دینے والی درس گاہ کا نام مجالس امام حسینؑ ہے جو بذات خود معجزات الٰہی کا درجہ رکھتی ہیں۔ چودہ صدیوں سے ان گنت تکالیف اور مصائب جھیلنے کے باوجود بھی پرسہ و گریہ امام حسینؑ نہ رکا اور نہ ہی کبھی رکے گا ان شاء اللہ۔ مجالس امام حسینؑ کو جس قدر روکنے کی کوشش کی گئی ان کی روئیدگی میں اضافہ ہوا۔ مجالس امام حسینؑ روشنی کا وہ مینار ہیں جو اندھیری راتوں میں دین کے سفینے کو بھٹکنے سے بچاتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام 'مذہب محبت' ہے۔ شیعیت حسینیت ہے اور حسینیت عشق کی اعلیٰ ترین منزل کا نام ہے۔ سرزمین کربلا وہ واحد مقام ہے جہاں پر شیطان کو داخلے کی جرات نہ ہوئی۔ پیغمبروں سے لے کر اولیاء اور اوصیاء تک اس لعین نے ہر دروازے پر دستک دی لیکن معاملہ جب کربلا کا آیا تو اسے احساس ہوا کہ اس

وادی عشق میں اس کا داخلہ منع ہے۔ کربلا کی کہانی کا ہر کردار، چاہے وہ شیر خوار ہو پیر بزرگ، مخدرات خیمہ ہوں یا بہادر جنگجو، مسلمان ہوں یا غیر مسلم، آقا یا غلام، اول تا آخر سب کے سب جذبہ عشق سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ہم ہر اہل فکر کو چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہتا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، اس کا تعلق کسی بھی مذہب یا ثقافت سے کیوں نہ ہو مجلس حسینؑ میں حاضری کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر کسی کے دل میں ایک ذرہ برابر بھی الوہی روشنی باقی رہ گئی ہو تو اس محفل عشق کا افتتاحیہ ہی اس کی روح کا ہر تار جھنجھوڑنے کے لئے کافی ہوگا۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ امام بارگاہیں جنت ارضی کے وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جہاں نعمات خداوندی بٹتی ہیں۔ یہ مجالس زندگی سے بھرپور ایک ایسے شجر کی مانند ہیں جس کی جڑیں اپنی اصل سے وابستہ ہوں لیکن اس کی شاخیں ہر مہینے، ہر سال اور ہر صدی نئی کونپلیں، پھل اور پھول لاتی ہوں۔ مزید یہ کہ وہ آسمانوں کی جانب پرواز کرتی ہوں یہاں تک کہ ظہور صاحب الامر عجل اللہ فرجہ کو چھولیں۔ قرون اولیٰ سے لے کر آج تک مجالس امام حسین ؟ کے بارے میں جس قدر لکھا گیا اور جتنی متنوع زبانوں میں لکھا گیا شاید ہی کسی اور موضوع پر لکھا گیا ہو۔ یہاں تک کہ مجالس امام حسینؑ سے نظم اور نثر کی کئی ایک علاقائی، قومی اور بین الاقوامی شاخوں نے جنم لیا لیکن وہ تحریریں بیرونی عامل کے طور پر لکھی گئیں۔ بیرونی عامل سے ہماری مراد یہ ہے کہ مؤمنین کو بتایا گیا کہ توحید و رسالت پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ فروع دین کیا ہیں اور ان کا بجالانا کیوں ضروری ہے؟ یا یہ کہ مجالس امام حسینؑ کے کیا فوائد ہیں؟ گو کہ ایسے بحث و مباحث اور تحریریں مذہبی اعتقادات کی شہ رگ ہوتی ہیں، لیکن ہمارے ہاں ایسی انفرادی، اندرونی اور کیفیتی تحریروں کی شدت سے کمی پائی جاتی ہے جو واضح کریں کہ یہ اعتقادات و اعمال انسانوں کے اندر کیا تبدیلی لاتے ہیں اور ان کی اندرونی دنیا میں کیا انقلاب برپا کرتے ہیں؟ تحریریں تو رہیں ایک جانب ایسی محافل کا بھی فقدان ہے جہاں مؤمنین و مؤمنات، خصوصاً نوجوان طبقہ اپنی کیفیات کا اظہار کر سکے یا اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کا جواب پا سکے۔ اس فقدان کا نتیجہ سوشل میڈیا سے قربت کی صورت میں نکلتا ہے جہاں شیعہ نوجوان اپنی اپنی سائٹ بنا لیتے ہیں اور بغیر کسی مناسب رہنمائی کے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوانوں کو بزرگوں کی رہنمائی میں ایسا فورم مہیا کیا جائے جہاں

سے وہ اپنے جذبات کا با مقصد اظہار کر سکیں۔ ہر عاشق حسینؑ اور ہر مجلس کی اپنی ایک الگ کہانی ہوتی ہے۔ ہر سوگوار محافل امام حسینؑ سے ایک نیا نگینہ، روحانی تجربہ، سبق، عہد یا تجدید عہد اور ایک نئی صلاحیت لے کر اٹھتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات تو وہ مجالس امام حسینؑ میں بیٹھ کر عالم ارواح میں کئے جانے والے اور اپنی جنین میں پنہاں عہد کی تجدید بھی کرتا ہے۔ مجالس امام حسینؑ کا تبرک، نذر و نیاز، فضا میں موجود نورانی مخلوقات، آفاقی لہروں کا اژدہام، پاکیزہ ہستیوں کے اذکار، گریہ اور دعا بے شمار اثرات کا حامل ہے۔ گویا کہ ہم ہر مجلس حسینؑ سے مادی اور روحانی فوائد کی ایک گٹھڑی باندھ کر لاتے ہیں۔ ہم یہاں یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ جس طرح خزانے کی فہرست بنانا ضروری ہوتی ہے اسی طرح سے ان کیفیات و تجربات کا شعوری اعتراف اور اس انمول ریکارڈ کو باقائدہ دائرہ تحریر میں لانا بہت ضروری ہے۔ اگر ہم صرف چند حسینی یا مجلسی تجربات بھی ضابطہ تحریر میں لاتے رہیں ہم آگاہی کی ایک نئی منزل کو چھو لیں گے۔ ان شاء اللہ۔

موجودہ تصنیف کے اس مختصر تعارف کے بعد ہم مجالس امام حسینؑ کے نام سے لکھی جانے والی اس تحریر کے مقاصد بیان کرتے ہیں:

1. دور حاضر میں برپا کی جانے والی مجالس امام حسینؑ کے فوائد اور اثرات کو واضح کرنا۔

2. دور حاضر کی مجالس کی چند ارتقائی مثالوں کو ضابطہ تحریر میں لانا۔

3. دور حاضر کے چند مولائیوں کے سبق آموز واقعات ضابطہ تحریر میں لانا۔

4. مجالس امام حسینؑ کے بارے میں دور حاضر کے مؤمنین کی اندرون خانہ کیفیات اور جذبات کو ضابطہ تحریر میں لانا۔

اس تصنیف کے حصہ اول کی طرح حصہ دوم کو بھی شراکتی اور کیفیتی طرز پر تشکیل دیا گیا۔ البتہ حصہ دوم کے مخصوص تقاضوں کے مطابق نئے شرکاء کا انتخاب کیا گیا اور انہیں نئے کوڈ دیئے گئے، مثلاً م 1، م 2، م 3 وغیرہ۔ شرکاء میں عورت، مرد اور نو یا دس سال سے لے کر عمر رسیدہ ہر قسم کے شیعہ افراد شامل تھے۔ اس کے علاوہ شرکاء میں نسل در نسل شیعہ افراد اور غیر شیعہ سے شیعہ ہونے والے افراد بھی شامل تھے۔ نسل در نسل شیعہ افراد میں ایک خاص قسم کی استقامت، اور دوسرے مکاتب فکر سے شیعہ فقہ میں داخل ہونے والے افراد میں ایک انوکھا جوش و جذبہ پایا جاتا

تھا۔ اس تحقیق کے اولین خاکے میں کم سن بچوں کو شرکاء کے طور پر شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بعدازاں بچوں کی درخواست پر انہیں تحقیق میں شمولیت کا موقع دیا گیا۔ جوابات سے واضح ہوتا ہے کہ حسینی مقاصد کے سلسلے میں بچوں اور نوجوانوں کا جزیہ قابل تحسین تھا۔

مجالس امام حسینؑ کے نام سے پیش کی جانے والی اس تحقیق کا پہلا حصہ کیس اسٹڈی اور بیانیہ ہے۔ اس حصے میں شرکاء کو آزادی دی گئی کہ وہ اپنے علاقے کی مجالس کی ارتقائی تاریخ بیان کریں یا دوسرے عزاداران حسینؑ کے غیر معمولی واقعات بیان کریں۔ غیر معمولی سے ہماری مراد امام حسینؑ کی محبت میں ڈوب کر امر ہو جانے والے ایسے افراد ہیں جنہوں نے دوسروں کے دلوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہوں۔ اس سلسلے میں ہمیں مفید معلومات اور دلچسپ کیس اسٹڈی (ز) موصول ہوئیں۔

مجالس امام حسینؑ کے دوسرے حصے میں شرکاء سے مجالس کے فوائد، اثرات اور مستقبل کے بارے میں لائحہ عمل تیار کرنے کے بارے میں سوال کیے گئے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل سوالات پوچھے گئے۔

- آپ کو مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے کے کیا روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ مثال دے کر واضح کریں۔
- آپ کو مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے کے کیا جسمانی فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ (مثال)
- آپ کو مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے کے کیا دنیاوی فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ (مثال)۔
- فرض کیجئے کہ کربلا کل واقع ہو رہی ہے۔ آپ کے پاس فیصلہ کرنے کے لئے صرف ایک رات ہے۔ آپ یہ بھی جانتے / جانتی ہیں کہ اس میدان جانکاہ میں موت کے سوا کچھ نہیں۔ اس صورت میں آپ کا فیصلہ کیا ہوگا؟

مجلس پڑھنے اور اپنے گھروں میں مجالس برپا کرنے والے مؤمنین سے درخواست کی گئی کہ وہ مجلس امام حسینؑ پڑھنے اور برپا کرنے کے فوائد بیان کریں۔ اسی طرح سے حوزہ علمیہ قم،

ایران میں قیام پذیر مؤمنین سے درخواست کی گئی کہ وہ روضہ بی بی معصومہ قمؑ پر حاضری کے فوائد بیان کریں۔حق تو یہ تھا کہ مجالس امام حسینؑ کے لئے 'فوائد' کی جگہ 'کرامات اور تجلیات' کے الفاظ استعمال جاتے۔البتہ یہ کتاب مسلم اور غیر مسلم قارئین کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔لہٰذا کوشش کی گئی کہ سادہ اور عام فہم اصطلاحات استعمال کی جائیں۔اس کے علاوہ عزاداران حسینؑ کی اعلیٰ روحانی سطح کے مقابلے میں تحقیقی سوالات آسان اور سادہ تھے۔اس کے باوجود تمام شرکاء نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذاتی کیفیات اور تجربات پر سیر حاصل گفتگو کی۔سوالات کے اس سلسلے میں پہلے تین سوال جمالی اور آخری جلالی تھا۔شرکاء کو حق دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو کسی بھی سوال کا جواب حذف کر دیں۔تمام سوالوں کا مقصد ارتکاز، انعکاس، اجتماع اور لائحہ عمل تھا۔ارتکاز سے ہماری مراد شرکاء کی انفرادی سوچ کا ایک نقطے (مجالس امام حسینؑ کے فوائد) پر اکٹھا کرنا ہے۔اجتماع سے مراد تمام شرکاء کے جوابات سے ایک جیسے نقاط اخذ کرنا ہے۔انعکاس سے مراد اپنے افکار و اعمال پر غور و فکر کرنا ہے اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل تیار کرنا ہے۔

ہمارا مطمع نظر یہ ہے کہ آج کے مصروف دور میں ہم مجالس امام حسینؑ سنتے، سمجھتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔لیکن مجالس امام حسینؑ کی وجہ سے اپنے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں پر غور کرنے کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے۔آپ کسی بھی مجلس میں جا کر بیٹھ جائیے یا شیعہ مکتب فکر کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو مجالس امام حسینؑ کے فوائد، فیوض اور برکات پر لاتعداد موضوعات ملیں گے، لیکن وہ مجالس مؤمنین و مؤمنات کے دلوں پر کیسے وارد ہوئیں؟ یا ان مجالس میں شرکت کی وجہ سے ان کے حالات میں کیا تبدیلی واقع ہوئی؟ ان امور پر کوئی تبصرہ نہیں ملے گا۔یہ مثال بالکل اس طرح ہے جیسے ایک ڈاکٹر بیماری کی تشخیص کر کے دوا تجویز کر دیتا ہے اور اس دوا کے فوائد بھی سمجھا دیتا ہے لیکن جب تک مریض وہ دوا استعمال نہیں کرتا اور اس کے فوائد کو محسوس نہیں کرتا تو وہ دوا اسے فائدہ نہیں پہنچاتی۔انہی وجوہ کی بنا پر مجالس امام حسینؑ کے فوائد پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔

کیفیتی تحقیق چاہے سروے پر مبنی ہو یا انٹرویوز پر وہ شرکاء کی خود شناسی کا باعث بنتی ہے۔اندرونی جذبات کے مناسب اظہار سے انسان اپنی چھپی صلاحیتوں کو جاننے اور نئے لائحہ عمل تیار

کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ سوچ اور عمل کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ انفرادی خودشناسی مسیں ہی قوموں کی ترقی کا راز چھپا ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ یہی عمل خداشناسی کے لئے اولین زینے کا کام دیتا ہے۔ الحمدللہ کہ ہمارے پاس مجالس امام حسینؑ جیسا مؤثر ادارہ موجود ہے۔ یہ مجالس نہ صرف انفرادی بلکہ قومی خودشناسی کی بھی امین ہیں۔ شیعہ ایک قوم ہیں اور قوموں کی بقا اور ترقی کے لئے خود شناسی بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ مغربی اقوام نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی قومی ترقی کی بنیاد ذاتی اور قومی شناخت کی بنیاد پر رکھی۔ لیکن مغربی اور حسینی خودشناسی میں چند اہم فرق پائے جاتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مشہور امریکی نفسیات دان ابراہم میسلو نے مایوس انسانیت کی بہبود کے لئے انسانی ضروریات کی درجہ بندی کا نظریہ پیش کیا۔ اس درجہ بندی میں جسمانی، تحفظ، محبت، عزت وتکریم اور خودشناسی کی ضروریات کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس نے ان ضروریات کی ایک تکونی شکل ترویج کی۔ اس تکون میں اس نے خوراک کی ضرورت کو اولین لیکن زیریں سطح پر اور خودشناسی کو سب سے بلند مقام پر جگہ دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر انسان کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہیں تو وہ بتدریج خودشناسی کی بالائی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ انسانی معاشرے کے عام فہم مشاہدات کے مطابق یہ نظریہ درست سہی لیکن مجالس امام حسینؑ میں یہی اصول الٹ جاتا ہے۔ یعنی کہ مجالس امام حسینؑ کا سب سے پہلا عطیہ ہی خودشناسی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے اگر ایک شخص اپنے آپ کو نہیں پہچانتا تو وہ اپنی اخلاقی اور روحانی ضروریات کا ادراک کس طرح کرے گا؟ خود شناسی کے ذریعے ایک شخص اپنے رب، اپنی روح، چھپی ہوئی صلاحیتوں اور علتوں کو درک کر سکتا ہے۔ حضرت علیؑ کا فرمان ہے کہ جس نے خود کو پہچانا وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے خود کو نہ جانا وہ غفلت کے گڑھے میں جا گرا۔ یا یہ کہ جو خود کو جانتا ہے وہ خوف خدا میں مبتلا رہتا ہے'[1]۔

مجالس امام حسینؑ خودشناسی سے لے کر خداشناسی کا بہترین زینہ ہیں۔ لیکن زمانے کی تیزی اور مکاری اس راہ کو دھندلا کر دیتی ہے۔ لہٰذا معصیت سے بچنے کے لئے ہمیں شعوری طور پر مجالس امام حسینؑ سے حاصل ہونے والی نعمتوں کو سمجھنے اور انعکاس سوچ کے عملی طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں غور کرنا ہوگا کہ مجلس امام حسینؑ میں شرکت کرنے سے ہم نے کیا

ایک مرتبہ ایک مقررہ کو اشارہ ملا کہ مکمل مجلس زمانہ غیبت میں مومنین کے بھائی چارے کی اہمیت پر پڑھو۔

سیکھا؟ کسی خاص محفل میں قرآن پاک کی کونسی آیت سنی اور کیا سبق حاصل کیا؟ توحید و رسالت کا کون سا نگینہ ہاتھ آیا؟ کون سا بھولا ہوا سبق یاد آیا اور تجدید عہد کا موقع میسر آیا؟ ہم کئی ایک پاک ہستیوں کی مخصوص مجالس میں شرکت کرتے ہیں۔ مثلاً خاتون جنت بی بی فاطمہ زہرؑا، بی بی زینبؑ، بی بی سکینہؑ اور دیگر مخدرات۔ رسالت مآبؐ، حضرت علیؑ، حسنینؑ، سید سجادؑ، دیگر ائمہ اطہار اور امام آخرالزماںؑ کے مخصوص حالات سننے سے کیا سبق حاصل کیا اور عشق کی اس منزل سے کیا خزینہ اٹھا کر لائے؟ ہماری سوچ کتنی پاک، دل کتنے گداز اور روح کتنی بلند ہوئی؟ کئی گھنٹے دیگر مؤمنین کے ساتھ اکٹھے گزارنے کے بعد کیا آپس کے اتفاق اور بھائی چارے میں اضافہ ہوا یا نہیں[1]؟

ماتم حسینؑ کے نظم و ضبط سے، صفیں باندھنے سے، نوحہ خوانوں کے ساتھ آواز ملانے اور ان کا جواب دینے سے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یا حسینؑ یا حسینؑ کی صدا بلند کرنے سے ہم نے کیا سیکھا؟ آخر ہم ہی نوحے کی صدا کا جواب کیوں دیتے ہیں جبکہ نظم کی کسی اور قسم میں اس کا رواج نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ماتم حسینؑ کی ان صفوں میں 'کوئی' کھڑا ہمیں ایک قوم بن کر سامنے آنے، قیادت کی پکار کا جواب دینے اور یک جاں ہو کر عمل کرنے کی تربیت دے رہا ہو؟ یہ اور اس جیسے کئی اور سوالات ہیں جن پر سوچنا، سمجھنا اور ان کی روشنی میں ایک نیا لائحہ عمل تیار کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ بحث یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ان ہی نورانی محافل میں کریم کربلا صحت، شفا، رزق کی فراوانی اور روحانی بالیدگی کے لنگر بھی لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے ہم نے کیا مانگا اور عطا ہوا؟ اور کیا نہ بھی مانگا تو وہ بھی اس در پر صرف حاضری دینے سے عطا ہو گیا۔ ہم اس در کی دین کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن کبھی کبھار اسے خود عیاں عطا سمجھ لیتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے بچے اپنے والدین کی عطا کو اپنا حق سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کسی نعمت کا شعوری اعتراف ہی اس کی شکر گزاری کا باعث بنتا ہے۔ اس شعور کے لئے بیٹھ کر سوچنا اور کبھی کبھار ڈائری لکھنا بہت ضروری ہے تاکہ ہمیں بھی ان فوائد کی بصیرت حاصل ہو اور دوسروں کو بھی اس نعمت بے بہا کی جانب راغب کر سکیں۔

1۔ ایک مرتبہ ایک مقررہ کو اشارہ ملا کہ مکمل مجلس زمانہ غیبت میں مومنین کے بھائی چارے کی اہمیت پر پڑھو۔

1.1۔شیعہ ایک قوم ہیں

اس مضمون کے تحت ہم بحث کریں گے کہ شیعیت مختلف ثقافتوں اور خطوں پر پھیلی ہونے کے باوجود یک جان قوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ شیعہ دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں، کوئی بھی زبان بولتے ہوں، کیسا ہی لباس زیب تن کرتے ہوں لیکن وہ ایک ہی بدن کے مختلف اعضاء کی مانند ہیں۔ بحیثیت قوم ان کا ہدف، مشن اور مقاصد ایک ہیں۔ مشہور سیاسی سائنسدان رپرٹ ایمرسن (xxviii) کے مطابق قومی یکجہتی کے لئے ذاتی خود شناسی کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور قومی شناخت کے لئے قومی نشان اور ثقافت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب لوگ ایک جیسی روایات کی بدولت ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہوجاتے ہیں تو وہ ایک قوم کے افراد بن جاتے ہیں۔

ہر قوم کے کچھ امتیازی نشان ہوتے ہیں۔ مثلاً جھنڈا، علامتی نشان، مشن، ہدف اور مقاصد۔ جھنڈا قومی شناخت اور اس کی سربلندی کا امین ہوتا ہے۔ وہ قوم کے سوئے ہوئے جذبے بیدار کرتا ہے۔ اسی لئے زندہ اقوام کے افراد جھنڈے کے سامنے کھڑے ہوکر تجدید وفا کرتے ہیں۔ ایک سربلند جھنڈا پوری قوم کو یک جا رکھتا ہے اور افراد کو حوصلہ، مستقل مزاجی اور استقامت عطا کرتا ہے۔ ہمارا قومی جھنڈا علم حضرت عباس علمدارؑ ہے۔ ہم روز عاشورہ 61ھ (680ء) سے ہی اس علم کے سائے میں پلتے چلے آئے ہیں۔ چودہ سو سال سے یہ جھنڈا ہاتھ سے ہاتھ سربلند چلا آرہا ہے۔ کسی بھی قوم کا دوسرا امتیاز اس کے ادارے اور درس گاہیں ہوتی ہیں۔ کربلا ہماری درس گاہ اور امام بارگاہیں ہمارے ادارے ہیں۔ علاوہ ازیں کسی بھی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے خلوص نیت، مضبوط ارادے اور بامعنی محرک کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجالس امام حسینؑ زندگی گزارنے اور قومی یکجہتی کے لئے مقدس محرکات فراہم کرتی ہیں۔ مزید برآں ہر اہم ادارے کا ایک یونیفارم ہوتا ہے جس کے کئی ایک مقاصد ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی ادارے کے ہدف، مشن اور مقاصد کو واضح کرتا ہے۔ مجالس امام حسینؑ کے اولین اجرا کے ساتھ ہی شیعہ قوم کے یونیفارم کا آغاز ہوگیا تھا۔ اور ان شاء اللہ یہ یونیفارم امام العصرؑ کے ظہور تک جاری رہے گا۔

جہاں تک ہمارے ہدف، مشن اور مقاصد کا تعلق ہے تو رسول اللہؐ کی پیدائش، بعثت اور

ہجرت سے لے کر حضرت علیؑ کی خلافت، امام حسن مجتبیٰؑ کی خاموشی، قیام کربلا اور اس کے بعد دیگر ائمہ اطہارؑ کی داستان حیات نے ہمارے ہدف، مشن اور مقاصد کو نہ صرف مضبوط بنیادوں پر استوار کیا بلکہ ان کے مؤثر اجراء کا بھی انتظام فرمایا۔ ہمارا ہدف خالص دین الٰہی کا اجرا، مشن حجت خدا سے تجدید وفا، اطاعت، حفاظت اور ہمارے مقاصد غیبت کے طویل دور میں شیعیت کو غلو سے پاک رکھنا اور شیعہ فرائض کی بجا آوری ہے۔ مندرجہ ذیل حصے میں ہم ان میں سے چند امور کا مختصراً جائزہ پیش کریں گے۔

1.2۔ شیعہ کون ہیں؟

لفظ 'شیعہ' کی تعریف وتوصیف رسول پاکؐ کے دور سے ہی کر دی گئی تھی۔ بعد ازاں ائمہ اطہار اور مراجع دین اس کی تفسیر بیان کرتے رہے لیکن دور حاضر میں جب شیطانی قوتیں اسلامی اعتقادات کی بنیادیں منہدم کرنے کی خواہاں ہیں تو ہمارے لئے اس بحث کو دوبارہ سے چھیڑنا اور اس پر سیر حاصل گفتگو کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

دراصل تعریف کسی شے کی بنیادی پہچان کا کام دیتی ہے تا کہ اس شے کو دوسری اشیاء سے جدا کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں تعریف اس شے کے بنیادی خواص یا امتیازات کو بھی واضح کرتی ہے۔ مثال کے طور پر کرہ ارض اور فلک دو الگ الگ وجود ہیں لیکن افق پر دونوں آپس میں ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر ہم ان دونوں کی تعریف کر دیں اور وہ تعریف ان کی جدا جدا خاصیت بیان کرتی ہو تو کوئی بھی اہل عقل انہیں گڈ مڈ نہیں کرے گا اور ایک مہین سی لکیر کے ذریعے بھی ان دونوں کی الگ الگ شناخت کر لے گا۔

علاوہ ازیں یہ کہ جب ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ شیعہ قوم کے کاندھوں پر حجت خدا کی اطاعت، مدد اور حفاظت کے ذریعے دین کی حقیقی صورت واضح کرنے کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس قوم کی بنیادی اکائی کن افراد پر مشتمل ہے؟ اور اس اکائی کا خمیر کن اجزاء سے اٹھتا ہے یا اٹھنا چاہیے؟ مثال کے طور پر اگر کسی عمارت کی بنیادی اکائی اینٹوں پر مشتمل ہو اور وہ اینٹیں سیم اور تھور زدہ زمین سے بنائی گئی ہوں تو عمارت عیب دار ہو

گی۔اس عمارت کو چاہے آسمان تک بلند کر دیا جائے یا انواع و اقسام کی زیبائش سے آراستہ کر دیا جائے تب بھی بادِ مخالف کا ایک ہلکا سا جھونکا اسے زمین بوس کرنے کے لئے کافی ہوگا۔آیئے قرآن وحدیث اور ائمہ کے ارشادات کی مدد سے اثنا عشری عمارت کی اس بنیادی اکائی کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں۔

لغت لسان العرب کے مطابق 'شیعہ وہ گروہ ہے جو کسی امر پر مجتمع ہو'۔لغت القاموس المحیط کے مطابق 'کسی شخص کے پیروکار اور مددگار اس کے شیعہ ہوتے ہیں'۔مشہور شیعہ اسکالر ڈاکٹر ادریس السماوی پروفیسر آف فلاسفی کلاورڈی یونیورسٹی امریکہ کے مطابق 'تشیع مرحلہ وار تحول کا نتیجہ ہے جو انسان کے ذہن وقلب میں رونما ہوا۔ولایت صرف اہل بیتؑ کی ولایت کا نام نہیں بلکہ اس کا انحصار تین بنیادوں پر ہے یعنی کہ اللہ، رسولؐ اور ائمہ اطہارؑ۔تشیع کی تعریف یہ ہے کہ شیعہ اہل بیتؑ کے ذریعے اللہ کی ولایت کو قبول کرتا ہے' (منبع فارسی۔مجلہ شیعہ شناسی/شمارہ 13)۔شیخ الصدوقؒ نے اپنی کتاب علامات شیعہ از نظر معصومینؑ میں بحار الانوار کی مختلف جلدوں سے شیعیان علیؑ کی خصوصیات اکٹھی کی ہیں۔ان میں سے چند ایک حاضر خدمت ہیں۔

اول تو یہ کہ نماز کے وقت کی پابندی سے شیعیان علیؑ کو پہچانا جا سکتا ہے۔جناب آقائی اپنی تصنیف صفات الشیعہ (صفحہ 93) پر درج کرتے ہیں کہ شیعہ علیؑ صرف وہ ہے جو کثرت سے نمازیں پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو۔اس کے علاوہ یہ کہ علیؑ کے شیعہ اہل علم اور اہل شفقت ہوتے ہیں۔شیعہ محنتی اور سچے ہوتے ہیں اور اپنے دینی بھائی کے ساتھ تواضع سے پیش آتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ کہ شیعوں کے دل ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔یا یہ کہ شیعہ وہ ہیں جن کی بات میں کچھ اختلاف نہیں ہوتا چاہے ان کے شہر ایک دوسرے سے جدا ہی کیوں نہ ہوں۔

شیعہ کی تعریف کے بعد شیعہ ہدف، مشن اور مقاصد کا بیان ضروری ہے۔اگر ہم رسالت اور امامت کی تاریخ کا جائزہ لیں تو دینی اور شرعی لحاظ سے شیعہ کا ہدف، مشن اور مقصد حیات حجت خدا کی اطاعت و اتباع اور ان کی نصرت نظر آئے گا۔لفظ 'حجت' کے معنی افتائل کرنے والے 'استدلال' کے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو طرح کی حجت سے نوازا ہے، ایک اندرونی اور دوسری بیرونی۔اندرونی حجت انسان کا اپنا استدلال اور بیرونی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسل،

انبیاء اور ائمہ کرام ہیں۔ بیرونی حجت خدا وہ ہوتا ہے جو عوام کو استدلال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت کی جانب قائل کر سکیں۔ لفظ الحجۃ کے ایک معنیٰ ایسی شہادت کے بھی ہیں جس کی بنیاد پر کسی کے خلاف ثبوت مہیا کیا جا سکے۔ لہٰذا انبیاء اور ائمہ اطہار کو اس وجہ سے بھی حجت کہا جاتا ہے کیونکہ روز قیامت وہ نافرمانوں کے خلاف گواہی دیں گے۔ انہیں بلا کر پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ان لوگوں پر اتمام حجت کر دیا تھا؟ تو لوگ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ انہوں نے اتمام حجت نہیں کیا تھا (الکافی: 1۔1۔1۔12 پر تبصرہ)۔

اثناء عشری فرقے میں حجت خدا کا نظریہ اہم ترین نظریوں میں سے ایک ہے۔ حجت خدا کا عہدہ یا تو پیغمبر کے پاس ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے تجویز کردہ امام کے پاس۔ ہر حجت خدا اپنے بعد آنے والی حجت کی نشاندہی کرتا ہے۔ عوام الناس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رائے دہندگی کے ذریعے حجت خدا کا انتظام کر لیں۔ وہ شریعت خداوندی کا اولین امین ہوتا ہے۔ اس کے احکامات انسانوں تک پہنچاتا اور ان پر لاگو کرتا ہے۔ زمین خدا کبھی بھی الٰہی حجت سے خالی نہیں رہتی۔ حضور اکرمؐ کے بعد بارہ (12) ائمہ اطہارؑ حجت خدا ہیں۔ پیغمبرؐ کی غیر موجودگی میں حجت خدا کی اطاعت اور اس کی مدد، خدا اور اس کے رسولؐ کی مدد کے برابر ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ قیام کا حکم دیں تو قیام اور سکوت کا حکم دیں تو ان کے شیعہ سکوت اختیار کرتے ہیں۔ جتنا کہیں اتنا کرتے ہیں، نہ ان سے سبقت لے جاتے ہیں اور نہ اتنا پیچھے رہ جاتے ہیں کہ انہیں پا نہ سکیں۔ حضور اکرمؐ شیعہ کی حیات طیبہ میں ان کے اصحاب اور ائمہ کرام کی زندگی میں ان کے اصحاب نے اطاعت و اتباع کا حق ادا کر دیا۔ مندرجہ ذیل حصے میں ہم حیات پیغمب ص اور بعد از حیات پیغمبرؐ حجت خدا کی اطاعت و اتباع کے چند واقعات بیان کریں گے۔

1.3۔ حجت خدا کی اطاعت و مودت: حیات رسولؐ اور بعد از رسولؐ

تاریخ گواہ ہے کہ حضرت علیؑ نے حجت خدا رسول اکرمؐ کی اطاعت کا حق ادا کر دیا۔ علاوہ ازیں حضور اکرمؐ کے خاندان کے دیگر افراد اور اصحاب کو بھی ان کی اتباع سے بڑھ کر کوئی شے عزیز نہ تھی۔ خاندان ابو طالبؑ کو دیکھ لیجئے یا بی بی خدیجہؑ، بلال حبشیؓ، ابوذر غفاریؓ، مقدادؓ

کو کفار مکہ کا سامنا ہو یا منافقین کا، حالت جنگ تھی یا امن، ان مٹھی بھر سرفروشوں نے نہ خدا کو چھوڑا نہ حجت خدا کی نصرت سے پیچھے ہٹے۔ حیات پیغمبرؐ میں امامت رسالت کی انگلی تھام کر چلی۔ اس خوبصورت ہمنوائی کا جو سفر خانہ خدا سے شروع ہوا وہ حضوؐر کی رحلت تک جاری رہا۔ یہ سفر نہ صرف محبت و عشق بلکہ بغیر کسی حیل و حجت کے اطاعت و اتباع کا سفر تھا۔ حضرت علیؑ ہجرت مدینہ کی رات کا قصہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ 'حضور اکرمؐ نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ قریش کے کچھ افراد آج رات مجھے بیدردی کے ساتھ قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آج تم میرے بستر پر سوؤ گے تا کہ میں مکہ سے دور نکل جاؤں۔ یہ حکم خدا ہے۔ میں نے کہا بہت خوب اے خدا کے پیغمبر! میں ایسا ہی کروں گا اور پورے دل و جاں کے ساتھ کروں گا'[xxix]۔ اگر ہم غور کریں تو مودت و اتباع رسولؐ کی ایسی مثال نہ اس سے پہلے کبھی انسانی تاریخ مہیا کر سکی نہ ہی آئندہ کبھی کر سکے گی۔

غزوہ بدر میں مقدادؓ نے حضور اکرمؐ سے کہا، 'یا رسول اللہ! جس کام کے لئے اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے آپ اس کے لئے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے اگر آپ سمندر پار کر کے ہمیں حبشہ چلنے کو کہیں گے تب بھی ہم آپ کے ساتھ ہر معرکے میں شریک رہیں گے یہاں تک کہ آپ وہاں پہنچ جائیں' (تاریخ طبری 2: غزوہ بدر، صفحہ 140، طبع دوم)۔

حیات رسول اکرمؐ کے سنہرے دور میں رسالت نے بارہا اپنے بعد آنے والی حجت کا تعارف کروایا۔ مثلاً ابن الاثیر حضوؐر سے روایت کرتے ہیں کہ 'اے علیؑ! خدا نے تمہیں ان اشیاء سے نوازا جن سے کسی اور کو نہ نوازا۔ تمہیں دنیا سے بے نیاز رکھا، تمہیں کمزوروں سے محبت عطا کی، وہ تمہاری امیری پر نازاں ہیں اور تم ان کی دوستی پر۔ جو تم سے محبت کرتا ہے وہ تمہارا سچا دوست ہے اور وائے ہو اس پر جو تمہارا دشمن ہے اور تمہارے اوپر جھوٹ افترا کرتا ہے' (اسد الغابۃ 4: صفحہ 23)۔

بحار الانوار (ج 27، ص 230) میں تحریر ہے کہ حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ 'ایک مرتبہ حضور ازواج میں سے کسی ایک کے حجرے میں استراحت فرما رہے تھے۔ میں ان سے ملاقات کے لئے گیا تو انہوں نے فرمایا، 'جو تمہارے ساتھ وفادار رہا وہ ایسا ہے جیسے میرے ساتھ وفادار

رہا، جس نے تم سے کمر موڑی اس نے مجھ سے کمر موڑی، جو میرے ساتھ محبت ظاہر کرتا ہے اور تمہاری مخالفت کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ خدا نے مجھے اور تمہیں ایک ہی نور سے پیدا کیا ہے'۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک حضورؐ حیات رہے، رسالت امامت کا تعارف کرواتی رہی اور امامت رسالت کی اطاعت و حفاظت پر معمور رہی۔ حتیٰ کہ لافتی الا علی کا ترانہ بھی حضرت جبرائیلؑ نے حضورؐ کی حفاظت کی وجہ سے گایا۔

محمد بن اسحاق کتاب الغزوات میں حضرت علیؑ سے منقول کرتے ہیں کہ جب ایک گروہ نے حضورؐ کے حکم پر عمل نہ کیا اور انہیں تنہا چھوڑ دیا تو میں مضطرب و بے چین ہو گیا۔ میں اپنے خدا اور آقا کی خدمت میں حاضر تھا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ دشمنوں پر حملے کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں نے کافروں کے ایک گروہ کا پیچھا کیا اور واپس اپنے مقام پر پہنچا تو حضور اکرمؐ کو موجود نہ پایا۔ میں دیوانہ وار انہیں تلاش کر رہا تھا اور اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمانوں پر تو نہیں اٹھا لیا؟ اور ہم ان کی رحمت سے محروم ہو گئے۔ میں نے جلال میں آکر فیصلہ کیا کہ اگر حضورؐ نہیں رہے تو میں بھی لڑتے ہوئے اپنی جان دے دوں گا۔ میں دشمنوں پر حملے پر حملہ کئے جا رہا تھا کہ حضورؐ کو انتہائی کمزوری کے عالم میں زمین پر پڑے ہوئے دیکھا۔ میں ان کی جانب دوڑا اور ان کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اتنے میں ایک گروہ حضورؐ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے حضورؐ کے حکم پر ان کے حملے کا جواب دیا اور انہیں فرار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی لمحے حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تم رضوان کا ترانہ سن رہے ہو؟ میں نے غور کیا تو مجھے آواز آئی۔ 'لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار'۔ اسی روایت کو دیگر اہل تشیع اور اہل سنت کتابوں میں درج کیا گیا ہے۔

بعد از حیات رسول امامت کی پہچان اور حفاظت کی ذمہ داری ائمہ کرام اور ان کے اصحاب پر آن پڑی۔ حضرت علیؑ کی خلافت سے پہلے ان کی خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا لیکن اس وقفے میں بھی انہوں نے امامت کا تعارف جاری رکھا تاکہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ حقیقی دین کے اجراء کی ذمہ داری کس پر ہے اور کوئی منافق عوام الناس کو دھوکے میں نہ رکھ سکے۔ حضرت علیؑ کی خلافت کے دور میں بھی منافقین کا پروپیگنڈہ اور حضرت کا جہاد جاری رہا۔ مثال کے طور پر حضرت علیؑ کا مندرجہ ذیل خطبہ ملاحظہ فرمائیے۔

نہج البلاغہ خطبہ 239 میں آل محمدؐ کا تعارف کچھ اس طرح کرواتے ہیں کہ 'یہ لوگ علم کی زندگی اور موت کی جہالت ہیں۔ یہ نہ حق کی مخالفت کرتے ہیں اور نہ حق کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں۔ یہ اسلام کے ستون اور حفاظت کے مراکز ہیں۔ انہی کے ذریعے حق اپنے مرکز کی جانب آیا ہے'۔

اسی طرح خطبہ 204 میں فرماتے ہیں کہ 'تم لوگوں نے ہماری ہی وجہ سے ہدایت کا راستہ پایا ہے اور بلندی کے کوہان پر قدم جمائے ہیں۔ ہماری ہی وجہ سے اندھیری راتوں سے اجالے کی طرف آئے ہو'۔

خطبہ 149 میں ارشاد ہوتا ہے کہ 'کل تمہیں میری خصوصیات معلوم ہوں گی۔ جب میرا مقام خالی ہو جائے گا اور میری جگہ کوئی اور اس مقام پر بیٹھ جائے گا'۔

اسی طرح امام کی جان کی حفاظت ان کے اہل خانہ اور احباب کا اہم فریضہ ہے۔ حضرت علیؑ نے اپنی جنگوں کے دوران حسنینؑ کے علاوہ دیگر بیٹوں اور احباب کو سپہ سالار مقرر کیا تا کہ امامت کا فریضہ مکمل کرنے تک ان کی جانیں محفوظ رہیں۔ حتیٰ کہ جنگ صفین کے دوران جب حضرت علیؑ نے امام حسینؑ کو برق رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ 'انہیں روک لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی وفات کی وجہ سے نسل رسولؐ منقطع ہو جائے' (نہج البلاغہ خطبہ 207)۔

معرکہ کربلا دین الٰہی کے اجراء اور حجت خدا سے عشق و وارفتگی، اطاعت، اتباع اور حفاظت کی بے مثال کہانی ہے۔ ذیل میں ہم واقعہ کربلا سے متعلق چند خطبات، ارشادات اور جنگی رجز پیش کرتے ہیں جو ہمارے نقطہ نظر کو مزید واضح کریں گے:

ابن اعثم الکوفی، الفتوح (جلد 5، صفحہ 83) میں لکھا ہے کہ نافع بن ہلال بن جمیل نے محرم کی دوسری تاریخ کو امام عالی مقام کے خطبے کے بعد جواب دیا کہ 'جب تک آپ سالم ہیں ہماری رہنمائی فرما کر ہمیں جہاں چاہیں لے جائیں۔ خدا کی قسم! ہمیں خدا کی تقدیر پر کوئی گلہ شکوہ نہیں اور اپنے پروردگار کے ساتھ ملاقات کرنے میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے۔ جو بھی آپ سے محبت کرے ہم اس سے محبت کریں گے اور جو بھی آپ سے دشمنی اختیار کرے اس کے دشمن بنیں گے'۔

سید ابن طاؤس اپنی کتاب مقتل لہوف میں تحریر کرتے ہیں کہ عاشورہ کی شب امام عالی مقام نے اپنے اصحاب کو اکٹھا کیا اور فرمایا کہ کسی کے اصحاب کو اپنے اصحاب سے زیادہ نیک اور اپنے اہل بیتؑ سے زیادہ اچھا کسی کے اہل بیت کو نہیں جانتا۔ مجھے اس لشکر کے ساتھ اپنے حال پر چھوڑ دو، انہیں میرے سوا کسی اور سے غرض نہیں۔ سب سے پہلے حضرت عباس علمدارؑ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ 'کیا ہم آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں تا کہ آپ کے بعد ہم زندہ رہیں؟ خدا ہرگز ایسا دن ہمیں نصیب نہ کرے'۔

مسلم بن عوسجہؓ نے فرمایا کہ 'اے فرزند پیغمبر! کیا ہم آپ کو اس حال میں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں جبکہ دشمنوں نے آپ کو اپنے محاصرے میں لے لیا ہے؟ خداوند آپ کے بعد مجھے جینا نصیب نہ کرے'۔ سعید بن عبداللہ حنفیؒ نے فرمایا، 'خدا کی قسم ہم آپ کو کبھی تنہا نہ چھوڑیں گے تا کہ خدا یہ جان لے کہ ہم نے آپ کے بارے میں رسول خدا کی جو وصیت سنی تھی اسے یاد رکھا اور اگر میں یہ جان لوں کہ خدا کی راہ میں مجھے قتل کیا جائے گا اور پھر زندہ کیا جائے گا اور پھر زندہ جلا دیا جائے گا اور یہاں تک کہ مجھے اس طرح ستر مرتبہ ہی کیوں نہ جلا دیا جائے پھر بھی میں آپ سے جدا نہ ہوں گا اور اپنی جان آپ پر قربان کروں گا'۔

محمد بن حضرمیؒ نے فرمایا کہ 'خدا کی قسم اگر میں آپ سے جدا ہوں تو مجھے جنگل کے درندے کھا جائیں'۔

روز عاشورہ نماز ظہر کے دوران زہیر بن قینؒ، عبداللہ بن حنفیؒ، امام کے عیسائی صحابی وہب بن کلبیؒ، ابوذر غفاریؒ کے حبشی غلام جونؒ اور سرید بن عبداللہؒ نے امام کے گرد گھیرا باندھا اور یزیدی لشکر کے تیر اپنے اجسام پر روکے (جمال منتظر)۔

شیخ محمد بن طاہر سماوی اپنی کتاب ابصار العین فی انصار الحسین میں عاشورہ کے روز امام عالی مقام کے اصحاب کے رجز بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے چند جھلکیاں حاضر خدمت ہیں۔

عبدالرحمان بن عبداللہ ارجیؒ جو قیس بن مسہر کے ساتھ کوفیوں کے پیغامات لے کر امام حسینؑ تک پہنچے تھے۔ وہ بعد میں امام حسینؑ کے ساتھ شامل ہو گئے اور کربلا کے اولین شہدا میں شمار ہوئے۔ کربلا کے میدان میں انہوں نے رجز پڑھے کہ بے شک میں امام حسنؑ اور امام

حسینؑ کے دین پر باقی ہوں یعنی کہ انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دیا کہ اصل دین وہ ہے جس پر امام حسنؑ قائم تھے اور امام حسینؑ قائم ہیں۔ اس کے علاوہ جو بھی دین پھیلایا جا رہا ہے وہ دھوکے کے سوا کچھ نہیں چاہے اس دین کو نشر کرنے والا حاکم وقت ہی کیوں نہ ہو۔ خدا کی رحمتیں نازل ہوں ان شہدائے کربلا پر جو تاریخ کے صفحات پر ایسا پیغام لکھ گئے جسے استعماری قوتیں آج تک مٹا نہ پائیں'۔

اسی طرح زہیر بن قینؓ نے اعلان کیا کہ 'حسینؑ اس وقت خدا کی حجت ہیں اور پیغمبرؐ کی نسل سے ہیں۔ میں تمہیں قتل کروں گا اور اس میں کوئی عیب نہیں جانتا'۔ سبحان اللہ کس جرآت سے فوج منافقین پر واضح کر دیا کہ اس وقت حجت خدا کون ہے؟ کس کی نسل سے ہے؟ اور اسی کی اتباع ہی حقیقی دین ہے، چاہے اس کے لیے ہر قسم کی طاغوتی قوتوں کے ساتھ جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ مزید یہ کہ کل کو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ حضورؐ کی نسل سے ان کا وارث کوئی نہ تھا۔ شیخ محمد بن طاہر سماوی مذکورہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں کہ شہزادہ علی اکبرؑ کو جب عمر بن سعد نے امان دلوانے کی پیشکش کی تو انہوں نے امان نامہ ٹھکرا دیا اور رجز پڑھا کہ:

'میں علیؑ کے بیٹے حسینؑ کا فرزند ہوں

بیت اللہ کی قسم! ہم نبیؐ سے زیادہ قرابت داری کا حق رکھتے ہیں'۔

حضرت عباس علمدارؑ اور ان کے بھائیوں کے لئے دو مرتبہ امان نامہ بھیجا گیا۔ پہلا امان نامہ عبداللہ بن ابی المحل بن خرام عامری اور دوسرا شمر بن ذی الجوشن ظہر عاشورہ میں لے کر آیا۔ حضرت عباسؑ نے امان نامے پر لعنت بھیجی اور فرمایا کہ کیا تم مجھے اپنے بھائی حسینؑ کو چھوڑنے کی دعوت دے رہے ہو؟ حضرت عباس علمدارؑ جیسے غیرت مند ہاشمی نوجوان نے اس موقع پر نہ تو علیؑ کی بیٹیوں کو تنہا چھوڑنے کی بات کی، نہ معصوم بچوں کو بلکہ ذکر کیا تو صرف حجت خدا کا۔ مصیبت کی ان عظیم گھڑیوں میں آزمائش کی کسوٹی کیا تھی؟ حجت خدا اور بس۔ تمام اصحاب، مخدرات اور کم سن بچوں کا مطمع نظر حجت خدا کی صدا پر لبیک کہنا اور ان کے حکم کی بجا آوری تھا۔

اگر ہم واقعہ کربلا اور شام غریباں کے حالات پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ حجت خدا کی اطاعت، ان کی حفاظت پر بھی مقدم تھی۔ شام غریباں کے جلتے ہوئے خیموں میں جب علیؑ کی شیر

دل بیٹی امامت کے دو چراغوں کی محافظ تھیں۔ انہوں نے سرعت میں فیصلہ کرنے کی بجائے وقت کے امام سے دریافت کیا کہ کیا وہ خیموں سے باہر نکل جائیں یا جل کر اپنی جان دے دیں؟ عام طور پر اس واقعہ کو بیبیوں کے پردے کے ضمن میں بیان کیا جاتا ہے۔ یقیناً اس امر میں پردہ اہم تھا، لیکن سب سے اہم امر امامت کا اعلان اور اطاعت تھی۔ بھلا اس غربت و تنہائی، شام غریباں کے اندوہناک اندھیرے اور جلتے ہوئے خیموں میں بی بی کے سوا اور کون تھا جو امام سجادؑ کی تاج پوشی کا اعلان کرتا؟ بی بی کا تعلق شجاعت و وفا کے اس قبیلے سے تھا جس نے نہ صرف ہر دور کے حجت خدا کی نصرت فرمائی تھی بلکہ حضرت اسماعیلؑ سے لے کر حضور اکرمؐ تک نور نبوت کی حفاظت کا حق بھی ادا کیا تھا۔ تاریخ انسانی کی اس تاریک ترین شام میں جب ایک جانب شکم حرام کے علم بردار اپنے طور پر امامت کا ہر چراغ گل کر چکے تھے اور دوسری طرف امامت کے دوسرے دعوے دار بھی موجود تھے۔ ثانی زہرا نے اپنی ماں کی سنت کو برقرار رکھتے ہوئے امامت کا اعلان کیا۔ اگر وہ اعلان کچھ دیر کے لئے ہی موقوف ہو جاتا تو یزیدی قوتوں کے لئے حقیقت پر پردہ ڈالنا آسان ہو جاتا۔ لیکن بروقت امام سے اجازت طلب کر کے انہوں نے اعلان کر دیا کہ حضورؐ کی اولاد سے تیسرے امام کا انتقال ہو چکا اور چوتھا امام جلتے ہوئے خیموں میں زندہ حالت میں موجود ہے۔ یہاں دوسرا اہم امر وقت کے امام کی اطاعت کا نظر آتا ہے۔ جہاں دو اماموں کی جان خطرے میں تھی اس مقام پر بھی بی بی نے امامت کی اطاعت کا حق پہلے ادا کیا اور حفاظت کا بعد میں۔ اس واقعہ سے ہم نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اگر ایک جانب امام کا حکم ہو اور دوسری جانب امام کی جان تو اول الذکر پر آخر الذکر امر فوقیت رکھتا ہے۔

کربلا کے میدان میں امامؑ کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے اوباش کوفی و شامی بظاہر عالم دین بھی تھے، قاری قرآن بھی، مشہور جنگجو بھی اور ایسے منافقین بھی جن کے دستخط امام عالی مقام کو بھیجے گئے دعوت ناموں پر موجود تھے۔ وہ امام حسینؑ کے مرتبے اور مقام سے واقف تھے لیکن یزیدی سکوں کی جھنکار نے انہیں اندھا اور بہرا کر دیا تھا، ان کے شکم مال حرام سے پر تھے جس کی ناپاک چربی نے ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا تھا لیکن شام غریباں کے بعد جب بازاروں اور درباروں کا سفر شروع ہوا تو حجت خدا اور محافظہ حجت کو ایسے ان پڑھ اور

جاہل عوام کا سامنا ہوا جنہیں حکومتی پروپیگنڈے کی مشینری گمراہ کر چکی تھی۔ ان میں سے اکثر رسول خداص کے نام سے تو واقف تھے لیکن اصل اسلام کی صورت اور اہل بیت کی شناخت گم کردی گئی تھی۔ معاویہ کے زہریلے پروپیگنڈے نے حضرت علیؑ کی بصارت وبصیرت، علم و حکمت اور شجاعت پر پردے ڈال دیئے تھے۔ ان مسموم حالات میں بی بی زینبؑ، بی بی کلثومؑ اور بی بی سکینہؑ کے خطبوں نے کوفہ کے عوام کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور شام کے عوام کو نااہل اور غیر مستحق حکمرانوں کے زہریلے پروپیگنڈے سے آزاد کیا۔ اس کے علاوہ شام کے بازاروں میں امام حسینؑ کے کٹے سر نے سورہ کہف کی تلاوت کر کے تا قیامت واضح کر دیا کہ حجت خدا کون ہے؟ اور اپنے رب کے ساتھ ولایت کا رشتہ کس طرح نبھایا جاتا ہے؟ دربار شام میں جناب سجادؑ کا خطبہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ آپ نے خدا کی توحید اور اس کے بعد رسالتؐ کے معجزات کو کچھ اس طرح بیان کیا جیسا کہ شاید ہی شامیوں نے کبھی سنا ہو۔ اس کے بعد آپ نے حضرتؐ کے کمالات بیان کئے اور رسالت و امامت سے اپنا رشتہ واضح کیا۔ یہاں تک کہ امام مہدی آخرالزماںؑ کا حسب نسب بھی واضح کر دیا تا کہ رہتی دنیا تک انسانیت کو حجت خدا کی تلاش میں بھٹکنا نہ پڑے۔ اس مرد جری کی زبان کی تاثیر تھی کہ قیامت تک کسی غیر کو اپنے آپ کو حجت خدا یا وارث رسولؐ کہنے کی جرات نہ ہوسکی۔

واقعہ کربلا اور کوفیوں اور شامیوں کے نارواروئیوں سے ہمیں ایک سبق اور بھی ملتا ہے۔ وہ یہ کہ حرص و ہوس کی منڈی میں بکاؤ مال کی قیمت مقرر ہوتی ہے۔ شاطر تاجر عموماً خواص کو بھٹکانے کے لئے دولت دنیا اور اموال کا جھانسا دیتے ہیں جبکہ عوام کو گمراہ کرنے کے لئے گمراہ کن پروپیگنڈہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ہم شیعیان علیؑ کبھی بھی بکاؤ مال نہیں ہوتے لیکن ہمیں طاغوتی منڈیوں کے اصول وضوابط معلوم ہونے چاہئیں تا کہ منافقین کے ان ہتھکنڈوں کا مقابلہ کر سکیں۔

اگر ہم کربلا سے لے کر کوفہ و شام تک کے اقوال اور افعال کو یکجا کریں تو صاحب الامرؑ کے تعارف کی تجدید، اطاعت اور حفاظت کی ایک مکمل تصویر بنتی ہے۔ ان واقعات سے پہلے خواص و عوام میں سے اکثر صاحب الامرؑ کو جانتے تو تھے لیکن اس حقیقت پر دولت، سیاست اور ظلم کے ذریعے پردہ ڈالنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ لہٰذا مدینہ سے لے کر کربلا اور کربلا سے لے کر کوفہ و

شام کے بازاروں اور درباروں تک حجت خدا کے تعارف کی تجدید جاری رہی۔ تا کہ عوام الناس اور آئندہ آنے والی تاریخ بھی جان لے کہ دین کا حقیقی سرچشمہ کہاں سے پھوٹتا ہے؟ اور کن راہوں پر سفر کرتا ہوا کس الوہی سمندر میں جا گرے گا؟ اس تمام کہانی میں کسی نے کہا حسینؑ، کسی نے کہا میرا بھائی حسینؑ، کسی نے کہا میرے والد حسینؑ، لیکن مدعا سب کا ایک ہی تھا یعنی کہ وقت کا امام اور حجت خدا۔ ہدف ایک ہی تھا حتی خدا کی حفاظت۔ مقصد ایک ہی تھا عوام الناس کو حجت خدا کی پہچان کروانا تا کہ وہ حق اور سچ کے اصل سرچشمہ کی پہچان کر پائیں اور افراط وتفریط سے پاک اور حلال کو حرام سے جدا کرنے والے دین الٰہی کے پیروکار بن سکیں۔ اگر بھوکے پیاسے کریم کربلا نے حلال اور حرام کے درمیان اپنے لہو سے لکیر کھینچی تو کوفہ وشام کے مسافروں نے تاریخ کے ہر ورق پر اس لکیر کو پھیلا دیا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صدیوں سے چھڑی حلال وحرام کی جنگ کا خاتمہ ہو گیا بلکہ کربلا آج بھی جاری ہے۔ ’ھل من ناصر ینصرنا‘ کی صدا آج بھی فضاؤں میں گونجتی ہے۔ یزیدیت آج بھی دنیاوی امور پر حاوی ہے۔ حسینیت آج بھی اپنی قلیل جماعت کے ساتھ یزیدیت کے مقابلے پر ڈٹی ہوئی ہے۔ حجت خدا کا تعارف، حفاظت اور تجدید وفا کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی گزری صدیوں میں تھی۔ مجالس امام حسینؑ اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ کوئی تو ہے وارث کرب وبلا جو سوا صدی سے ان محافل کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ کوئی تو ہے جو آج بھی انسانیت کو حق کے جھنڈے تلے جمع کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ کوئی تو ہے جو غریب کربلا کی صدا پر لبیک کہتا ہے اور اس کے پیچھے تمام قوم پکار اٹھتی ہے لبیک یا حسینؑ!

دوسرا باب

مذاہب عالم اور اہل بیتؑ اطہار

مودت اہل بیت کسی ایک قوم، نسل اور فرقے کی ملکیت نہیں۔ انسانیت کا پیغام دینے والی مقدس ہستیاں ہر صاحب بصیرت کے دل کی آواز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے ہندو، سکھ، پارسی، اہل سنت اور اہل تشیع مل کر غم حسینؑ منایا کرتے تھے۔ غیر مسلم پرسہ دار جلوسوں کے پیچھے چلتے اور اہل سنت حضرات سبیلیں لگایا کرتے تھے [1]۔ آج بھی کریم کربلا ہر اہل دل کی آواز ہیں۔ 2000ء کی دہائی میں جب بی بی زینبؑ کے روضے پر حملے کا خطرہ تھا تو اس وقت ہماری بہن وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ روضے کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کے برابر تعداد میں ہندو نوجوان کھڑے تھے۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر بی بی کے روضے کی حفاظت کے لئے پہنچے تھے۔

حضور اکرمؐ اور اہل بیتؑ کا تذکرہ کئی ایک مذاہب میں ملتا ہے۔ اس سلسلے میں مذاہب ابراہیمی میں پنجتن پاک کے تذکروں پر پہلے سے تحقیق ہو چکی ہے لیکن بدھ مت پر بہت کم تحقیق ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ تصنیف میں بدھ مت میں موجود اہل بیت کے تذکرے بیان کئے گئے ہیں۔ حکیم محمود گیلانی اپنی کتاب ایلیا میں لکھتے ہیں کہ مہا آتما بدھا کے گیان کی کہانیاں من گھڑت ہیں [1]۔ وہ سنسکرت کے حوالہ جات سے واضح کرتے ہیں کہ جس رات مہا آتما بدھا نے محل سے فرار اختیار کیا اس روز انہوں نے خواب میں ایلیا یا حضرت علیؑ کا دیدار کیا تھا۔ انہوں نے اپنے منتری کو بتایا کہ انہوں نے عظیم روح (پرم آشا) کا دیدار کیا ہے۔ پرم آشا نے کہا کہ میرے نام کی مالا جپو۔ جو چاہو ملے گا۔ میرا مکان (پوتر استھان) پھٹی ہوئی دیوار کے پاس ہے۔ میں وہاں ایک بچے (بالک) کے روپ میں ملوں گا اتنا کہہ کر انہوں نے چمکتی

1 شاید عام لوگوں کو اس کا علم نہ ہو لیکن میرے فیلڈ ورک کے نتائج بتاتے ہیں کہ بہت سے خانہ بدوش اب بھی مکمل طور پر مسلمان نہیں ہیں۔ ماضی میں ان کے بہت سے قبائل ہوتے تھے اور بہت سے عقیدے لیکن یہ تمام کے تمام امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ سے انتہائی حد تک عقیدت رکھتے ہیں۔ دسویں محرم کو اپنا گھر بار اور کاروبار چھوڑ دیتے ہیں اور سارا دن جلوس کے پیچھے چلتے ہیں۔

ہوئی تلوار نکالی اور اسے لہرا کر کہا کہ مجھے پرمیشور (خدا) نے سنگھ (شیر) بنا کر بھیجا ہے (صفحات 39-40)۔

اس کتاب میں دیا گیا ایلیا کا تصور بہت واضح ہے۔ البتہ بدھ مت کے دیگر صحیفوں میں مانجوشری اور میتر یا بودھی ستوا کا تصور کثرت سے ملتا ہے۔ مانجوشری کے اوصاف حضرت علیؑ اور امام مہدیؑ سے مماثلت رکھتے ہیں۔ 'میتر یا' کے لفظی مطالب محبت اور شفقت کے ہیں۔ اسی وجہ سے حکیم محمود گیلانی نے میتر یا کو حضور اکرمؐ کے ساتھ منسلک کیا ہے لیکن پانچویں صدی عیسوی میں جب حضورؐ پہلے ہی اس دنیا میں تشریف لا چکے تھے۔ اس وقت بھی بدھ مت کے پیروکار میتر یا کے انتظار میں تھے۔ مزید برآں بدھ مت کا میتر یا ایک بودھی ستوا ہے نہ کہ بدھا۔ بدھ مت کا بدھا کے متعلق تصور نبی اور بودھی ستوا کا تصور ولی سے ملتا جلتا ہے۔ نہ صرف بدھ مت بلکہ ہندو مت، جین مت اور دوسرے کئی ایک ایشیائی مذاہب میں بھی پنجتن پاک کا عقیدہ موجود ہے لیکن یہ عقیدہ اس حد تک تغیر و تبدل کا شکار ہو چکا ہے کہ اس امر پر تحقیق کے لئے وقت، صبر اور وسیع ذرائع کی ضرورت ہے۔ گزشتہ سالوں میں کالکی اوتار پر ایک کتاب

1 بدھ مت کی روایات کے مطابق مہا آتما بدھا کے والد اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ ایک بادشاہ تھے۔ ان کا نام سدودھنا تھا۔ سنسکرت کے اس لفظ کے کئی ایک معنی ہیں لیکن اب سے عمدہ معنی حلال کھانے والا کے ہیں۔ ان کی والدہ کا نام مہا مایا گوتامی تھا۔ گوتامی کا مطلب ہے کہ ان کا تعلق ایسے قبیلے سے تھا جس میں گوتام یا گوٹام پائے جاتے تھے۔ قدیم ویدروایات میں کئی اقسام کے سادھو یا درویش پائے جاتے تھے۔ ان سادھوؤں میں غالباً سب سے اونچا درجہ گوٹام کا ہوتا تھا۔ گوٹام ایسے سادھو کو کہتے تھے جس نے حقیقت کو دیکھ لیا ہو۔ بدھا کی پیدائش سے پہلے ان کی والدہ نے خواب میں ایک سفید ہاتھی کو اپنے دائیں پہلو سے جسم میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے بعد انہیں پتا چلا کہ وہ امید سے ہیں۔ بدھا کی پیدائش پر ان کا نام سدہارتا گوتم رکھا گیا۔ سدہارتا کا مطلب ہے وہ جس نے حقیقت کو پالیا ہو یا جس نے اپنا مقصد حیات پالیا ہو اور گوتم کے معنی چمکتی ہوئی روشنی کے ہیں۔ اس لفظ کا ایک اور مطلب سورج بھی لیا جاتا ہے۔ ان کی پیدائش پر جوتشی نے زائچہ بنایا اور بتایا کہ یہ بچہ یا تو بہت بڑا بادشاہ بنے گا یا جنگلوں میں نکل جائے گا اور بہت بڑا رشی بنے گا۔ اس کے بعد سدودھنا نے پوری کوشش کی کہ گوتم بدھا محل میں ہی رہیں اور بیرونی دنیا کے دکھوں کو نہ دیکھ پائیں۔ لیکن جب انہوں نے افلاس، بیماری، مرض اور موت دیکھی تو ان کا دل پرآسائش زندگی سے اچاٹ ہو گیا۔ ایک روز وہ اپنی سوئی ہوئی بیوی کو چھوڑ کر جنگلوں میں نکل گئے۔ وہاں سے ان کی تپسیا کا آغاز ہوا اور آخر کار کٹھن ترین مراحل سے گزرنے کے بعد انہیں بصیرت ملی۔

لکھی گئی جس میں اس اوتار کو حضور اکرمؐ سے منسوب کیا گیا لیکن اگر کالکی اوتار پر غور کیا جائے تو تمام نشانیاں امام العصرؑ کے ظہور سے ملتی ہیں۔

1۔2۔ مانجوشری اور حضرت علیؑ کی شخصیت

مندرجہ ذیل حصے میں ہم بدھ مت میں پائے جانے والے مانجوشری بودھی ستوا اور حضرت علی کی شخصیت میں پائی جانے والی مماثلت کا ایک مختصر جائزہ پیش کریں گے۔

مانجوشری بدھ مت کا اولین بودھی ستوا ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں عظیم کشمیری بھکشو ناگر جون نے اس تصور کو مزید تقویت بخشی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ مانجوشری نے حالت خواب میں اسے پانچ ضخیم کتابیں تعلیم کیں[i]۔ مانجوشری دو الفاظ 'مانجو' اور 'شری' کا مجموعہ ہے۔ سنسکرت کے لفظ مانجو کے کئی ایک معنی ہیں لیکن سب سے زیادہ مشہور معنی محبت کے قابل اور شاندار کے ہیں۔ اسی طرح شری کے معنی بابرکت اور خوبصورت کے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ پیدائش کے وقت مانجوشری کا رنگ بنفشی مائل سنہری تھا۔ انہوں نے پیدائش کے فوراً بعد سے بولنا شروع کر دیا تھا۔ مہایانہ بدھ مت میں ان کا ایک نام دھرم کا شہزادہ بھی ہے کیونکہ وہ عوام کو دھرم کی جانب مائل کرنے کی الوہی صلاحیت رکھتے ہیں اور انہیں معصیت کے گڑھے میں گرنے سے بچاتے ہیں[ii]۔ وہ علم کی عمیق ترین (گھمبیر) حقیقت سے واقف ہیں اور بغیر کسی رکاوٹ کے دوسروں کو دھرم کی تعلیم دیتے ہیں۔ مانجوشری اپنے ماننے والوں کے سوالوں کے جواب مہیا نہیں کرتے بلکہ انہیں شعور کا راستہ دکھاتے ہیں[xxx] حتیٰ کہ وہ مستقبل میں آنے والے عظیم میتر یا سے بھی زیادہ علم رکھتے ہیں[xxxi]۔ 'کوکھ کی سوتر[1] (Sutra of Dwelling in Womb)' میں وہ خود کہتے ہیں کہ میں انسانوں میں سب سے قابل انسان کا بھی استاد ہوں۔ انہوں نے مہا آتما بدھا سے پہلے سات بدھا کو تعلیم دی۔ ایک زندگی میں وہ مہا آتما بدھا کے بھی استاد رہے۔ ان کا ایک نام مانجوگھوشا یعنی

بدھ مت میں کئی اقسام کی کتب پائی جاتی ہیں جن میں شاستر اور سوتر زیادہ مشہور ہیں۔ شاستر نثر جبکہ سوتر نظم کی شکل میں لکھی جاتی تھی۔ سوتر رسی کے ٹکڑے کو کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں لمبائی ناپنے کے لئے رسی کے ٹکڑے استعمال ہوتے تھے۔ مذہبی نظم کے مصرعوں کی مخصوص طوالت ہوتی تھی۔ بعض اوقات ہر مصرعے کے لئے الفاظ کی گنتی مقرر ہوتی تھی۔ اسی لئے مذہبی نظم کا نام سوتر پڑ گیا۔

بیان کا بادشاہ بھی ہے۔خوبصورت اور نرم آواز والا بھی ہے۔وہ حالت خواب اور بیداری میں عام لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں۔بدھ مت کے آغاز سے ہی بھکشو بودھی حاصل کرنے کے لئے مانجوشری کے نام کی مالا جپتے رہے ہیں۔ان کا عقیدہ تھا کہ مانجوشری کا نام جپنے سے ہر دعا قبول ہوتی ہے[xxxii]۔وہ ہر شے کی حقیقت سے واقف ہیں۔وہ بے یارومددگار کے مددگار اور حفاظت کرنے والے ہیں، وہ بےگھر کو گھر دینے والے، بھٹکے ہوئے کو راہ دکھانے والے اور پناہ کا جزیرہ ہیں[xxxiii]۔

مانجوشری ماورائے عقل علم (عرفان) کے بھی بودھی ستوا ہیں۔وہ اپنے انقلابی طریقہ تعلیم کے لئے مشہور ہیں۔باقی اساتذہ درجہ بدرجہ عرفان کی بلند منازل تک لے کر جاتے ہیں جبکہ مانجوشری بلاواسطہ عرفان کی بلند سیڑھی تک پہنچا دیتے ہیں۔تصویر کشی یا مجسمہ سازی میں ان کے دائیں ہاتھ میں تلوار اور بائیں ہاتھ میں کتاب دکھائی جاتی ہے۔وہ کتاب کے ذریعے علم پھیلاتے ہیں اور تلوار کے ذریعے جہالت کا خاتمہ کرتے ہیں۔وہ دو دھاری تلوار ہےجو ہر دو جانب سے بلیڈ کی طرح تیز ہے۔ایک جانب سے وہ جہالت اور دھوکے کو کاٹتی ہے جبکہ دوسری جانب سے انسان کی انا کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔وہ ایسی تلوار ہے جو دیتی بھی ہے اور لیتی بھی ہے۔دراصل وہ پراجنڑا (حکمت اور بصیرت) کی تلوار ہے۔کبھی کبھار اس تلوار سے شعلے نکلتے ہیں۔وہ شعلے دراصل آگ نہیں بلکہ علم وعرفان اور آگاہی کی روشنی سے نمودار ہوتے ہیں[xxxiv]۔بعض اوقات انہیں نیلے شیر پر سواری کرتا اور شیر کی پیلی کھال پر بیٹھا ہوا دکھایا جاتا ہے۔بعض اوقات اس شیر کی گردن کے بال سنہری ہوتے ہیں۔اسی طرح کبھی کبھار مانجوشری کے سر پر بالوں کے پانچ گچھے دکھائے جاتے ہیں یا پانچ کنگروں والا ایک سنہرا تاج دکھایا جاتا ہے۔وہ مشرق میں واقع خالص زمین پر رہتے ہیں جو کہ دو خالص ترین زمینوں میں سے ایک ہے۔مانجوشری کو پنجاشیکا پہاڑی کے ساتھ بھی منسوب کیا جاتا ہے۔'پنجاشیکا' کا مطلب ہے 'پانچ چوٹیوں والی پہاڑی'۔بدھ سوتر کے مطابق پنجاشیکا پہاڑی کوہ ہمالیہ میں واقع ہے اور اس کی چوٹیاں سارا سال برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔

پہلی صدی عیسوی میں بدھ مت پاکستان کے قدیم علاقے گندھارا سے چین پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی بدھ مت کے عقائد بھی چین میں منتقل ہوئے۔ بدھ مت کی تاریخ میں مانجوشری چین کا سب سے زیادہ پوجے جانے والا بودھی ستوا تھا۔ چین کی تانگ شاہی (763-779) کے دوران مانجوشری کو قومی بودھی ستوا قرار دیا گیا۔ چین کے شانسی صوبے میں پائی جانے والی ووتائی شان پہاڑی کی پانچ چوٹیاں ہیں۔ ان چوٹیوں کو زرد، سرخ، نیلی، سبز اور سفید چوٹی کا نام دیا گیا ہے۔ وہ چوٹیاں ایک خاص بلندی پر پہنچ کر ٹیرس کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور سارا سال برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس پہاڑی کو مانجوشری سے نسبت دی گئی اور اس پر مانجوشری سے منسوب کئی ایک معبد خانے تعمیر کیئے گئے۔ اس پہاڑی پر ہمہ وقت بھکشو عبادت اور مراقبہ میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کا سب سے زیادہ پسندیدہ مراقبہ مانجوشری کے نام جپنا ہے۔ ان کا دعوی ہے کہ اس مراقبہ کی وجہ سے مانجوشری سے ملاقات ہوتی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک سے بھی بدھ مت کے پیروکار اس پہاڑی کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

1914ء میں بھکشو مہا شویر نے ووتائی شان کی زواری کی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک کمزور تبتی بھکشو کو زرد پہاڑی پر دیکھا جو شاید مشکل ترین زواری کر رہا تھا۔ وہ ہر قدم کے بعد اپنے پورے جسم کو زمین پر گرا کر سجدہ ریز ہوتا، کھڑا ہوتا، ایک اور قدم اٹھاتا اور دوبارہ سجدہ ریز ہو جاتا۔ وہ اسی طریقے سے پانچ چوٹیوں کا سفر طے کر رہا تھا۔ ان چوٹیوں تک جانے والی راہیں سخت اور موسم شدید برفانی تھا۔ اس کا لباس بوسیدہ اور جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کی جلد پھٹ چکی تھی اور آنکھیں سرد ہواؤں کی وجہ سے سرخ تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ کوئی دین کے بارے میں ایسی شدید عقیدت کا مظاہرہ کس طرح کر سکتا ہے؟ یاد رہے کہ ووتائی شان چین کے مشکل ترین پہاڑی سلسلوں میں سے ایک ہے۔ اس کی پانچ چوٹیاں 18،415 ہیکٹر پر پھیلی ہوئی ہیں اور سب سے بلند چوٹی سطح سمندر سے 10،033 فٹ بلندی پر ہے۔ اس کا درجہ حرارت 24°- سینٹی گریڈ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ ان چوٹیوں پر سارا سال برفانی ہوائیں چلتی ہیں اور طوفان آتے ہیں۔ اس کے باوجود سارا سال ان چوٹیوں پر مانجوشری سے محبت رکھنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

تبت میں مانجوشری بودھی ستوا جمبیان کے نام سے بھی مشہور ہے۔ بھکو کتاب نیپال کی بدھ

روایات کے مطابق قدیم زمانے میں کھٹمنڈو کی وادی ایک عظیم ندی پر مشتمل تھی۔ مانجوشری کوہ ہمالیہ سے تشریف لائے اور اپنی آفاقی صلاحیتوں کی بدولت اس نہر کو ایک وادی میں تبدیل کر دیا اور یوں نیپال معرض وجود میں آیا۔ مہایانہ بدھ مت کی مشہور سوتر 'مانجو کی تعریف' کے مطابق:

'عقل و شعور آپ کی ذات سے سورج کی کرنوں کی طرح پھوٹتا ہے۔
وہ کون ہے جس کی چھاتی پر صحیفے دھرے ہوں اور وہ ہر شے کا ادراک کر لیتا ہو؟
وہ کون ہے جو ساٹھ (60) طریقوں سے تعلیم دیتا ہو؟
اتنی ہی شفقت سے جتنی کہ ماں اپنے اکلوتے بیٹے کو دیتی ہے
جب کہ تمام دنیا دھوکے میں مبتلا ہے
آپ کی دیوتائی گرج ہمیں جہالت کے اندھیروں سے نکالتی ہے
جو بصیرت کی تلوار چلاتا ہے اور جہالت کا خاتمہ کرتا ہے
آپ جن کا شاہانہ بدن ایک سو بارہ (112) نشانوں سے سجا ہوا ہے
آپ بودھی ستوا کے بلند ترین مقام پر ہیں
آپ ابتدا سے ہی پاک و پاکیزہ ہیں۔۔۔'[1]

روایات کے مطابق ایک سو عظیم بھکوؤں نے مل کر یہ دعا تحریر کی تھی۔ ہر بھکو نے ایک شعر تخلیق کیا اور مانجوشری نے ہر شعر پر اسے برکتوں سے نوازا۔ آج بھی مانجوشری پر عقیدہ رکھنے والے ہزاروں بدھسٹ اپنی صبح کا آغاز اس دعا سے کرتے ہیں۔ آیئے ان حالات و واقعات کی روشنی میں ہم بدھ مت کے مانجوشری اور حضرت علیؑ کی شخصیت کے یکساں پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔

- بدھ مت میں مانجوشری کو گزشتہ بدھا کا استاد قرار دیا گیا ہے۔ شیعہ کتب میں حضرت علیؑ کے ہر پیغمبر سے ملاقات اور مدد کرنے کے واقعات موجود ہیں۔

1 بدھ مت کے عقائد کے مطابق بودھی ستوا ایک عام انسان ہوتا ہے جو بودھی کی راہ پر چل پڑتا ہے اور آخر کار دنیا کی آلائشوں سے پاکیزگی حاصل کر لیتا ہے لیکن معدودے چند بودھی ستوا کے بارے میں یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ وہ آغاز سے ہی پاک و پاکیزہ تھے۔

• بدھ مت میں مانجوشری کو شیر کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ اگر انسانی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو حضرت علیؑ کے علاوہ کسی اور شخصیت کو اللہ کا شیر کا خطاب نہیں دیا گیا۔ مولانا روم کہتے ہیں کہ:

بہادری میں تم شیروں کے شیر ہو

اور فیاضی میں کیا ہو؟

یہ تو صرف تم ہی جانتے ہو! (مثنوی روم)

• بدھ مت میں مانجوشری کے ہاتھ میں شعلے اگلتی دو دھاری تلوار دکھائی جاتی ہے۔ گو کہ بدھ مت میں بتایا جاتا ہے کہ اس تلوار کا بلیڈ دونوں جانب سے تیز ہے اور ہمارے ہاں ذوالفقار کی آخری نوک دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں دو دھاری تلوار حضرت علیؑ کے علاوہ اور کسی کے ساتھ منسوب نہیں کی جاتی۔

• اس کے علاوہ بدھ مت میں مانجوشری کو 'واگش ورا' یعنی کہ 'بیان کا بادشاہ' قرار دیا گیا ہے۔ سنسکرت میں واگ کا مطلب ہے بیان۔ ہمارے ہاں حضرت علیؑ کو علم کلام، علم فقہ، تفسیر قرآن، علم طریقت، قواعد عربی گرائمر اور فصاحت و بلاغت کا بانی قرار دیتے ہیں (ابن ابی الحدید: شرح نہج البلاغہ)۔ سید رضیؒ نہج البلاغہ کے خطبوں کی تفسیر میں بارہا بیان کرتے ہیں کہ اگر اس کلام کو خدا اور رسولؐ کے بعد کسی کلام کے ساتھ بھی رکھ دیا جائے تو اس کا پلہ بھاری رہے گا۔ اس کے علاوہ عیسائی عالم ڈاکٹر پولس سلامہ کہتا ہے کہ اے ادب و سخن کے استاد! آپ کا شیوہ گفتار اور طرز تکلم اس سمندر کی طرح ہے جس کی وسعتوں اور گہرائیوں میں روحیں ایک دوسرے سے ملاقات کرتی ہے (داستان غدیر: 301)۔

• بدھ مت میں مانجوشری کو پانچ کے ہندسے سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں پنجتن پاک کا ایک راسخ ترین تصور موجود ہے۔

• بدھ مت میں مانجوشری کو آدیا شانتی یعنی کہ بے یار و مددگار کا مددکرنے والا قرار دیا جاتا ہے۔ شیعہ حضرت علیؑ کو مشکل کشاء کے نام سے پکارتے ہیں۔

شہید مرتضی مطہریؒ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی عظمت، عقل و فراست، معاملہ فہمی اور انصاف

پسندی، بہادری، ایثار، بیغرضی، کریمی اور فیاضی، انسانی حقوق کی پاسداری، غریبوں، یتیموں اور محتاجوں پر رحم اور شفقت، دشمن کے ساتھ نرمی اور اس سب کے باوجود طبیعت کی عاجزی اور ادب آداب کی وجہ سے محبت کی نگری کے بے تاج بادشاہ ہیں۔

افسوس کہ بدھ مت میں حضرت علیؑ کا اتنا واضح خاکہ ہونے کے باوجود بھی اس مذہب کے پیروکاروں نے تاریخی علیؑ کی شخصیت کو نہ پہچانا۔(یا تاریخ نے اس امر پر پردہ ڈال دیا) لیکن اگر ہم دیگر مذاہب کا جائزہ لیں تو انسانی تاریخ میں حضرت علیؑ سب سے زیادہ محبت کی جانے والی شخصیت ہیں۔مثال کے طور پر خلیل جبران حضرت علیؑ کے بارے میں یوں گویا ہوتا ہے کہ علیؑ قانون قدرت کی طرح ہے جو نہ آج بدلا ہے نہ کل بدلے گا۔وہ ایسا چشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوگا۔ بلکہ دن بہ دن اس کی طغیانی بڑھے گی (جبران خلیل جبران)۔علاوہ ازیں عیسائی ادیب ڈاکٹر پولس سلامہ کا کہنا ہے کہ بہت کم لوگ معنویت اور روح حقیقی کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ لوگوں کی اکثریت تو مادیت کے پیچھے بھاگتی ہے۔ مجھے حضرت علیؑ اور امام حسینؑ عالی مقام یاد آئے۔ میں بہت دیر تک گریہ کرتا رہا اور اشعار کہے:

’اے داماد پیغمبرؐ! آپ کی ذات ان ستاروں کے مدار سے بلند ہے اور نور کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ پاک اور منزہ باقی رہتا ہے۔

جس کو زمانے کا گرد وغبار میلا اور داغدار نہیں کر سکتا اور جو کوئی شخصیت کے لحاظ سے سر بلند ہے وہ کبھی فقیر نہیں ہو سکتا۔

اے شہید راہ دین ایمان! آپ نے مسکراتے لبوں کے ساتھ دنیا کے دردوں اور مشقتوں کو قبول کیا۔

ہاں زمانہ بوڑھا ہو جائے گا۔لیکن علیؑ کا نام چمکتی صبح کی طرح ہمیشہ قائم رہے گا۔
ہر روز، تمام صدیوں اور زمانوں میں علیؑ کا نام لے گا۔
صبح کی سفیدی اور نور کی طرح تمام بشریت کے چہرے پر چمکتا اور دمکتا رہے گا۔
اور ہر روز طلوع ہوا کرے گا‘ (داستان غدیر:301)۔

ایک اور عیسائی معاصر لکھتا ہے کہ اگر حضرت علیؑ ابن ملجم کے ہاتھوں شہید نہ ہوتے تو عین

ممکن تھا کہ وہ اس دنیا میں انتہائی لمبی زندگی گزارتے۔ کیونکہ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اور اپنے وجود میں کمال کا اعتدال قائم کیا تھا (این است آئین ما: مرحوم کاشف الغطاء۔ ترجمہ وشرح آیت اللہ ناصر مکارم: 193)۔

مسلمانوں کے قدیم اور بڑے فرقوں میں حضرت علیؑ کے عاشق کثرت سے پائے جاتے تھے۔ مولانا روم کہتے ہیں کہ

علی زمین پر تھے اور ان کا رابطہ آسمان سے تھا

وہ سچ اور حق کا نشان تھے

ہماری روح سچ سے محبت کرتی ہے (مثنوی روم)۔

شیعیان علیؑ کا عشق علیؑ تو ضرب المثل ہے۔ صعصعہ ابن صوہان العبدی ان معدودے چند اصحاب میں تھے جنہوں نے حضرت علیؑ کی تکفین میں حصہ لیا۔ مولائے متقیان کی تدفین کے بعد انہوں نے اپنا ہاتھ دل پر رکھا اور شدت جذبات میں سرزمین پر دے مارا۔ اس کے بعد انہوں نے مولا کی جدائی میں ایک طویل نوحہ پڑھا۔ اس کے چند اقتباسات زیر نظر ہیں:

'آپ پر رحمتیں نازل ہوں جس کی پیدائش پاک و پاکیزہ، صبر مضبوط اور جدوجہد مقدس تھی آپ نے اپنے مقصد کو پالیا۔

آپ اپنے رب سے جا ملے اور اس کے فرشتوں نے آپ کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔

آپ حضورؐ کے قرب میں پہنچ گئے اور اپنے بھائی مصطفیٰؐ کے حوض کوثر سے سیراب ہوئے۔

میری دعا ہے کہ آپ کی راہ پر چلوں اور ان سے محبت کروں جو آپ سے محبت کرتے ہیں اور ان سے بیزاری اختیار کروں جو آپ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور آپ کے دوستوں میں اٹھایا جاؤں۔

آپ کو وہ نظر آتا تھا جو کسی کو دکھائی نہ دیتا تھا۔

آپ نے اپنے بھائی پیغمبر اسلام کے ساتھ جنگیں لڑیں یہاں تک کہ فرسودہ رواجوں کا خاتمہ کر دیا اور اسلام اپنی مضبوط بنیادوں پر استوار ہو گیا۔

آپ پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں، آپ جیسی خصوصیات کسی کا خاصہ نہیں، کوئی دوسرا آپ جیسے کمال کو نہیں پہنچ سکتا

آپ نے حضورؐ کی آواز پر لبیک کہا، آپ نے دوسروں پر سبقت حاصل کی۔

آپ نے اپنی تلوار سے ان کی حفاظت کی، آپ نے ظلم کی کمر توڑ دی۔

خدا آپ پر رحمتیں نازل کرے اے امیر المومنین، آپ سب سے زیادہ حضورؐ کے قریب تھے۔ آپ یقین کامل کے مقام پر تھے'۔ (مطہری: 71-72)۔

معاویہ بن ابوسفیان کے دور میں جب علیؑ کا تذکرہ بھی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا، علیؑ کے دیوانوں کی زبان علی حق علی سچ کے نعرے لگاتی تھی۔ مثال کے طور پر سودہ الھمد انیہ نے معاویہ کے سامنے کہا کہ:

'اس کی ذات پر خدا کی نعمتیں نازل ہوں جسے قبر نے اپنے اندر سمولیا اور جس کے ساتھ انصاف دفن ہو گیا۔

خدا کا اس سے وعدہ تھا کہ اس جیسا کوئی دوسرا پیدا نہیں کرے گا لہٰذا وہ حق اور سچ کے ساتھ جاملا'۔

2.2۔ امام مہدیؑ اور اقوام عالم

آخر زمانے میں آنے والے نجات دہندہ، ہادی، مہدی، منجی کا عقیدہ بہت سے مذاہب میں ملتا ہے۔ ہم نے مذکورہ بالا حصے میں ایلیا نامی کتابچہ کا ذکر کیا۔ یہ کتابچہ ابراہیمی اور ہندوستانی ادیان پر بے مثال تحقیق پیش کرتا ہے۔ فی زمانہ اس تحقیق کو آگے بڑھانے کی شدت سے ضرورت ہے۔ لیکن ہم ایلیا کے مصنف کی میتریا کی توضیح سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اس تحقیق میں میتریا بودھی ستوا کو حضور اکرمؐ سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ ہم بحث کرتے ہیں کہ میتریا بودھی ستوا کا تصور امام مہدیؑ کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

'میتریا' سنسکرت کے لفظ 'میتری' سے اخذ ہوا ہے، جس کا مطلب ہے محبت اور شفقت سے پیش آنے والا۔ تبت کی کتاب موت (xxxv) میں تحریر ہے کہ 'میتریا کی شخصیت میں گزشتہ تمام

بدھا کی محبت یکجا ہوگی اور وہ محبت و آتشی کا باکمال مجموعہ ہوگا‘۔ بدھ مت کی اولین کتابوں میں سے ایک مہاسنگھیکا مہاوستو (Mahasanghika Mahavastu) ہے۔ اس کتاب کے مطابق 'میتر یا کا اولین نام اجیت ہے۔ اجیت کا مطلب ہے فاتح یا ناقابل تسخیر'(xxxvi)۔ بدھ مت کی مشہور روایات کے مطابق مہا آتما بدھا نے اپنی وفات سے کچھ دیر پہلے اپنے قریبی پیروکار آنندا کو میتر یا کے ظہور کی پیشگوئی کی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مستقبل میں آنے والے نجات دہندہ کے بارے میں کئی ایک پیش گوئیاں کی تھیں۔ میتر یا بودھی ستوا شکتی حاصل کرتا ہے نامی سوتر میں مہا آتما بدھا اپنے قریبی پیروکار شاری پوتر سے کہتے ہیں کہ:

'وہ یقیناً اس دنیا میں ظاہر ہوگا
اور حقیقی دھرم کا احیا کرے گا
اور تمام لوگ اس طرح سے اس کی جانب کھنچے چلے آئیں گے
جیسے پیاسے کسی شیریں شربت کی جانب لپکتے ہیں
اور تمام لوگ ہدایت کی راہ پر چل پڑیں گے
اور بدھا کی زمین ایک خالص زمین میں تبدیل ہوجائے گی
وہ جنہوں نے پاکیزہ زندگی گزاری وہ میتر یا کے زمانے میں دوبارہ اس دنیا میں لوٹ آئیں گے'۔

اگر اس سوتر پر غور کیا جائے تو یہ صریحاً رجعت کی نشاندہی کرتی ہے جس کا تعلق حضورؐ سے نہیں بلکہ امام العصرؑ کے زمانے سے ہے۔ بدھ مت میں میتر یا سے ملاقات کے کئی ایک طریقے بیان کئے جاتے ہیں۔ مثلاً:

1۔ بھکو مراقبہ کے دوران ان سے ملاقات کرتے ہیں۔

2۔ محبت و آتشی یا شفقت کے جذبات انسان کی آنکھوں پر سے پردے ہٹا کر ایسی بصیرت عطا کرتے ہیں جس کی وجہ سے میتر یا سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر قدیم پشاور کے رہنے والے عظیم بھکو اسنگا نے بارہ سال جنگلوں اور غاروں میں میتر یا سے ملاقات کے اشتیاق میں گزارے لیکن سخت ترین مراقبوں کے بعد بھی اسے میتر یا کا دیدار نصیب نہ ہوا۔

آخر کار جب وہ ایک بھوکے کتے کے ساتھ شفقت سے پیش آیا تو اسے میتریا کا دیدار نصیب ہوا۔ اس کے دل میں ہلکا سا گلہ پیدا ہوا کہ اسے اتنی ریاضت کے باوجود بھی دیدار نصیب نہ ہوا اور ایک کتے سے شفقت سے پیش آنے کی وجہ سے ملاقات کا اجازت نامہ مل گیا۔ اس لمحے میتریا نے اس کے خیالات پڑھ لئے اور جواب دیا کہ جب سے تم اس غار میں آئے ہو میں تمہارے آس پاس موجود ہوں۔ لیکن تمہاری آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے جس کی وجہ سے تم مجھے دیکھ نہ سکے۔ لیکن جب تمہارے دل میں محبت وآشتی اور شفقت کے جذبات پیدا ہوئے تو تمہاری آنکھوں پر پڑے پردے ہٹ گئے اور تم مجھے دیکھنے کے قابل ہو گئے۔

3۔ عین ممکن ہے کہ اس دنیا میں کی جانے والی نیکیوں کی وجہ سے موت کے بعد کسی کی آتما توشیتا جنت میں پرواز کر جائے اور میتریا کے ساتھ رہنے کا موقع مل جائے۔ بدھ مت کی مشہور دعاؤں میں ایک یہ بھی ہے کہ جب ہماری موت کا وقت آئے تو ہم میتریا کی جنت میں جا کر دوبارہ زندہ ہو جائیں۔

4۔ جب میتریا ظہور کریں گے تو فوت شدہ متقی لوگ دوبارہ سے زندہ ہو جائیں گے اور میتریا کے زمانے میں زندگی گزاریں گے۔

بدھ مذہب کے مطابق میتریا کا قیام توشیتا جنت میں ہے لیکن وہ گاہے بگاہے انسانوں کی ہدایت اور مدد کے لئے اس کرہ ارض پر بھی اترتے ہیں۔ البتہ ایک عام انسان انہیں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ آخری زمانے میں جب وہ توشیتا جنت سے اتر کر مستقل طور پر اس کرہ ارض پر رہائش اختیار کر لیں گے تو ہر انسان انہیں دیکھ سکے گا۔ تب وہ ایک مکمل دین کا احیا کریں گے اور انصاف کا بول بالا ہو گا۔

بدھ مت کی روایات کے مطابق مہا آتما بدھا نے اپنی وفات کے وقت اپنی عبا اپنے قریبی پیروکار مہا کشیاپا کے حوالے کی اور وصیت کی کہ جب میتریا اس دنیا میں تشریف لائیں تو وہ عبا انہیں پہنچا دے۔ مہا کشیاپا نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ککودانامی تین چوٹیوں والے پہاڑ کا رخ کیا، مہا آتما بدھا کا لبادہ اپنے اوپر اوڑھا اور عہد کیا کہ میتریا کے آنے تک ان کا بدن محفوظ حالت میں رہے گا۔ اس واقعہ کے تقریباً ایک ہزار سال کے بعد (ساتویں صدی عیسوی)

مشہور چینی زوار ہیون سانگ بدھ مت کے مقدس مقامات کی زیارات کے لئے ہندوستان پہنچا۔ اس نے ککوداپادا پہاڑی کی بھی زیارت کی۔ اس کے مطابق مہا کشیاپا اس پہاڑ کے اندر زندہ حالت میں موجود ہیں اور مہا آتما بدھا کا لبادہ میتریا کے حوالے کرنے تک زندہ رہیں گے۔ اس کے علاوہ عظیم کشمیری بھکشو ناگرجون کی پہلی صدی عیسوی میں لکھی گئی شاستر کے مطابق جب میتریا کا ظہور ہوگا تو وہ اس پہاڑ کو کھولیں گے اور اس میں سے مہا کشیاپا کو نکالیں گے۔ اس وقت وہ انہیں مہا آتما بدھا کا لبادہ پیش کریں گے۔ موجودہ دور میں جاپان کے بدھ مت میں مہا کشیاپا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

کچھ اور روایات کے مطابق مہا آتما بدھا نے اپنے چار قریبی پیروکاروں کو وصیت کی کہ وہ اس وقت تک نروان میں داخل نہ ہوں جب تک کہ میتریا سے ملاقات نہ کرلیں۔ بدھ مذہب کے پیروکاروں میں مراقبہ کی جو اقسام رائج تھیں ان میں سے ایک کمبھکا یعنی سانس کا مراقبہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ کمبھکا کی مشقوں کے دوران بھکشو/ سادھو کبھی سانس سینے کے اندر اور کبھی باہر خارج کر کے روک لیتے تھے۔ کئی ایک طویل اور کٹھن مراحل سے گزرنے کے بعد وہ سانس اپنے اندر روک کر اپنے دماغ کو محدود یا لامحدود عرصے تک مراقبے میں داخل ہونے کی ہدایت دیا کرتے تھے[1]۔ اٹھارویں صدی میں لکھی گئی گیرنڈا سمہیتا (Giranda Samhita) کے مطابق جب تک سانس انسان کے سینے کے اندر موجود ہوتا ہے تب تک اس کی موت واقع نہیں ہوتی[xxxvii]۔ مراقبہ میں جانے سے پہلے وہ اپنے دماغ کو ہدایت دیتے تھے کہ کب تک مراقبہ میں رہنا ہے اور کب دوبارہ سے بیدار ہو جانا ہے۔ اس مراقبے کے دوران ان میں اور ایک مردہ شخص میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ ان کا سانس اور اس کے ساتھ جسم کے باقی ماندہ افعال بھی رک جاتے۔ لیکن ان کا دماغ بیدار ہوتا جو ان کے جسم کو سڑنے اور گلنے سے بچائے رکھتا ہے۔ مہا کشیاپا کے واقعے اور کمبھکا مراقبے نے دور جدید کے ماہرین کی توجہ کھینچی اور اس سلسلے میں ماہرین کی بہت سی تصنیفات موجود ہیں[xxxviii]۔

آج بھی ایسے معدودے چند سادھو تبت، برما اور ہمالیہ کی بلند چوٹیوں پر ایسے حیرت انگیز مراقبے سرانجام دیتے ہیں۔

سانس روکنے کا مراقبہ بیسویں صدی کے آغاز تک ہندو رشیوں اور چند ایک مسلمان صوفیوں میں بھی رائج تھا۔ ان میں سے ایک کا مشاہدہ میری والدہ نے اپنے بچپن میں کیا تھا اور ایک کا مشاہدہ بذات خود میں نے اپنے ایک سروے کے دوران کیا۔ والدہ بتایا کرتی تھیں کہ پاکستان بننے سے پہلے جب ان کی عمر آٹھ یا نو سال ہوگی تو انہوں نے بہت سے لوگوں کو ریلوے اسٹیشن کی جانب جاتے دیکھا۔ وہ بہت تیزی میں نظر آتے تھے اور ان میں سے کچھ تو تقریباً بھاگے چلے جا رہے تھے۔ والدہ نے ایک شخص سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ چالیس روز پہلے ایک سادھو کو ریلوے اسٹیشن کے قریبی میدان میں زندہ دفن کیا گیا تھا۔ سادھو بابا اپنی کرامات کی وجہ سے چالیس روز قبر میں زندہ رہا۔ آج سب لوگوں کے سامنے اسے قبر سے باہر نکالا جائے گا۔ والدہ کو بھی وہ عجیب واقعہ دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ اس ہجوم میں شامل ہوگئیں۔ ریلوے اسٹیشن والے میدان میں پہنچ کر دیکھا تو کچھ لوگ قبر کھود رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرح کا ایک کمزور شخص باہر نکالا۔ کافی دیر تک وہ بے سدھ پڑا رہا۔ یوں جیسے کوئی مردہ ہو۔ وہ ایک دھوتی میں ملبوس تھا۔ وہاں ہندو منتری بھی موجود تھے۔ انہوں نے اس کا بدن صاف کیا۔ وہ کافی دیر تک اس کے منہ اور بدن پر پانی کے چھینٹے مارتے اور بھجن گاتے رہے یہاں تک کہ اس کی سانس چلنی شروع ہوگئی۔ اس کے بعد وہ منتری اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔

ہم نے لٹریچر میں کئی ایک صوفیوں اور پیروں کے مراقبوں کی محیر العقل داستانیں پڑھی ہیں۔ سندھ کے اٹھارہویں صدی کے ایک پیر کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ کئی روز تک چھت کے ساتھ الٹے لٹکے رہتے تھے۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے دوران مجھے کچھ مزاروں کا سروے کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران مجھے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے چند مراقبہ کی عملی مثالیں دیکھنے کو ملیں۔ چند مزارات پر پیر صاحب کے مراقبہ کے مقام کو محفوظ کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک مزار پر سورج کے مراقبہ کا مقام موجود تھا۔ مزار کے متولیوں نے بتایا کہ پیر صاحب صبح کے وقت اس جگہ چڑھتے سورج کا مراقبہ کیا کرتے تھے۔ ایک اور مزار پر مراقبہ کی مزید دو مثالیں نظر آئیں۔ متولی نے بتایا کہ پیر صاحب انتہائی سخت مراقبہ کیا کرتے تھے۔ وہ تپتی دوپہر میں لنگوٹا کس کر پتھروں پر لیٹ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے جسم سے کھال الگ ہونا شروع ہو جاتی۔

انٹرویو لینے سے پہلے میں ایک اور کمرے میں گئی تھی۔ وہاں میں نے ایک رنگین جنگلے کے اندر مستطیل شکل کا کالا پتھر دیکھا۔ ایک موٹے اندازے کے مطابق اس پتھر کا حجم اندازاً 3×6 اور موٹائی کم از کم 3 ہوگی۔ اس پتھر کو خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ جب میں نے اس پتھر کا مقصد پوچھا تو وہاں بیٹھے صاحب نے بتایا کہ وہ پیر صاحب کی چوکی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد جب ایک اور متولی نے پیر صاحب کے گرم پتھروں پر لیٹنے کا تذکرہ کیا تو مجھے خیال آیا کہ وہ پتھر شاید اسی مقصد کے لئے استعمال ہوتا ہوگا۔ اس کے بعد ان صاحب نے بتایا کہ مرحوم پیر صاحب اس سے بھی بڑھ کر کٹھن مراقبہ کیا کرتے تھے۔ انہوں نے زیر زمین ایک کمرہ کھدوایا تھا۔ جب وہ اس کمرے میں جاتے تو اس کے اوپر مٹی ڈال کر اسے بند کر دیا جاتا تھا۔ وہ گھپ اندھیرے میں چالیس دن تک ایک خاص مراقبہ کیا کرتے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہر جانب بند کمرے میں وہ سانس کس طرح لیتے تھے۔ متولی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ شاید ایک چھوٹا سوراخ کر کے ایک نلکا کمرے میں داخل کر دیا جاتا ہو۔ مجھے وہ کمرہ دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ گوکہ وہ کمرہ کسی کو دکھایا نہیں جاتا تھا لیکن میری تحقیق کا لحاظ کرتے ہوتے وہ صاحب مجھے کمرہ دکھانے لے گئے۔ اس کمرے کا راستہ مزار سے منسلک برآمدے سے جاتا تھا۔ وہاں سرخ قالین بچھی تھی۔ انہوں نے قالین اٹھائی تو اس کے نیچے لوہے کا ایک چوکور دروازہ نظر آیا۔ جب دروازہ کھولا گیا تو انتہائی تنگ و تاریک سیڑھیاں گہرائی میں اترتی نظر آئیں۔ میں نے تجسس کے مارے ایک آدھ سیڑھی اتر کر دیکھا تو اس جگہ کی لمبائی اور چوڑائی عین مردانہ قبر کے برابر تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے مجھے خیال آیا کہ وہ محفوظ شدہ مقام دو تین سو سال پہلے سانس کے مراقبے کے لئے استعمال ہوتا ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ دوسرے کٹھن مراقبوں کی طرح پیر صاحب سانس روکنے کا مراقبہ بھی کرتے ہوں۔ انہیں چالیس دن کے لئے اس قبر میں بند کر دیا جاتا ہو اور اس کے بعد انہیں قبر سے باہر نکالا جاتا ہو۔ ان کی وفات کے بعد میں اس مقام کو خاص متولیوں کے لئے زیارت گاہ بنا دیا گیا اور اس کی گہرائی میں اترنے کے لئے سیڑھیاں بنا دی گئیں۔ عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے اس مقام پر دروازہ لگا دیا گیا اور اس کے اوپر قالینیں ڈال دی گئیں تاکہ عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔

پروفیسر نکولس روئرچ (Nicholas Roerch) (1874ء-1947ء) ایک روسی پینٹر تھا۔ وہ علم آثار قدیمہ سے بھی خاص شغف رکھتا تھا۔ اس نے پانچ سال کوہ ہمالیہ پر پھیلی آبادیوں کی سیاحت میں گزارے۔ اس نے بلند پہاڑوں پر آباد بدھسٹ قبائل میں میتریا کے بارے میں پیشن گوئیاں اکٹھی کیں۔ وہ اپنی مشہور زمانہ کتاب التائی ہمالیہ میں ان پیشن گوئیوں کا خلاصہ کچھ اس طرح پیش کرتا ہے۔

1۔ آخری زمانے میں اقوام عالم کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کے خلاف ہو جائے گا۔ خون کے دریا بہہ جائیں گے۔

2۔ اس کے بعد لوگ لفظ استاد کا مطلب بھول جائیں گے لیکن جہالت کے اس دور کے بعد دنیا کے ہر کونے سے اساتذہ اٹھیں گے اور اس کی تعلیمات کا آغاز ہو جائے گا۔ ہر کس و ناکس ان تعلیمات سے فائدہ اٹھائے گا سوائے ان لوگوں کے جن کے دل جہالت کی وجہ سے سیاہ ہو چکے ہوں گے۔

3۔ اس کی انگلی میں پڑی انگوٹھی کا ایک پتھر دنیا بھر کے خزانوں سے زیادہ قیمتی ہو گا۔ اگر کوئی اتفاقی طور پر بھی اس کی مدد کرے گا تو اس کے بدلے میں اسے کئی سو گنا زیادہ فائدہ حاصل ہو گا۔

4۔ اس کی نشانیاں اس قدر واضح ہوں گی کہ ہر شخص انہیں پہچان لے گا۔ ہر شخص اس سے ملاقات کر سکے گا۔ اس وقت علم و ادراک کے دروازے کھل جائیں گے اور پکے ہوئے پھل درختوں سے ٹپکنا شروع کر دیں گے۔

نکولس بنیادی طور پر ایک پینٹر تھا۔ اس نے میتریا کی نشانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پینٹنگز بھی بنائیں۔ پروفیسر نکولس نے یہ بھی لکھا کہ ماضی میں کئی ایک افراد نے میتریا ہونے کا دعوی کیا لیکن بدھسٹ چرچ نے کسی کے دعوی کو قبول نہ کیا۔ دراصل وہ میتریا کی جسمانی نشانیوں کو جانتے ہیں[xxxix]۔

بدھ مت میں آج بھی مستقبل کے نجات دہندہ میتریا کا انتظار ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی ایک میتریا کے جھوٹے دعویدار بھی اٹھے۔ بدھ مت کے کسی بھی مذہبی ادارے نے

ان کے دعوی کو قبول نہ کیا اور وہ ذلت و رسوائی کی موت مرے۔ ان میں سے چند دعویداروں کا ذکر مندرجہ ذیل حصے میں کیا جاتا ہے:

چین بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ ازمنہ قدیم سے اس کی معیشت زراعت اور قدرتی بارش پر منحصر تھی۔ چین کی تاریخ نے طویل خشک سالی کے ادوار بھی دیکھے۔ اس مشکل وقت میں زراعت نہ ہونے کے برابر رہ جاتی، بھوک عام ہو جاتی اور وبائیں پھوٹ پڑتیں۔ اسی مشکل وقت میں میتریا کے نام پر بغاوتیں سر ابھارتیں۔ میتریا کے دعویدار عوام کو یہ کہہ کر بغاوت پر اکساتے کہ حکمران ظالم ہیں۔ ان کی شہ خرچیوں اور عیاشیوں کی وجہ سے قوم بھوک اور وبا کا شکار ہے۔ اسی وقت کا ذکر قدیم روایات میں ملتا ہے۔ لہٰذا اب میتریا کے ظہور کا وقت آ گیا ہے۔ اسی ضمن میں 613ء میں چین کے شمال مغرب میں سونگ زیزیان (Song Zixian) نامی ایک جادوگر نے میتریا ہونے کا دعوی کیا۔ وہ ہر رات اپنے خیمے سے شعبدہ بازی کے مظاہرے کرتا۔ قرب و جوار کے تقریباً ایک ہزار لوگ اس کی شعبدہ بازی کے قائل ہو گئے۔ آخر کار اس نے شاہی محل پر حملے کا ارادہ کیا تو شاہی افواج نے اسے اس کے حامیوں سمیت کچل دیا۔ بعد ازاں ان حامیوں کے خاندانوں کو بھی بے دردی سے تہہ تیغ کر دیا گیا[xl]۔

اسی طرح دسویں صدی عیسوی میں کوریا کے حکمران گنگ یی (Gung ye) نے میتریا ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے دعوی کو کسی بھی مذہبی حلقے نے تسلیم نہیں کیا۔ قلیل مدت کے بعد اس کے خلاف بغاوت ہوئی اور اسے بیدردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ چین کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی کئی ایک افراد نے مستقبل میں آنے والے نجات دہندہ کا دعوی کیا لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ان دعویٰ کرنے والوں اور ان کا ساتھ دینے والوں کا عبرت ناک انجام ہوا۔

بدھ مت کے پیروکار میتریا کی جسمانی علامات سے واقف ہیں۔ لوٹس سوتر کے مطابق میتریا کے جسم پر بتیس (32) بڑے اور اسی (80) چھوٹے نشان پائے جائیں گے[xli]۔ دیگھا نکایا کے ایک ذیلی عنوان نشانیوں پر گفتگو اور بدھ مت کے پالی آئین کے مطابق میتریا کی جسامت شیر جیسی اور رانیں شاہی ہرن جیسی ہوں گی۔ ان کے پاؤں ہموار، ایڑی نرم اور ابھری ہوئی اور چال سیدھی ہو گی۔ اس کی رنگت سنہری، چہرہ قدرے لمبا اور جبڑے شیر جیسے

ہوں گے۔ ان کے ابرو گھنے اور کمان دار ہوں گے اور ان کے درمیان ایک ابھرا ہوا نشان (ارنا۔urna) ہوگا جس سے نور نکلتا ہوگا۔ ان کی آواز گہری اور گونج دار ہوگی۔ اس کے علاوہ مہایانہ اور تھیراوڈا فرقوں میں اسی (80) چھوٹے نشانوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جن میں سے چیدہ چیدہ نشانیاں حاضر خدمت ہیں۔ ان کی چال خوبصورت اور شیر جیسی پروقار ہوگی۔ چلتے ہوئے وہ پہلے دایاں اور اس کے بعد بایاں پاؤں اٹھائیں گے۔ ان کا شکم گہری شکل کا (مقعر یا کمان نما) اور رانیں بھری ہوئی ہوں گی۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں لمبی اور ہاتھوں کی انگلیاں مخروطی ہوں گی۔ ان کے ناخن گلابی مائل، ناک ستواں، پیشانی کشادہ اور حواس خمسہ تیز ہوں گے۔ ان کا بدن چمکتا ہوا اور جسم کے گرد نور کا ہالہ ہوگا جس کی روشنی دور تک جائے گی۔ ان کے بال گھنگھریالے ہوں گے۔ ان کا جسم، بال اور سانس صندل جیسی خوشبو سے معطر ہوگی[1]۔ ان کے سر پر ایک ابھار (اشنشا ushnisha) ہوگا جو تاج کی مانند نظر آئے گا۔ بدھ مذہب کی تصویر سازی میں بعض اوقات ان کے سر پر پانچ کنگروں والا سنہرا تاج دکھایا جاتا ہے۔ میتر یا یا کلانڑ (میتر یا کی پیشگوئی) میں کہا گیا ہے کہ جب وہ آئے گا تو تمام تکلیفیں دور ہو جائیں گی اور خوشی اور اطمینان کا دور دورہ ہوگا[xlii]۔

اگر ہم اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو رسول خداؐ اور ائمہ اطہارؑ نے امام مہدی عجؑ کی جو نشانیاں بتائیں ان میں سے کچھ قدیم مذاہب میں پائی جانے والی نشانیوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔ مثلاً ملا محمد باقر مجلسی بحار الانوار (حدیث 7) حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ نے حضور اکرمؐ سے روایت کیا ہے کہ 'مہدی ایک قریہ (گاؤں) سے ظہور کریں گے اور اس کا نام کرعہ ہوگا۔ حضوؐر سے یہ بھی روایت ہے کہ ان کی ناک تمام انسانوں سے زیادہ قوت شامہ رکھتی ہوگی' (بحار الانوار: حدیث 11)۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ 'اس کا رنگ گندمی، قد میانہ، شکم چوڑا، ران فربہ اور شانوں کی ہڈیاں مضبوط ہوں گی۔ ان کی زلف شانوں پر

1 شاید یہ اتفاق ہو لیکن امر واقع ہے کہ روز عاشورہ سرخ ہونے والی خاک شفا کی تسبیحوں سے صندل کی خوشبو اٹھتی ہے۔

ہو گی۔ ان کے چہرے سے نور ساطع ہو گا۔ پشت پر جلد کی رنگت کے دو تل ہوں گے۔ ان کا تل نبیص کے تل کی مانند ہو گا۔ ان کے دو نام ہوں گے ایک ظاہری یعنی کہ محمد اور دوسرا مخفی یعنی کہ احمد۔ جب وہ اپنا پرچم ہلائیں گے تو اس سے مشرق اور مغرب دونوں روشن ہو جائیں گے۔ وہ جس شخص کے سر پر ہاتھ رکھیں گے اس کا دل فولاد سے بھی زیادہ مضبوط ہو جائے گا' (جمال منتظر)۔

امام حسن مجتبیٰؑ سے منقول ہے کہ گویا کہ 'میں نجف (کوفہ) میں ان کے سر پر سفید پرچم لہراتا ہوا دیکھ رہا ہوں اور یہ کہ ان کے پرچم پر رقم ہے ''البیعۃ للہ'' بیعت خدا کے لئے ہے' (کفایہ الاثر ص363)۔ الجامع الصغیر میں امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ 'ان کی ناک لمبی اور پیشانی روشن ہو گی' (ینابیع المودۃ ص435)۔ اس کے علاوہ اصعاف (130:2) پر درج ہے کہ 'ان کی دونوں آنکھیں سرمئی، ابرو کمان جیسی، ناک لمبی، داڑھی بہت گھنی اور گھنگھریالی ہو گی۔ ان کے دائیں رخسار اور دائیں ہاتھ پر تل ہو گا'۔ امام رضاؑ سے منقول ہے کہ 'ان کے پاس حضرت موسیٰؑ کا عصا اور حضرت سلیمانؑ کی انگشتری ہو گی' (جمال منتظر: 355)۔ 'اس کے علاوہ یہ کہ ان کا لباس موٹا اور غذا سادہ ہو گی' (غیبت الشیخ۔ غیبت النعمانی۔ جمال منتظر: 475)۔ ایک مرتبہ دعبل خزاعی شاعر اہل بیت نے امام رضاؑ کو قصیدہ سنایا۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے کہ:

خروج الامام لا محالۃ خارج

یقوم علی اسم اللّٰہ والبرکات

یمیز فینا کل حق وباطل

ویجری علی النعماء والنقمات

ترجمہ: امام کا خروج لا محالہ ہو گا۔ وہ خدا کے حکم اور اس کی برکتوں سے قیام کریں گے۔ وہ ہمارے درمیان حق و باطل کو جدا کریں گیا ور لوگوں کو نعمتوں اور۔۔۔ کے ذریعے جزا و سزا دیں گے۔

امامؑ نے یہ شعر سن کر گریہ کیا اور فرمایا کہ 'اے دعبل تمہاری زبان سے روح

القدس بول رہا ہے۔کیا تم جانتے ہو کہ وہ امام کون ہیں؟ میں نے کہا نہیں ۔اس کے بعد امامؑ نے امام مہدی عج کا تعارف بیان کیا'۔(ینابیع المودہ :454)۔علاوہ ازیں ابو خالد نے امام محمد باقرؑ سے عرض کی کہ' آپ کے والد نے صاحب الامر کے ایسے اوصاف بیان کئے ہیں کہ اگر وہ راستے میں مل جائیں تو ان کا ہاتھ پکڑ لوں' (کہ یہ صاحب الامر ہیں) (70)۔یہی وجہ ہے کہ منتظرین امام کے قلوب انہیں اس طرح جانتے ہیں جیسے کوئی انسان صبح کے طلوع ہونے یا سورج کے نکلنے کو پہچانتا ہے اور وہ کذابوں کے جھوٹے دعوؤں سے دھوکہ نہیں کھا سکتے ۔

تیسرا باب

بیانیہ حصہ

اس باب کو مندرجہ ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی کہ کیس اسٹڈی اور قصے چند مولائیوں کے۔

3.1۔مجالس امام حسینؑ کی ارتقائی تاریخ-کیس اسٹڈی

اس حصے میں اختصار کے تحت صرف ایک علاقے کی مجالس امام حسینؑ کی ارتقائی تاریخ بیان کی جائے گی۔اس بیان کے دو مقاصد ہیں: ایک تو یہ کہ واضح کرنا کہ مجالس امام حسینؑ دین کے بدن میں زندہ عضو کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔وہ وقت اور حالات کے ساتھ نمو پاتی ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق عزاداروں کی تربیت کرتی ہیں۔دوسرا مقصد نوجوانوں کو باور کرانا ہے کہ آج مجالس جس رنگ وروپ میں ہیں، ماضی میں ایسی نہ تھیں۔ ہر دور کے علما، دیگر مقررین اور عزاداروں نے جان ومال اور عزت کی قربانی دے کر انہیں زندہ رکھا اور ان کی نمو میں حصہ ڈالا۔انہوں نے عقلی، علمی اور مالی مدد کے ذریعے مجالس امام حسینؑ کو اس مقام تک پہنچایا۔حتیٰ کہ بعض اوقات انہیں اپنے خون سے بھی سینچا۔انہوں نے اپنا فرض سرانجام دے دیا۔اب ہماری باری ہے کہ ہم اپنے علم، وقت اور پیسے میں سے اس بابرکت ادارے کا حصہ نکالیں تاکہ اسے اپنی اگلی نسلوں تک منتقل کرسکیں۔

مندرجہ ذیل حصے میں مجالس امام حسینؑ کی ارتقائی تاریخ م30 نے سنائی۔ان کا تعلق پنجاب کے انتہائی شمالی علاقے سے تھا۔انہوں نے اپنے علاقے کی مجالس کی ارتقائی داستان کچھ اس طرح سنائی:

'میں اپنے بزرگوں کی سینہ بہ سینہ چلنے والی داستانیں آپ کی خدمت میں پیش کررہی ہوں۔ہمارا تعلق سادات سے ہے۔آج سے سات سو سال پہلے ہمارے بزرگ کشمیر سے ہجرت کرکے موجودہ قیام گاہ تک پہنچے تھے۔وہ اپنے ساتھ کشمیری کاریگروں کے کئی ایک گروہ لے کر آئے تھے۔اس وقت سید تبلیغ کی خاطر ایک مقام سے دوسری جانب ہجرت کرتے رہتے تھے۔وہ جب بھی ہجرت کرتے تو اپنے ساتھ بڑھئی، لوہار، گوالیا ور زمینوں پر کام کرنے والے

افراد اپنے ساتھ لے کر چلتے۔ ان میں سے اکثر سیدوں کے مرید ہوتے اور ان کے ساتھ ہجرت کرنا سعادت سمجھتے تھے۔

ہماری موجودہ قیام گاہ پاکستان کے صوبہ پنجاب اور خیبر پختونخواہ کے سنگم پر واقع ہے۔ جب ہمارے بزرگوں نے اس جگہ قیام کا فیصلہ کیا تو یہ ایک مقامی خان کی جائیداد تھی۔ اس وقت خان کا بیٹا مرض الموت میں مبتلا تھا۔ جب اسے اپنے علاقے میں سیدوں کی آمد کی خبر ملی تو اس نے انہیں دعا کرنے کے لئے بلایا۔ ہمارے ایک بزرگ کی دعا کی وجہ سے اس کا بیٹا شفایاب ہو گیا۔ اس کے بعد خان نے ایک بڑا علاقہ ہمارے بزرگوں کے نام کر دیا اور اس طرح ہمارے وسیع و عریض سیدان کی بنیاد پڑی۔

جب مغل شہنشاہ عالمگیر کا دور آیا تو اس نے سادات پر بہت ظلم ڈھائے۔ وہ ان کی بستیاں اجاڑ دیتا، ان کا قتل عام کرتا اور ان کے سروں کے مینار تعمیر کروایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ہمارے بزرگ تقیہ میں چلے گئے۔ انہیں اپنا شجرہ یاد تھا اور نماز شیعہ احکامات کے مطابق لیکن ہاتھ باندھ کر پڑھتے تھے۔ زمانے کے مصائب نے ان سے ذکر حسینؑ بھی چھڑوا دیا تھا۔ اسی طرح شب و روز گزرتے جا رہے تھے کہ بیسویں صدی کے آغاز پر ایک نیک بخت بچہ پیدا ہوا۔ اس بچے کو قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک اہل سنت مولوی کے پاس بھیجا گیا۔ انہوں نے مولوی صاحب سے تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ان کا طریقہ تعلیم صحیح نہیں ہے۔ ان کے والدین پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچہ یا تو کند ذہن ہے یا اس کا رجحان کسی غلط راستے پر ہو گیا ہے۔ ایک مرتبہ وہ ریلوے اسٹیشن کے قریب کھیل رہے تھے تو ایک صاحب کو بنچ پر بیٹھے دیکھا۔ ان صاحب کی ذات میں ایسی کشش تھی کہ وہ ان کے پاس چلے گئے اور باتیں شروع کر دیں۔ کچھ ہی دیر کے بعد انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ مجھے قرآن پاک پڑھا دیں گے؟ ان صاحب نے کہا کیوں نہیں؟ وہ صاحب اثنا عشری شیعہ تھے۔ وہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر تھے اور اسی روز تبادلہ ہو کر ہمارے شہر آئے تھے۔ اس کے بعد ان صاحب نے اس نیک بخت بچے کو نہ صرف قرآن پاک بلکہ شیعہ احکامات اور فروع دین کی بھی تعلیم دی۔ بعد ازاں اسی بچے نے تمام برادری کے فروع دین کو درست کیا اور مجالس امام حسینؑ کا آغاز کیا۔

انہوں نے اپنے گھر کے وسیع دالان میں سیدان کی پہلی امام بارگاہ قائم کی اور علم حضرت عباس علمدارؑ نصب کیا۔ آج اس واقعے کو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ حسینی انقلاب کا علم بردار وہ عظیم علم آج بھی اس قدیمی امام بارگاہ میں موجود ہے۔ اس علم کا پھیرا تو گاہے بگاہے بدلتا رہتا ہے، لیکن اس کا ڈنڈا آج بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ مجالس امام حسینؑ تو ویسے بھی مقناطیسی صلاحیت رکھتی ہیں۔ لیکن ہمارے سیدان میں چونکہ وہ عارضی طور پر بند ہوگئی تھیں اس لئے جب ان کا آغاز ہوا تو رکے ہوئے دریا کی طرح ہوا۔ بعد ازاں ہماری امام بارگاہ نے ملک کے بہترین نوحہ خواں اور مقررین کو جنم دیا۔

کچھ عرصے کے بعد عزاداروں کی تعداد بڑھ گئی تو کئی ایک خاندانوں نے اپنی زمین کا کچھ حصہ وقف کیا اور سیدان کے عین وسط میں ایک نئی امام بارگاہ تعمیر کی گئی۔ اس امام بارگاہ میں اول اول صرف مردانہ مجلسیں برپا ہوا کرتی تھیں اور عورتیں انہی مجالس میں شرکت کیا کرتیں۔ بعد میں عورتوں نے الگ سے اپنی مجالس کا آغاز کیا۔ مجالس میں مقامی عزادار، ذاکرین اور علماء حصہ لیا کرتے تھے۔ گو کہ پڑھے لکھے لوگ کم ہوتے لیکن علماء کو باقاعدگی کے ساتھ دعوت دی جاتی تھی۔ ان میں ہر قسم کے علماء پائے جاتے تھے۔ کچھ عام فہم مجالس پڑھتے جبکہ بعض علما کا بیان پیچیدہ ہوتا۔ کبھی کبھار ان کے بیان میں گرائمر اور ہم صوتی الفاظ کی تکرار ضرورت سے زیادہ بڑھ جایا کرتی تھی۔ مثلاً اگر حضرت علیؑ کی کسی خصوصیت کا بیان ہوتا تو کم از کم دس سے لے کر پندرہ ہم آواز الفاظ کی تکرار کی جاتی تھی۔ اسی طرح قرآن پاک کی کسی آیت کی تفسیر کو بیان کرتے ہوئے الفاظ کا ماخذ، مصدر اور کئی ایک مطالب بیان کئے جاتے تھے۔ اس طرز بیان کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگ تو علما کے گرویدہ ہو جاتے لیکن کم یا غیر تعلیم یافتہ لوگ ان کی مجالس میں دلچسپی کھو بیٹھتے اور ذاکرین کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ گو کہ ذاکری اس دور میں سادہ ہوا کرتی تھی لیکن ذاکرین کا زیادہ تر وقت فضائل اور مصائب میں گزر جاتا۔ ان کے بیان میں احکامات یا دیگر دینی مسائل کا ذکر کم ہی آتا تھا۔

ملک کے ہر سیدان کی طرح ہمارے سیدان میں بھی بہترین شیعہ سنی تعلقات تھے۔ علاقے میں امن وامان اور مذہبی رواداری کا رواج تھا۔ جب ہمارے بزرگ اس جگہ آباد ہوئے تو

انہوں نے کشمیری کاریگروں کو گھر بنانے کے لئے مفت زمینیں فراہم کیں اور کئی سو سال گزرنے کے باوجود بھی ان سے رقم کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ دوسری جانب کشمیری کاری گر بھی ہمیشہ سیدوں کے ساتھ وفادار رہے۔ سیدان میں ایک ہی مسجد تھی۔ اس چھوٹی سی مسجد میں ایک ہی وقت میں دو الگ جماعتیں ہوتیں۔ شیعہ ایک جانب اور اہل سنت حضرات مسجد کی دوسری جانب اپنے طریقے کے مطابق نماز ادا کیا کرتے تھے۔ تمام شیعہ سنی حضرات نماز کے وقت ایک دوسرے سے ملاقات کرتے اور حال احوال دریافت کئے جاتے تھے۔ 1960ء یا 1970ء کی دہائی میں آبادی میں اضافہ ہو گیا تو شیعہ حضرات نے اپنے لئے الگ مسجد کا انتظام کر لیا۔ مسجدیں تو دو ہو گئیں لیکن دل ایک ہی رہے۔ تمام کشمیری روز عاشورہ امام بارگاہ آتے، نیاز تقسیم کرتے اور سارا دن امام بارگاہ میں گزارتے۔ وہ لوگ جلوس کے ساتھ بھی چلتے اور سبیلیں لگاتے۔

1980ء کی دہائی میں علاقے کا رنگ ہی بدل گیا۔ علاقے میں وہابیت کو ہوا تو پہلے سے ہی دی جا چکی تھی۔ اب سرکاری طور پر وہابی افراد کو پیشہ ورانہ اور مالی معاونت بھی حاصل ہو گئی اور یوں کئی ایک گمنام افراد کا شمار امراء میں ہونے لگا۔ علاقے میں زکوٰۃ فنڈ کے آفس کھل گئے اور انہی نئے امراء میں سے کچھ اس کے اعلیٰ عہدے دار بنا دیئے گئے۔ کچھ کو بڑے بڑے تعمیراتی ٹھیکے دیئے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے بعض افراد کے بوسیدہ مکانوں کی جگہ عالی شان چوباروں نے لے لی۔ ان کے بچے ٹانگے کی جگہ کاروں میں سوار ہو کر اسکول آنا شروع ہو گئے۔ اس وقت تک ہمارے متوسط درجے کے شہر میں کاریں عام نہیں ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے ان بچوں کی سواری کو خصوصاً محسوس کیا گیا۔ زمانے کی ہوا کچھ ایسی بدلی کہ وہی مسجد جو سیدوں نے اہل سنت حضرات کے لئے وقف کی تھی فقہی تنازعوں کا مرکز بن گئی۔ نئے نویلے نو دولتیوں نے عرصے سے مقیم اہل سنت مولوی صاحب کی جگہ ایک وہابی مولوی کا تقرر کر دیا۔ اب ہر پرانی روایت بدعت ٹھہری، شیعہ کافر قرار دیئے گئے اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کا آغاز ہو گیا۔ افسوس کہ وہ علاقے جہاں سیدوں نے اپنے ساتھ رہنے والے غیر شیعہ حضرات کی والدین کی طرح سرپرستی کی تھی اور جو محبت و آشتی اور مذہبی رواداری سے گندھے ہوئے تھے وہیں پر انہی سیدوں کو کافر قرار دے دیا گیا اور پھر اس کے بعد عرصہ دراز تک شہر کی سنہری گلیاں

لال رہیں۔ ہر در پر خوف کا ڈیرہ ہوتا۔ والدین جوان بچوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دیتے۔ پولیس آتی اور بغیر کسی جرم کے اسکول اور کالج کے بچوں کے گروہ کے گروہ اٹھا کر لے جاتی۔ بلا جرم وخطا جوانوں کے ریکارڈ خراب کئے گئے۔ کئی ایک گھرانے ہجرت پر مجبور ہوئے اور ملک سے باہر پناہ لینے کا رواج عام ہوا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اہل بیت پاک کا ذکر مقناطیسی طاقت رکھتا ہے۔ لہٰذا ان دگر گوں حالات میں بھی کچھ پرانی طرز کے اہل سنت بزرگ اور ان کے اہل خانہ مجالس میں شرکت کیا کرتے تھے۔ ان ہی میں ایک بزرگ لوہار بھی تھے۔ ایک مرتبہ محلے کے چند کرتا دھرتا وہابیوں نے انہیں بلا کر دھمکیاں دیں کہ شیعہ کمیونٹی سے اپنے تعلقات ختم کر دو ورنہ تمہارے ساتھ بائیکاٹ کر دیا جائے گا اور تمہارے مرنے کے بعد نہ تو تمہارا جنازہ پڑھا جائے گا اور نہ ہی اہل سنت کے قبرستان میں دفنانے کی اجازت دی جائے گی۔ انہوں نے جواب دیا کہ جو تمہارے جی میں آئے وہی کرو۔ جن کے ذمے میرا کفن دفن ہے وہ اپنا کام کرنا جانتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا گیا جس کے بعد ان کے گاہک آدھے سے بھی کم رہ گئے اور ان کی تنگ دستی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دن سختی میں گزارے۔ سب سے بڑا دکھ تو یہ تھا کہ ان کے قریبی رشتہ دار محلے کے نو دولتیوں کے ڈر سے انہیں سلام تک نہ کرتے تھے۔ جب وہ فوت ہوئے تو ان کے کفن دفن کا انتظام سیدوں نے کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بڑی بیٹی نے انہیں خواب میں دیکھا۔ وہ کسی چار پائی پر بیٹھے تھے۔ ان کے آس پاس اندھیرا تھا۔ ان کا چہرہ نورانی تھا اور ان کے جسم سے گویا کہ نور کی لہریں نکلتی تھیں۔ انہوں نے بیٹی سے کہا کہ تم کیوں میرے لئے اتنا روتی ہو؟ اب تو میں بہت اچھی جگہ پر ہوں اور بڑے آرام میں ہوں۔

اسی طرح ایک نابینا ضعیفہ امام حسینؑ کے ساتھ گہری عقیدت رکھتی تھی۔ اس کا کمانے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے زکوٰۃ فنڈ سے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ایک دن فنڈ کے چند عہدہ داروں نے اسے طلب کیا اور تنبیہ کی کہ وہ امام بارگاہ جانا چھوڑ دے ورنہ اس کا وظیفہ بند کر دیا جائے گا۔ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا تو کر دو۔ جن کے صدقے میں مجھے رزق مل رہا ہے وہ تو ملتا ہی رہے گا۔

انہوں نے کہا کہ جب تم مروگی تو ذلیل وخوار ہوگی۔ کوئی بھی تمہارا جنازہ نہیں پڑھائے گا۔اس نے بھی لوہا روالا جواب دیا اور واپس چلی آئی۔ وہ بھی ضد کی پکی تھی۔ پہلے تو وہ کبھی کبھار امام بارگاہ جایا کرتی تھی۔اب وہ روزانہ صبح سویرے امام بارگاہ چلی جاتی اور شام تک وہیں بیٹھی رہتی۔ 1980ء کی دہائی میں امام بارگاہوں یا ضریح کو تالا لگانے کا رواج نہیں تھا۔ امام بارگاہ کا درجہ ایک کمیونٹی سنٹر کا ہوا کرتا تھا جہاں سارا دن محلے کی عورتیں نماز پڑھنے، تلاوت قرآن کے لئے، یا صرف ضریح میں کچھ دیر بیٹھنے کے لئے آتی رہتی تھیں۔ امام بارگاہ میں کوئی بھی جاتا کچھ نہ کچھ اس نابینا عاشق حسینؑ کے ہاتھ پر رکھ کر آتا۔شام کو جب وہ بھری جھولی کے ساتھ در حسینؑ سے اٹھتی تو لوگ باقاعدگی سے اس کے گھر کھانا بھجوایا کرتے تھے۔ بائیکاٹ سے پہلے وہ وظیفہ لینے زکوٰۃ فنڈ کے آفس جاتی، اپنا سودا سلف لانے دکانوں پر جاتی، گھر کا کام کرتی اور اپنا کھانا پکایا کرتی تھی۔ بائیکاٹ کے بعد وہ ایک ایسی وی-آئی-پی شخصیت بن گئی جس کی ضروریات زندگی خود چل کر اس کے گھر آنے لگیں۔لوگوں کو اس سے ہمدردی تھی۔ وہ تن تنہا، عمر رسیدہ اور نابینا تھی۔ روزی کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کے باوجود اس نے امام حسینؑ کا در نہ چھوڑا تھا۔اس کی موت کے بعد شیعہ کمیونٹی نے انتہائی محبت اور عقیدت کے ساتھ اس کے کفن، جنازے اور دفن کا انتظام بھی کیا۔

2000ء کی دہائی میں حالات نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھایا۔اب بتدریج حوزہ علمیہ قم سے فارغ شدہ علماء اور عالمہ نے مجالس کی ذمہ داری سنبھال لی۔ علامہ شہید مطہریؒ فرماتے ہیں کہ علماء نے کسی بھی حال میں قوم کا ساتھ نہ چھوڑا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان خواتین وحضرات نے مشکل حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے دین کی بے لوث خدمت کی۔ انہوں نے شیعہ کمیونٹی کے بنیادی تصورات اور نظریات پر بے لاگ تبصرے کئے اور عمومی غلطیاں درست کیں۔ توحید، رسالت، امامت، واقعات کربلا میں موجود افراط وتفریط کو زیر بحث لایا گیا۔اس کے علاوہ انہوں نے پیدائش، موت، شادی بیاہ، حجاب، نماز کی اوقات کے ساتھ پابندی کے احکامات واضح کئے۔ البتہ اس سلسلے کا سب سے بڑا انقلاب خواتین کا حجاب تھا۔ اسی باب کے حصہ 2۔3 میں حجاب کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

2000ء کی دہائی میں مجالس امام حسینؑ کے موضوعات میں ایک مرتبہ پھر سے تبدیلی بھی

واقع ہوئی۔ نئی صدی میں داخلے کے ساتھ ہی مجالس امام حسینؑ کا موضوعاتی رخ امام العصر کی جانب مڑ گیا۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ البتہ وہ تبدیلی کسی انسان کی لائی ہوئی نہیں بلکہ کسی قدرتی انقلاب کی مرہون منت تھی۔ ہر مجلس، ہر گھر، ہر مقام امام کے نام سے روشن ہو گیا۔ ہر مجلس میں دعائے امام زمانہ کا اجرا ہو گیا اور کوئی نہیں جانتا کہ اس نے یہ دعا کب اور کس سے سیکھی۔

1990ء کی دہائی تک مجالس امام حسینؑ احکامات، واقعات رسول اللہؐ، حضرت علیؑ کی مدح اور مصائب امام حسینؑ تک مختص تھیں۔ 1990ء کے اواخر یا یوں کہنا چاہیے کہ اکیسویں صدی (2000ء) کے آغاز کے ساتھ ہی مجالس امام حسینؑ کا رنگ بدل گیا۔ علما ہوں یا ذاکرین اور دوسرے نظم یا حدیث پڑھنے والے، سب نے کسی ظاہری تحریک کے بغیر ہی ثناء مولا علیؑ کی بجائے ظہور امام زمانہ کو اپنا موضوع بنا لیا۔ اس کے ساتھ ہی مجالس کے مضامین میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ عالمی حالات وواقعات، معاشیات اور سیاسیات پر سیر حاصل مباحث کئے گئے اور ان سے نپٹنے کے لئے نئے لائحہ عمل تیار کئے گئے۔ مجالس کے علاوہ درس وتدریس اور دعا ومناجات کا سلسلہ بھی عام ہوا۔ خواتین میں شرعی حجاب کا رواج زیادہ ہوا۔ عام شیعہ گھروں میں موسیقی اور راگ ورنگ کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ تقوی وپرہیزگاری میں اضافہ ہوا۔ ادب آداب، طرز گفتگو، طلب معاش میں تبدیلی آئی۔ ان ہی سالوں میں غیر شیعہ افراد تیزی سے شیعہ عقائد سے متاثر ہوئے۔ مجالس کی کرامات اور اشاروں میں اضافہ ہوا۔ 1980ء کی دہائی میں مسلم ممالک نے خوراک، میک اپ اور دیگر ضروریات زندگی سے متعلق مغربی کمپنیوں کے ساتھ الحاق کیا اور بازاروں میں بین الاقوامی فارمولا پر تیار کی گئی مصنوعات کی بھرمار ہو گئی۔ ان میں سے بعض مصنوعات میں مشکوک اجزا بھی شامل تھے۔ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل تک پہنچتے پہنچتے عوام ان مشکوک اجزا سے متنبہ ہو چکے تھے۔ گویا کہ وہ علماء کی کاوشوں اور سائنسی معلومات کی وجہ سے مہین سطح پر جا کر حلال وحرام کا تجزیہ کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ انہی سالوں میں شیعہ علماء اور نوجوانوں کو تحقیق کے زیادہ مواقع فراہم ہوئے۔ دینی علوم اور جدید دور کے تقاضوں پر عام فہم لیکن گراں قدر کتب لکھی گئیں اور بتدریج ان کا ترجمہ کئی ایک زبانوں میں ہوا۔ شیعہ افکار اور دور حاضر کے مسائل پر تربیتی کورس اور کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ گویا کہ اکیسویں صدی کے آغاز کے

ساتھ ہی مجالس امام حسینؑ کا رابطہ عالمی مضامین کے ساتھ بڑھ گیا۔ اسی صدی میں دنیا کے ماحولیاتی نظام میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ قدرتی حادثات مثلاً زلزلے، سیلاب اور سونامی نے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ پرانی بستیاں تباہ ہوگئیں۔ نئے جزیرے اور پانی کے وسائل سامنے آئے۔ اسی کے ساتھ استبدادی قوتوں نے مذہبی، فقہی اور لسانی جھگڑوں کو ہوا دی اور معصوم انسانوں کے خون کے ساتھ ہولی کھیلی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہابیت ایک نئے رنگ میں ابھری۔ درس وتدریس اور میڈیا کی دوسری نشریات کے ذریعے نوجوانوں کو ایک مرتبہ پھر سے باور کرایا گیا کہ سب انسان برابر ہوتے ہیں۔ کسی کا درجہ دوسرے دنوں سے بلند نہیں۔ سب دن برابر ہوتے ہیں۔ شب قدر یا شب معراج کا درجہ دوسرے دنوں سے زیادہ نہیں۔ اسی وقت امام العصرؑ کے بارے میں معلومات کو کچھ اس طرح گڈمڈ کر کے پیش کیا گیا کہ مخالفین کی سوچ پراگندہ اور ان کے دل گدلے ہوگئے۔ ان دنوں ہم نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ امام کا نام سننے کے بعد مخالفین کے چہروں پر اندھیرا دیکھا۔ لیکن خدا کا کرنا دیکھیے کہ چند ہی مہینوں میں اس تحریک کے پھیلانے والوں کے پیسے ختم ہوگئے اور وہ اپنی گٹھڑیاں سمیٹ کر میڈیا سے غائب ہوگئے۔ یوں مقدسات کے خلاف اٹھنے والی وہ تحریک اپنی موت آپ مرگئی۔

سب سے بڑی بات تو یہ کہ کم از کم گزشتہ بیس سالوں سے محرم الحرام کے پہلے عشرے کے موضوعات ایک جیسے رہے۔ ہم نے اس عجیب امر پر کئی مرتبہ تحقیق کی اور ہمارے اوپر حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ جس سال نماز کا موضوع چلتا ہے اس سال دنیا کی تقریباً تمام امام بارگاہوں میں نماز کا موضوع چلتا ہے۔ جب حجاب کی بات ہو تو ہر عالم دین حجاب کا موضوع لے کر چلتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے جب مادر امام حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا موضوع تھا تو کئی ایک امام بارگاہوں میں اسی موضوع پر مجالس پڑھی گئیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات مختلف مقامات پر پڑھنے والے علماء کے فقرے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو سوشل میڈیا پر موجود محرم الحرام کے پہلے عشرے کی مجالس پر تحقیق کر کے اس حیرت انگیز امر کی تصدیق کر کے دیکھ لیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غیب میں رہ کر مجالس کے موضوعات کو ترتیب دے رہا ہے اور دنیا میں پھیلی ہوئی شیعہ قوم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر رہا ہے۔ یہاں پر ہمیں امریکی اسکولوں کی (whole

(school curriculum) کی پالیسی یاد آجاتی ہے۔ان کے ہاں ایک ہی اسکول میں ایک ہی جماعت کے کئی ایک حصے ہوتے ہیں۔مثلاً چوتھی جماعت کے پانچ یا چھ حصے ہوں گے۔ان کے اساتذہ بارہا میٹنگ کرتے ہیں تاکہ ایک ہی جماعت کے کئی ایک حصوں کے طلبا کا ایک جیسا سبق رہے اور ہر بچہ سیکھنے کے ایک ہی مرحلے پر ہو۔کیا کہنے اس پاک ہستی کے جس نے پورے کرہ ارض پر پھیلی حسینی درسگاہ کے طلبا کو (whole school curriculum) کے ذریعے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا ہوا ہے۔

3.2۔ قصے چند عاشقان حسینؑ کے

اس حصے میں عاشقان محمد و آل محمد کے چند واقعات بیان کئے جائیں گے۔یہ قصے ان کے بیٹوں، بیٹیوں اور دوسرے قریبی اقربا سے اکٹھے کئے گئے ہیں۔یہ ایسے عاشقان حسینؑ کے قصے ہیں جنہیں عشق کے بدلے میں دین و دنیا کی دولت عطا کی گئی۔وہ زندگی میں سرفراز رہے اور ان کی زندگی ختم ہونے کے بعد ان کی اولاد نے امن وخوشحالی کے دن دیکھے۔کیفیتی تحقیق کے تقاضے کے تحت ان مولائیوں کے اصلی نام بیان نہیں کئے جا رہے بلکہ انہیں سید 1، 2 وغیرہ کے تحقیقی ناموں سے پکارا جائے گا۔خواتین کو بھی ان کے اصل ناموں کی بجائے تحقیقی نام دیئے گئے ہیں۔

1۔2۔3۔ قصہ کچھ کم سن یتیموں کا

یہ سیدوں کے ایک ایسے خاندان کا قصہ ہے جن کی تین نسلوں کے جوان یکے بعد دیگرے کم عمری میں انتقال کر گئے اور ان کے پسمندگان میں بیوہ عورتیں اور کم سن بچے رہ گئے۔لیکن بظاہر بے سہارا رہ جانے والے ان بچوں کی تعلیم و تربیت کا اللہ تعالیٰ نے بہترین انتظام کیا اور وہ زندگی کے اعلیٰ مقام تک پہنچے۔یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ انسان کو پالنے والی اصل ذات خدا کی ہے اور ماں باپ حتیٰ کہ خاندان کے کسی دیگر بزرگ کی غیر موجودگی میں وہی ذات انسان کی نشوونما اور ترقی کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ایسے واقعات انسان کے عقیدہ ربوبیت کو مستحکم کرتے ہیں۔

سید 1 ایک ایسے عاشق حسینؑ تھے جو ایک سال کی عمر میں والدین کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ پاکستان بننے سے پہلے ان کے والد ایک جاگیردار اور اعلیٰ سول سرونٹ تھے۔ اتنی تونگری کے باوجود بھی وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور دین دار انسان تھے۔ ان کے ہاتھ کا لکھا قرآن مجید آج بھی ان کے پوتے پوتیوں کے پاس موجود ہے۔ 1935ء کے زلزلے میں ان کا اور ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اتفاق دیکھئے کہ زلزلہ آنے سے ایک دن پہلے ان کی نانی انہیں کوئٹہ شہر سے دور واقع اپنے گاؤں لے گئی تھیں۔ اس طرح ان کی زندگی تو بچ گئی لیکن ایک سال کی عمر سے ہی ان کی کڑی آزمائش کا آغاز ہو گیا۔

والد کی جانب سے ان کے تمام رشتہ دار سوتیلے تھے۔ انہیں تایا تائی نے پالا۔ تایا مہربان تھے لیکن تائی سخت مزاج تھیں۔ وہ معصوم بچے سے گھر کے تمام کام کرواتیں۔ انہی حالات میں انہوں نے میٹرک پاس کر لیا۔ ان کی تمام جائیداد پر سوتیلا چچا قابض ہو گیا تھا۔ تایا عیال دار تھے۔ وہ کالج کی تعلیم کے حامل نہ تھے۔ تایا نے انہیں دوسرے رشتہ داروں کے پاس لاہور بھیج دیا۔ لاہور جا کر انہوں نے ایف۔ایس۔سی مکمل کی اور اسلحہ کی ایک فیکٹری میں ملازمت اختیار کر لی۔ فیکٹری میں اس وقت مسجد یا امام بارگاہ نہ تھی۔ انہوں نے اپنے گھر میں نماز باجماعت اور مجالس کا انتظام کیا۔ ان کے شیعہ اور اہل سنت احباب ان کے گھر پر نماز ادا کیا کرتے تھے۔

اسی اثناء میں فیکٹری کی جانب سے چند افسران کو لندن تربیت کے لئے بھیجا گیا۔ ان جوانوں میں سید 1 کا نام بھی تھا۔ لندن سے واپسی پر ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد انہوں نے بی۔ایس۔سی کرنے کی ٹھانی۔ کالج دوسرے شہر میں واقع تھا لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ وہ دن میں کالج جاتے اور رات کو فیکٹری میں ڈیوٹی دیتے۔ ان کی اہلیہ بتاتی تھیں کہ ان دنوں وہ صرف چھٹی کے دن ہی ان سے بات کر پاتی تھیں۔ کبھی تو وہ شام کو گھر آتے، کھانا کھاتے، لباس تبدیل کرتے اور فیکٹری چلے جاتے۔ کبھی کبھار وہ کالج سے سیدھے فیکٹری چلے جاتے تھے۔ بی۔ایس۔سی مکمل کرنے کے کچھ عرصے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ایس۔سی کیمسٹری میں داخلہ لیا۔ ان کی فیکٹری لاہور سے کئی سو میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ اس وقت تک وہ عیال دار ہو چکے تھے۔ ان کے بچے سکول جاتے تھے۔ وہ نہ تو اپنی نوکری اور بیوی بچوں کو چھوڑ سکتے تھے اور

نہ ہی ایم ایس سی کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے دینا چاہتے تھے۔انہوں نے یونیورسٹی کے باا ثر افراد سے ملاقاتیں کیں اور انہیں اپنی مجبوری بتائی۔ان کے مخصوص حالات اور لگن کو دیکھتے ہوئے ڈپارٹمنٹ نے کچھ شرائط کے ساتھ انہیں ایم ایس سی مکمل کرنے کی اجازت دے دی۔وہ مہینے میں ایک مرتبہ لاہور جاتے اور چند کلاسز لیتے۔اس کے علاوہ وہ تمام ٹیسٹ دیتے اور پریکٹیکل مکمل کرتے۔جیسے کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ حضرت علی ؑ کے شیعہ محنتی ہوتے ہیں۔وہ اس تعریف کی بہترین مثال تھے۔وہ انتہائی محنتی، اپنی دھن کے پکے اور صوم وصلوٰۃ کے پابند انسان تھے۔اتنی سخت روٹین کے باوجود بھی ان کی عبادت میں کوئی کمی نہ آئی۔وہ کثرت سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے، تفسیر پڑھتے اور لکھتے۔اب تک ان کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی آیات اور تفسیریں موجود ہیں۔وہ طبیعت کے گداز اور دوسروں کو معاف کرنے کے قائل تھے۔انہوں نے اپنے سوتیلے چچا پر جائیداد کی بازیابی کے لئے مقدمہ کیا اور جیت بھی گئے۔لیکن جب عدالت سے نکلنے کے بعد چچا کی حالت دیکھی تو اسے معاف کر دیا۔چچا ایک اوباش انسان تھا۔اس وقت تک وہ تمام جائیداد اونے پونے داموں بیچ چکا تھا۔اس کے پاس حویلی اور چند املاک کے سوا کچھ نہ تھا جس سے وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔لہٰذا انہوں نے جیتی ہوئی جائیداد اسے بخش دی اور اس کے بعد کبھی جائیداد کا مطالبہ نہ کیا۔

ایم ایس سی مکمل کرنے کے کچھ عرصہ بعد جب ان کی عمر مشکل سے پینتالیس سال ہو گی تو اچانک پتا چلا کہ وہ پھیپھڑوں کے کینسر کی آخری سٹیج پر ہیں اور وہ دو ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکیں گے۔اس وقت ان کی بڑی بیٹی بیس سال کی اور سب سے چھوٹا بیٹا نو سال کا تھا۔انہوں نے اپنے سسر کو اطلاع دی لیکن بیوی بچوں، حتیٰ کہ قریبی دوستوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں ہونے دی۔عقدہ اس وقت کھلا جب وہ ہسپتال میں داخل ہوئے اور ایک ہفتے کے اندر ان کا انتقال ہو گیا۔انتقال سے کچھ دن پہلے ان کے ایک قریبی دوست نے سمجھایا کہ اپنے کمسن بچوں کی خاطر اپنے اندر زندہ رہنے کی طاقت پیدا کرو۔انہوں نے جواب دیا کہ جس خدا نے مجھے پالا ہے وہی میرے بچوں کو بھی پالے گا۔ان کی بڑی بیٹی نے بتایا کہ ان کی وفات کے وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔وہ کہتی ہیں کہ وہ عید کا تیسرا دن تھا جب ان کی اہلیہ چھوٹے بچوں کے ساتھ انہیں ملنے آئیں اور

بڑے بیٹے کو لباس تبدیل کرنے کے لئے گھر بھیج دیا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سات یا آٹھ دوستوں کا گروپ ان کی حال پرسی کے لئے آیا۔ اس گروپ کے ساتھ ایک باریش بزرگ بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان بزرگ کے چہرے اور سفید لباس سے ایک عجیب سی روشنی نکلتی تھی۔ اس وقت والد صاحب ہسپتال کے بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ باقی احباب ان کے آس پاس کھڑے تھے۔ اچانک وہ بزرگ بولے دعا کرو۔ تمام لوگوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ جب وہ دعا سے فارغ ہوئے تو بزرگ کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ وہ بزرگ کس کے ساتھ آئے تھے اور کہاں گئے؟ اس کے بعد دیکھا تو والد صاحب بالکل سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ فیکٹری میں وہ ہر دلعزیز تھے۔ ان کے دو جنازے پڑھائے گئے۔ اہل سنت حضرات نے اپنے طریقے سے اور اہل تشیع نے اپنے طریقے سے ان کا جنازہ پڑھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیوی بچوں نے مشکل وقت گزارا۔ لیکن خدا کا کرنا دیکھیے کہ مالی مشکلات کے باوجود تمام بچوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بہترین ملازمتوں پر فائز ہوئے۔ البتہ ان کے بڑے بیٹے کے سلسلے میں تقدیر نے ایک مرتبہ پھر اپنی کہانی دہرائی۔ اس تحقیق میں ہم انہیں سید 2 کے نام سے پکاریں گے۔

سید 2 بچپن سے غیر معمولی حسن کے مالک تھے۔ شباب آنے پر اس حسن کی ضوء کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ اپنے والد صاحب کی طرح محنتی، سنجیدہ اور صالح اخلاق کے مالک تھے۔ انہوں نے سخت حالات سے گزر کر تعلیم مکمل کی اور اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہوئے۔ شادی کے بعد ان کے دو بچے پیدا ہوئے۔ اس کے بعد اچانک فالج کا اٹیک ہوا اور چالیس سال کی عمر میں وہ اپنے رب سے جا ملے[1]۔

انہوں نے زندگی کے آخری سالوں میں بہت شدید بیماری گزاری۔ آخری رات ان کے

یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ اس خاندان میں کسی قسم کی جسمانی یا ذہنی کمزوری تھی جس کی وجہ سے یکے بعد دیگرے جوان موتیں ہوتی رہیں، تو یہ صحیح نہیں ہوگا۔ وہ خدا کی جانب سے بھیجا ہوا امتحان تھا، جس سے اس خاندان کو گزارا گیا۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس زاہد و عابد خاندان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے یتیموں کی سرپرستی کا اعجاز نمایاں کیا ہے۔

دیور ہسپتال میں اپنے بھائی کے ساتھ تھے۔وہ بتاتے ہیں کہ رات کے دو بجے ایک بزرگ ان کے کمرے میں آئے اور وقت پوچھا۔اس کے بعد وہ شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔بزرگ کے نکلتے ہی انہیں ایک عجیب سے احساس نے آ گھیرا۔رات کے دو بجے؟ ہسپتال میں ایک ہشاش بشاش چمکتے چہرے والے بزرگ؟ بے داغ سفید قمیض شلوار میں ملبوس؟ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اسٹاف کا حصہ نہ تھے۔تو پھر وہ کون تھے؟ وہ باہر کو دوڑے اور تمام برآمدے اور راہداریاں چھان ماریں لیکن ان کا کوئی نشان نہ پایا۔وہ نہیں سمجھ سکے کہ بزرگ کون تھے اور کس مقصد کے تحت بھائی کے کمرے میں آئے تھے؟

جیسے ہی سید 2 فوت ہوئے تو ان کی ایک قریبی بزرگ خاتون نے انہیں خواب میں دیکھا۔وہ عمدہ لباس پہنے خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ کھڑے تھے اور سر اونچا کر کے چھت کی جانب دیکھ رہے تھے۔وہ بولیں واہ سید! تم کتنے خوش نصیب ہو۔تم نے حج بھی کر لیا۔اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھ کھل گئی۔اسی وقت ان کے کزن اطلاع لے کر آئے کہ سید 2 کچھ دیر پہلے فوت ہو گئے ہیں۔اسی وقت وہ صاحب ایک اور کم عمر بھتیجی کے خواب میں بھی آئے اور کہنے لگے کہ میں تو یہاں آ گیا ہوں لیکن میرا بیٹا وہاں رو رہا ہے۔ان کا بیٹا اس وقت چار سال کا تھا۔بھتیجی نے اپنی سوئی ہوئی بہن کو جھنجھوڑا اور کہا کہ اٹھو چاچو فوت ہو گئے ہیں۔بڑی بہن نے اسے ڈانٹ دیا۔اسی اثناء میں فون پر ان کی وفات کی اطلاع مل گئی۔

ان کی بڑی ہمشیرہ نے بتایا کہ ان کے بھائی بچپن سے ہی شدید مولائی تھے۔وہ دسویں محرم کو شہزادہ علی اکبرؑ کی شبیہ اٹھایا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے کاندھوں پر نشان پڑ گئے تھے۔آخری دنوں میں انہیں نمونیہ ہو گیا تھا۔سانس بہت دقت سے چلتی تھی۔وفات کے چند روز بعد وہ اپنی چھوٹی بہن کے خواب میں آئے۔وہ ایک سرسبز و شاداب میدان میں بیٹھے تھے۔ماحول میں عجیب سی سکون و اطمینان کی لہریں چلتی تھیں۔ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مجلس امام حسینؑ سن کر آ رہے ہوں۔بہن نے پوچھا کہ بھائی اب تمہارا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ پہلے سینے میں بہت درد تھا لیکن اب میں صحت یاب ہوں۔اسی طرح ایک مرتبہ ان کی بڑی بہن نے دیکھا کہ وہ ایک پرانے مکان میں ایک بیڈ پر سو رہے تھے۔شاید ان کی قمیض کا ایک آدھ بٹن کھلا ہوا

تھا۔انہوں نے دیکھا کی ان کا سینہ ماتم کے نشانوں سے سرخ تھا۔اس کے علاوہ ان کی پشت زنجیر زنی کے زخموں سے چور چور تھی۔وہ بہت چھوٹے بچے چھوڑ کر فوت ہوئے تھے۔لیکن اللہ پاک کی مہربانی سے وہ بچے خاندان میں سب سے زیادہ باتمیز اور قابل نکلیاور بغیر کسی رکاوٹ کے ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔

2۔2۔3۔کرامات روضہ مبارک امیر المومنین، نجف اشرف

یہ ایک بیمار بچے کا قصہ ہے۔جس کے والد بزرگوار کی عبادت اور عشق علیؑ کی وجہ سے ایسا رتبہ ملا جو ان کے خاندان میں کسی اور کو نہ ملا تھا۔

م23 نے بتایا کہ ان کے پرنانا انتہائی پرہیزگار اور مولائی انسان تھے۔ان کے چار بیٹے تھے۔سبھی ایک سے بڑھ کر ایک لائق اور متقی تھے۔البتہ ان کے چھوٹے بیٹے کی نظر اس قدر کمزور تھی کہ وہ سکول نہ جا سکے۔جب وہ آٹھ یا دس سال کے ہوئے تو پرنانا کو دل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔وہ زیارات کے لئے جانا چاہتے تھے۔لیکن مالی حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔وہ بے چینی کے عالم میں اپنے گھر کے برآمدے کا چکر لگاتے رہتے اور کہتے کہ یا شفا دیجئے یا بلا لیجئے۔بعد ازاں وہ جملہ ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا۔آخر ایک دن امیر المومنینؑ کی جانب سے ان کا بلاوا آ گیااور وہ زیارات کے لئے روانہ ہو گئے۔کربلا میں وہ ہر روضہ مبارک پر اپنے بیٹے کے لئے فریاد کرتے گئے کہ اس کی نظر بہت کمزور ہے۔میں بیمار ہوں۔اس کے بڑے بھائی عیال دار ہیں۔نہ جانے وہ اس بچے کے ساتھ کیا سلوک کریں۔آپ خود اس کی روزی کے ضامن ہو جائیں۔امام حسینؑ کی زیارت کے بعد قافلہ نجف اشرف کی جانب چلا۔اسی اثناء میں انہوں نے خواب میں حضرت علیؑ کی زیارت کی۔مولائے متقیان کا دربار سجا ہوا تھااور وہ ایک بلند منبر متمکن تھے۔انہوں نے پرنانا کو بشارت دی کہ ان کا دست مبارک بچے کے سر پر ہے اس کی فکر نہ کریں۔اس وقت ان کا قافلہ رات گزارنے کے لئے ایک سرائے میں رکا ہوا تھا۔پرنانا نے بیدار ہوتے ہی اپنا قلیل سامان تیار کیا، بیوی اور بچے کو قافلے میں ہی چھوڑااور ایک عوامی بس لے کر نجف اشرف کے لئے روانہ ہو گئے۔میر کارواں نے اصرار بھی کیا کہ ایک رات کا توقف کر

لیں۔صبح سویرے تو سبھی نے روانہ ہو جانا ہے۔لیکن انہوں نے جواب دیا کہ تم اپنے وقت سے آنا۔میرا بلاوا تو آ گیا ہے۔نجف اشرف پہنچ کر انہوں نے تمام رات عبادت اور مناجات میں گزاری۔اگلی صبح ان کا انتقال ہو گیا۔جب ان کا قافلہ وہاں پہنچا تو انہیں کفن دیا جا چکا تھا اور ضریح مبارک کا طواف کروایا جا رہا تھا۔قافلے والوں نے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ ان کی بیوی اور بچہ بھی ہے۔ہمیں ان کا چہرہ دیکھنے کی اجازت دی جائے۔لیکن انہیں جواب ملا کہ اب ان کے کفن کا منہ بند ہو چکا ہے اور ان کا چہرہ اب حضرت علیؑ ہی دیکھیں گے۔ان کی آخری آرام گاہ وادی السلام میں واقع ہے۔ان کے بعد ہمارے علاقے کے کئی ایک مومنین نجف اشرف گئے۔لیکن ان میں سے کسی کو بھی وادی السلام میں آخری آرام گاہ نصیب نہ ہوئی۔

جس کم سن بچے کے لئے انہوں نے دعا مانگی تھی وہ بڑا ہو کر اپنے بہن بھائیوں سے زیادہ زیرک اور متمول نکلا۔وہ جس کاروبار میں ہاتھ ڈالتے وہاں سے منافع حاصل ہوتا۔خاندان کی سب سے خوبصورت اور صابر لڑکی کے ساتھ ان کی شادی ہوئی اور ان کے بچے خاندان کے سب سے زیادہ خوبصورت اور کامیاب بچے ثابت ہوئے۔شادی کے کچھ عرصہ بعد انہیں ایران جانے کا موقع ملا۔1970ء کی دہائی میں ایران کے شہر تیزی کے ساتھ پھیل رہے تھے اور فلک بوس عمارتوں کا روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔انہوں نے فارسی زبان سیکھی اور عمارتوں کی تعمیر میں شامل ہو گئے۔ترقی کرتے کرتے وہ شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی کی بہن کے محل کے آرکیٹیکٹ بنے۔انہوں نے ایران کی شہریت حاصل کر لی۔امارت اتنی تھی کہ گویا کہ بادشاہوں جیسی زندگی بسر کرتے تھے۔چونکہ وہ محل کے ملازم تھے اس وجہ سے امام خمینیؒ کے انقلاب کے دوران انہیں پاکستان واپس آنا پڑا۔اس کے بعد ان کے بیٹے امریکہ منتقل ہو گئے۔آج ان کی اولاد امریکہ میں مقیم ہے۔

یہاں پر ان کے بڑے بیٹے کی کہانی بیان کی جاتی ہے۔اس تحقیق میں انہیں سید 3 کے نام سے پکارا جائے گا۔وہ عجیب قلندرانہ طبیعت کے مولائی تھے۔ان کی والدہ بتاتی تھیں کہ وہ بچپن سے ہی ہر جلوس میں شرکت کرتے تھے۔حتی کہ بہت دور بھی چلے جایا کرتے تھے۔جیب میں جتنی بھی رقم ہوتی وہ نذر نیاز کے لئے دے دیا کرتے تھے۔1980ء کی دہائی میں جب

ایران میں انقلاب آیا تو وہ شہنشاہ ایران کے محل میں ملازم تھے۔ انقلاب کی وجہ سے انہیں اپنی نوکری چھوڑ کر واپس وطن آنا پڑا۔ ایران کی شاہانہ زندگی کے بعد پاکستان میں انہوں نے مشکل حالات کا سامنا کیا۔ پاکستان میں نہ تو انہیں کوئی مناسب ملازمت ملی اور نہ ہی کاروبار جما۔ اس وقت وہ عیالدار تھے۔ انہی مشکل حالات میں ان کی سب سے چھوٹی بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ اسے ہیپاٹائٹس سی ہو گیا تھا اور ان کے پاس علاج کے لئے پیسے نہ تھے۔ ان کے بیٹے نے بتایا کہ انہوں نے اپنی ڈائری میں امام حسینؑ کو مخاطب کر کے لکھا کہ مولا شہزادی سکینہؑ کا غم مجھے اپنی بیٹی کی موت پر رونے نہیں دیتا۔

م 23 بتاتی ہیں حضرت عباس علمدارؑ کے ساتھ وہ ایک خاص عقیدت رکھتے تھے۔ محلے میں ایک قدیم علم لگا ہوا تھا۔ وہ روزانہ اپنے کام پر جانے سے پہلے گلی میں کھڑے ہو کر طویل اور قدرے بلند آواز میں دعا مانگا کرتے تھے۔ ان کی آواز ہمارے گھر میں صاف سنائی دیتی تھی۔ ان کی آواز میں عجیب سا تاثر ہوتا جیسے وہ حضرت عباس علمدارؑ کے سامنے موجود ہوں اور وہ ان سے باتیں کر رہے ہوں۔ ایک مرتبہ میری والدہ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم حضرت عباس علمدارؑ کے علم کو دیکھ کر دعا مانگتے ہو کہ امریکہ چلے جاؤ؟ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے نہیں باجی، بس دن کا آغاز کرنے سے پہلے حضرت عباس علمدارؑ کے ساتھ کچھ دکھ سکھ کرتا ہوں۔ سارا دن سکون سے گزر جاتا ہے۔ امی نے تو مزاقاً امریکہ جانے کی بات کی تھی لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد ہی ان کا ویزہ لگ گیا اور وہ امریکہ روانہ ہو گئے۔ نیو یارک کے ایک جنرل اسٹور میں انہیں منیجر کی نوکری ملی۔ وہ انتہائی ایماندار آدمی تھے۔ ان کا مالک ان پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ انہوں نے کئی سال اسی جگہ کام کرتے گزار دیئے۔

امریکہ میں بھی ان کی عزاداری اسی زور شور سے جاری رہی۔ عاشورہ کا جلوس نیو یارک ڈاؤن ٹاؤن میں ہوا کرتا تھا۔ وہ 2005ء کا عاشورہ تھا۔ نیو یارک ڈاؤن ٹاؤن کی 15°- سینٹی گریڈ کی یخ بستہ ہوائیں جسم کے آر پار ہو جایا کرتی تھی۔ ان کی طبیعت بھی کچھ نرم تھی۔ چھوٹی بھابھی سے بات ہوئی تو انہوں نے منع کیا کہ جلوس پر نہ جائیں۔ انہوں نے جواب دیا، نہیں! جلوس پر تو جانا ہی ہوتا ہے۔ وہ ان کی زندگی کا آخری جلوس تھا۔ انہوں نے

پورے جوش وخروش کے ساتھ اس جلوس میں شرکت کی اور اس کے چند روز بعد اپنے رب سے جا ملے۔ ان کی عادت تھی کہ ہر سال عاشورہ کے بعد دس دن تک امام مظلوم کی بھوک کو یاد کر کے فاقہ کرتے تھے۔ ابھی عاشورہ کے بعد چند روز ہی گزرے تھے کہ انہوں نے شام کو اپنا کام ختم کیا اور دن بھر کی رقم بینک میں ڈپازٹ کروانے چل پڑے۔ اسی اثناء میں اچانک وہ سڑک پر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ گرنے کی وجہ سے وہ زخمی ہو گئے تھے اور لباس پر خون لگا ہوا تھا۔ وہ لباس تبدیل کرنے کے لئے گھر گئے۔ گھر میں انہوں نے ایک علم لگایا ہوا تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر انہوں نے گریہ کیا اور کہا کہ بی بی میرے بچے تو ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ گریہ کے دوران انہیں حضرت عباس علمدارؑ کی آواز سنائی دی کہ تمہارا وقت پورا ہو چکا ہے۔ تمہیں بس اتنا وقفہ دیا گیا ہے کہ تمہارے جیب میں جو امانت ہے وہ اس کے مالک کو لوٹا دو۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی چھوٹی بھابھی کو فون کیا اور بتایا کہ وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ بے ہوشی میں ان کا جسم بہت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا اور وہ ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ اس کے بعد انہیں نے حضرت عباس علمدارؑ کا واقعہ بیان کیا اور رونے لگے۔ ان کی بھابھی بھی روئیں اور کہا کہ آپ اس وقت کہیں نہ جائیں۔ ڈاکٹر کے پاس جائیں یا آرام کریں۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں میرے جیب میں امانت ہے۔ وہ رات کو میری چھت تلے نہیں رہ سکتی۔ اس وقت تک بینک بند ہو چکے تھے۔ وہ دوبارہ اپنی دکان پر گئے اور ایک خفیہ لاکر میں پیسے ڈالے۔ اس کے بعد اپنے مالک کو فون کر کے بتایا کہ پیسے دکان کے لاکر میں رکھ دیئے ہیں۔ بعد میں مالک نے بتایا کہ ان کا فون سن کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ کئی سال سے میرے پاس کام کر رہے تھے لیکن انہوں نے کبھی بھی میرے گھر پر فون نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ عاشورہ کے بعد وہ امام حسینؑ کی یاد میں دس دن تک فاقے کرتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ شاید فاقے کی وجہ سے ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہو۔ اس کے لئے جتنا ممکن تھا وہ اتنی تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا اپنے اسٹور پہنچا۔ دیکھا تو وہ ایک میز پر سر رکھے گویا کہ سو رہے تھے۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہ وفات پا چکے تھے۔

ان کی بھابھی نے بتایا کہ ان کی وفات کے بعد کے واقعات کسی کرامت سے کم نہیں تھے۔ امریکہ میں اچانک موت کے بعد پوسٹ مارٹم ضروری ہوتا ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر تھے۔ وہ تمام رات مختلف لوگوں کو فون کرتے رہے اور آخرکار انہوں نے اہم افراد کو قائل کر لیا کہ ہمارے مذہب میں پوسٹ مارٹم کی اجازت نہیں اس لئے ہم ان کا پوسٹ مارٹم نہیں کروائیں گے۔ اسی وقت وہ اپنے بھائی کے خواب میں آئے اور کہا کہ میرے سر کے اوپر ورگا (شہتیر) گرنے والا تھا تم نے مجھے بچا لیا ہے۔ دوسرا غیر معمولی واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ ان کی میت پاکستان لے جانے کے ریلیز فارم ایک ہی دن میں جاری ہو گیا۔ جبکہ اس ریلیز فارم پر کئی دن یا ہفتے لگ جاتے ہیں۔ تیسرا غیر معمولی واقعہ یوں پیش آیا کہ کوئی بھی ایئر لائن آسانی کے ساتھ کسی میت کے لئے ٹکٹ فراہم نہیں کرتی۔ اس لئے میت پاکستان پہنچانے میں ایک ماہ یا اس سے زیادہ کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ جبکہ ان کی میت کے لئے آسانی کے ساتھ ٹکٹ بھی مل گیا اور میت سہولت سے پاکستان پہنچا دی گئی۔

سید 3 کی وفات کے بعد ایک جانب تو امریکہ میں غیر معمولی واقعات پیش آ رہے تھے اور دوسری جانب پاکستان میں ان کے خاندان کے افراد اور دوستوں کو خاص اشارے موصول ہو رہے تھے۔ ان کی موت اچانک واقع ہوئی تھی اس وجہ سے ان کے بھائی نے فیصلہ کیا کہ پاکستان پہنچنے تک ان کی وفات کی خبر کسی کو نہ دی جائے۔ پاکستان میں سب کو بتایا گیا کہ وہ بہت زیادہ بیمار ہیں اس لئے انہیں پاکستان لایا جا رہا ہے۔ ان کے بیٹے نے بتایا کہ میں ان دنوں تعلیم کے سلسلے میں اپنے شہر سے دور رہتا تھا۔ ایک رات میں سویا تو بابا میرے خواب میں آئے اور کہا کہ میں دوسری جگہ منتقل ہو گیا ہوں۔ تم فکر نہ کرنا میرے ٹکٹ کا انتظام ہو جائے گا۔ اس کے بعد منظر بدل گیا اور میں نے دیکھا کہ ایک جنازہ ہوا میں اڑتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ جنازہ قبرستان کی جانب جا رہا تھا۔ اچانک جنازہ رک گیا اور بابا اٹھ کر بیٹھ گئے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ دیکھو میں گر گیا تھا اور میری آنکھ کے اوپر زخم کا نشان ہے۔ لوگ مجھ سے ملنے کے لئے آئیں گے۔ یہ زخم کا نشان برا تو نہیں لگ رہا۔ میں نے کہا کہ نہیں بابا یہ تو بہت چھوٹا سا نشان ہے۔ کسی کو نظر بھی نہیں آئے گا۔۔۔ میری آنکھ کھلی تو دل بہت پریشان تھا۔ میں نے والدہ کو فون کیا اور پوچھا کہ

بابا کا کوئی فون آیا ہے؟ والدہ نے بتایا کہ وہ اچانک بیمار ہو گئے ہیں اور انہیں پاکستان لایا جارہا ہے۔ میں نے چاچو کو فون کر کے پوچھا کہ کیا میرے والد کھڑے ہوئے گر گئے تھے اور ان کی آنکھ پر چوٹ آئی ہے؟ انہیں میری بات سن کر حیرت تو ہوئی لیکن انہوں نے مجھے تسلی دے دی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں جان چکا تھا کہ میرے بابا اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔

انہوں نے مزید بتایا کہ اپنی وفات سے ایک دو روز پہلے بابا نے اپنے لڑکپن کے ایک دوست کو فون کیا اور کہا کہ میں دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہوں۔ دوست نے پوچھا کیا بات ہے؟ بیمار ہو؟ کوئی تکلیف ہے؟ کہنے لگے نہیں بس منتقلی ہے لیکن اس سے پہلے پاکستان ضرور آؤں گا۔ ٹکٹ نہ ملا تو اڑ کر پہنچ جاؤں گا۔ اس کے علاوہ وہ کئی ایک دیگر لوگوں کے خواب میں بھی آئے۔ ان کے ایک بھائی نے گلہ کیا کہ وہ ان کے خواب میں نہیں آئے۔ اسی رات انہوں نے مرحوم کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے عمدہ لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا میں بہت آرام سے ہوں لیکن بہت مصروف رہتا ہوں۔ میری ڈیوٹی چھٹے امام کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔

انہوں نے ایک اور حیران کن واقعہ بھی سنایا۔ ان کے فوت ہونے کے دو ہفتے بعد ایک روز میں صبح کی نماز پڑھ کر لیٹا تو باہر کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں حیران ہوا کہ اس وقت کون آیا ہے۔ دروازے پر جا کر دیکھا تو اور بھی حیران ہوا۔ وہاں لنگوٹ میں ملبوس ایک ملنگ کھڑا تھا۔ اس کے تمام جسم پر زنجیریں تھیں۔ چہرے پر راکھ ملی ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ میں بری امام کا ملنگ ہوں۔ بری امام کا مزار اسلام آباد میں واقع ہے۔ مجھے حکم ہوا ہے سید فوت ہو گیا ہے۔ جا کر اس کی دعا کر کے آؤ۔ میں نے اسے گھر کے اندر آنے کی دعوت دی تو کہنے لگا کہ نہیں۔ مجھے یہیں تک آنے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر بابا کے لئے دعا کی۔ اس کے بعد اس نے کشف و محجوب اور ولیوں کی باتیں شروع کر دیں اور کہا کہ ان تمام مقامات پر میں پیدل چل کر جاتا ہوں۔ اس نے بتایا کہ آپ کا سلسلہ صدر الدین سے ملتا ہے۔ اور آپ کے کچھ آباء ایران اور افغانستان میں بھی دفن ہیں۔ اسی اثنا میں میرا ایک کزن وہاں سے گزرا اور میرے چچا بھی گھر سے نکلے۔ دونوں نے اس ملنگ سے باتیں کیں۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے پانی مانگا۔ میں نے اسے پانی لا کر دیا تو وہ کہنے لگا کہ سید میں نے تم سے پانی مانگا تھا۔ تم شربت لے آئے ہو؟ میں نے

کہانہیں میں نے تو آپ کو سادہ پانی دیا ہے۔ اس نے گلاس مجھے تھمایا اور کہا کہ چکھ لو۔ میں نے چکھا تو وہ واقعی میٹھا شربت تھا اور اس کا اتنا مزہ تھا کہ میں نے زندگی میں ایسا مزے دار شربت نہیں پیا۔ اس کے بعد اس نے اجازت چاہی۔ میں نے اسے گلی سے مڑتے ہوئے دیکھا۔ میں گھر کے اندر آ گیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی مجھے خیال آیا کہ وہ ملنگ کون تھا؟ وہ ہمارے گھر تک کیسے پہنچا؟ اس کی عجیب باتوں نے میرے دل میں ایسا تجسس ڈالا کہ میں دوبارہ نکلا۔ میں نے ہر گلی اس کی تلاش میں چھان ماری۔ لیکن اس کا اتا پتا کہیں نہ تھا۔

3۔2۔3۔قصہ عشق

یہ قصہ دو عاشقان حسینؑ کی آپس کی دلی وارفتگی کا قصہ ہے جنہیں مجالس امام حسینؑ نے آپس میں منسلک کیا اور وہ رفاقت ان میں سے ایک کی موت پر ختم ہوئی۔ ان میں سے ایک زمانے کی ستائی ہوئی اپاہج خاتون تھی اور دوسری متمول خاندان سے تعلق رکھنے والی تعلیم یافتہ خاتون۔ اس تحقیق کی حد تک ہم پہلی خاتون کو فضہ اور دوسری کو سیدہ 1 کا نام دیتے ہیں۔ دراصل یہ کہانی سیدہ 1 نے ہی ہمیں سنائی۔ وہ کہتی ہیں کہ میرے گھر مجالس برپا ہوتی تھیں۔ فضہ مجالس میں آیا کرتی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ میرے ساتھ مانوس ہو گئی اور اس نے مجالس کے علاوہ بھی میرے گھر آنا شروع کر دیا۔ بتدریج اس کی انسیت عقیدت میں بدل گئی۔ اگر وہ ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ مجھے دیکھ نہ لیتی تو اسے چین نہیں پڑتا تھا۔ اس کا رنگ پکا لیکن نقوش اتنے جاذب نظر تھے کہ عام سے لباس میں بھی کسی سرائیکی ڈرامے کی ہیروئین نظر آتی۔ عادت کے لحاظ سے وہ ایک ملنگ صفت خاتون تھی۔ اس کا خاوند ایک عیاش اور نظر باز انسان تھا۔ وہ اس پر توجہ نہ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی جوان اولاد بھی اسے نظر انداز کرتی تھی۔ اس کا دل مضطرو بے چین رہتا۔ وہ بچپن سے ہی امام حسینؑ کے نام کی دیوانی تھی۔ وہ بتاتی تھی کہ شادی کے فوراً بعد وہ صبح اٹھتے ساتھ محلے کی امام بارگاہ میں چلی جاتی۔ کچھ دیر بند دروازے کے سامنے بیٹھی رہتی اور اس کے بعد گھر واپس آ جاتی۔ اس کا تعلق ان قبائل سے تھا جو گھوم پھر کر گاتے بجاتے یا نعت رسولؐ پڑھ کر اپنی روزی کمایا کرتے تھے۔ لہٰذا پرسوز آواز اسے ورثے میں ملی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ وہ ہمارے گھر کا حصہ بنتی گئی۔ میں اگر گھر پر نہ بھی ہوتی تو گھر کے دیگر افراد اسے اندر بلا لیتے۔ وہ اپنے مخصوص مقام پر بیٹھ جاتی اور کچھ ہی دیر کے بعد بے خودی کے عالم میں دہڑے اور نوحے پڑھنا شروع کر دیتی۔ اس کی پر فسوں آواز ایک عجیب سا سماں باندھ دیتی۔ جب میں گھر واپس آتی تو باہر سے ہی ایسی آوازیں آتیں جیسے بہت سے افراد مل کر مجلس برپا کر رہے ہوں۔ گھر کے اندر جا کر دیکھتی تو ایک اکیلی ملنگ فضہ نوحہ پڑھنے، ماتم کرنے اور گریہ کرنے میں مصروف ہوتی تھی۔ اسی حال میں کچھ مہینے گزر گئے۔ ایک دن اچانک اطلاع ملی کہ اس کے جسم کے ایک حصے پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور وہ بستر پر پڑی ہے۔ اس کا علاج تو بھلا کس نے کروانا تھا۔ خود ہی لوٹ پوٹ کر چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی۔ اب وہ ایک ٹانگ پر لڑکھڑاتی مجھ سے ملنے آیا کرتی تھی۔ میں امام حسینؑ کے ساتھ اس کی عاشقی سے تو واقف تھی ہی لیکن اس کے اپاہج ہونے کے بعد اس کی کرامات واضح ہو گئیں۔ اس کی پہلی کرامت میں نے ایک شب جمعہ دیکھی۔ مجھے آج بھی وہ واقعہ اس طرح یاد ہے جیسے کل ہی رونما ہوا ہو۔ میرے بچے شام کو کھیلنے جاتے تھے اور صحیح ایک گھنٹے میں کھیل سے فارغ ہو کر گھر واپس آ جاتے تھے۔ اس روز ان کے جانے کے بعد میں نے نماز والے مخصوص کمرے میں بیٹھ کر دعائیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اچانک مجھے خوشبو کا ایک خوشگوار جھونکا محسوس ہوا۔ میں حیران ہوئی کہ ایسی مسحور کن خوشبو کہاں سے آ رہی ہے لیکن دوبارہ سے دعا پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ اسی طرح دو تین مرتبہ تیز خوشبو کا جھونکا آیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی پاک روح کمرے میں موجود ہو۔ ایک گھنٹے کے بعد بچے اپنی کھیل ختم کر کے واپس آ گئے۔ ان کے ساتھ فضہ بھی چلی آ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک گھنٹے سے گیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دور سے بچوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ گیٹ پر پہنچی تو گھنٹی بجائی لیکن وہ خراب تھی۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ اسے پتا تھا کہ اگر بچے کھیل کے لئے گئے ہیں تو ایک گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔ وہ جب بھی آتی تہیہ کر کے آتی تھی کہ مجھ سے ملے بغیر واپس نہیں جائے گی۔ جب بچے واپس آئے تو وہ بھی ان کے ساتھ اندر آ گئی۔ اس کی بات سن کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ اس کے بیان کے مطابق بچوں کے جانے کے فوراً بعد وہ گیٹ پر پہنچی تھی اور اسی وقت مجھے خوشبو کے جھونکے آنے شروع ہو گئے تھے اور اس وقت تک آتے رہے جب تک وہ

اندر نہ آ گئی۔شاید قدرت مجھے اشارہ دے رہی تھی کہ فضہ گیٹ پر بیٹھی اس کے کھلنے کی منتظر ہے۔

دوسرا حیران کن واقعہ اس وقت پیش آیا جب میری والدہ بستر پر تھیں۔میرے ماموں ان کی تیمارداری کے لئے آئے اور تحفتاً ایک ہزار روپے دے گئے۔اس وقت ہزار روپے ایک بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔والدہ نے وہ پیسے مجھے دے دیئے۔اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اندرونی آواز سنائی دی کہ وہ پیسے فضہ کو دے دو۔مجھے کبھی کبھار اندرونی آواز سنائی دیتی تھی اور بعض اوقات اس کے ساتھ میرا مکالمہ بھی ہو جاتا تھا۔اس روز بھی میں نے اس آواز کے ساتھ ضد لگائی کہ میں وہ رقم فضہ کو کیوں دوں؟ جبکہ مجھے اس کی زیادہ ضرورت ہے؟ مجھے دوبارہ سے وہی آواز سنائی دی کہ نہ تو وہ نوٹ تمہارا ہے اور نہ ہی تمہیں دیا گیا ہے۔بس تمہارے ہاتھ سے گزار کر فضہ تک پہنچایا جا رہا ہے تا کہ تم بھی اس اجر میں شامل ہو جاؤ۔ابھی وہ نوٹ میرے ہاتھ میں ہی تھا کہ وہ آن پہنچی۔اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ رقم اسی کی قسمت کی تھی۔میں نے وہ رقم اسے دے دی۔وہ بہت خوش ہوئی اور وہ رقم لے کر اپنے آبائی گاؤں چلی گئی۔اسے اپنے آبائی گاؤں جانے کی عرصے سے خواہش تھی لیکن تنگی حالات کی وجہ سے اس خواہش کو پورا نہ کر پاتی تھی۔اس نے وہاں کافی عرصہ گزارا۔جب واپس آئی تو بہت خوش تھی۔اس کے بعد جلد ہی اس پر فالج کا دوسرا حملہ ہوا اور وہ فوت ہو گئی۔میں اکثر سوچتی ہوں کہ اگر اس دن میں اسے پیسے نہ دیتی تو شاید اس کی گاؤں جانے کی خواہش کبھی پوری نہ ہوتی۔میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر حیران ہوتی ہوں کہ وہ کس طرح اپنے بندے کی خواہش پوری کرتا ہے۔اب یہ فضہ کا قصہ ہی لے لیجئے کہ کہاں سے وہ رقم چلی؟ اور کہاں سے ہوتی ہوئی بیچاری اپاہج فضہ تک پہنچی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنی دلی خواہش پوری کر لے۔

تیسرا حیران کن واقعہ اس کی موت تھی۔وہ ایک عام اتوار کا دن تھا۔ہم سب ناشتے سے فارغ ہو کر اپنی بیمار والدہ کے اردگرد بیٹھے تھے کہ اتنے میں وہ آن پہنچی اور قالین پر بیٹھ گئی۔میں نے اصرار کیا کہ کرسی پر بیٹھو لیکن وہ نہ مانی۔اس وقت تک وہ بالکل نارمل تھی اور ہنس ہنس کر باتیں سنا رہی تھی۔اس کے بعد اس نے میرے پاؤں دبانا شروع کر دیئے۔میں نے پاؤں چھڑوانے کی کوشش کی لیکن اس نے نہ چھوڑے۔اچانک اس کا سر میرے پاؤں پر جھک گیا۔اس کے ساتھ ہی اس نے الٹی کی۔اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں اور وہ بے

ہوش ہوگئی۔ ہم سب گھبرا گئے۔ اس کے گھر والوں کو فون کر کے بلایا۔ وہ اسے ہسپتال لے گئے۔ کچھ روز وہ کوما میں رہی۔ اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ وہ جب سے مجھے ملی گویا کہ میری عقیدت مند ہوگئی تھی۔ میرے گھر میں چونکہ مجالس برپا ہوتی تھیں اس وجہ سے اس نے میرے گھر کو امام بارگاہ بنالیا تھا۔ جب بھی اس کا دل اداس ہوتا میرے گھر بھاگی چلی آتی۔ اسے نہ کسی شے کی لالچ تھی، نہ پرواہ۔ بس عشق کا ایک رشتہ اس نے میرے ساتھ استوار کرلیا تھا۔ مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ عشق میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ موت سے پہلے اس کے عشق نے اسے سمجھایا کہ باجی کے پاس چلو، اور ان کے پاوں پر سر رکھ کر جان دے دو۔ لہٰذا اس نے میرے پاوں پر سر رکھ کر جان دے دی۔

چوتھا عجیب واقعہ اس کی تدفین کے وقت پیش آیا۔ جس دن اسے دفنایا گیا اسی رات میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں میرے گیٹ پر آئی۔ میں نے گیٹ کھولا تو دیکھا کہ وہ فالج زدہ حالت میں کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر سفید کپڑے کی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ میں حیران ہوئی کہ آج اس نے کیسا لباس زیب تن کیا ہوا ہے؟ بعد میں پتا چلا کہ وہ کفن کی سفید پٹیوں میں ملبوس تھی۔ اس نے پٹیوں سے بھرا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر عجیب مستی بھرے انداز میں مجھے سلام کیا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی لیکن اس کی آنکھوں کے کونے معصوم بچوں کی طرح مسکراہٹ کے نور سے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ اس کی روح شاد تھی اور وہ اپنے نئے سفر سے بہت خوش تھی اور کیوں نہ ہوتی وہ ظالم دنیا کے چنگل سے نکل کر عشق کی وادی کی طرف جو محوِ سفر تھی۔ اس کے بعد وہ عجیب مستی بھرے انداز میں لہراتے ہوئے واپسی کے لئے مڑی اور اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

وہ تو تقریباً پچپن (55) سال اس عارضی ٹھکانے پر گزار کر اپنے رب سے جا ملی، لیکن میرے لئے سوچ کے کئی در وا کر گئی۔ اس کی وفات کے بعد مجھے ادراک ہوا کہ وہ میرے لئے ایک ایسے دریچے کی طرح تھی جس سے میں مظاہر خداوندی دیکھا کرتی تھی۔ اس کی ذات کے توسط سے مجھے پتا چلا کہ خدا کہاں رہتا ہے؟ اور کس طرح اپنے بندوں کے دل کی آرزوئیں پوری کرتا ہے؟ وہ محتاج، مریض اور اپاہج کے ساتھ رہتا ہے۔ اگر اسے تلاش کرنا ہے تو ٹوٹے ہوئے دلوں

اور وہ جن کی حق تلفی کی گئی ہو ان کے در پر دستک دو، تمہارا در مقصود وہیں سے ملے گا۔

4۔2۔3۔ مراجع دین پیش خیمہ ظہور ہیں

یہ ایک ایسی سیدہ کا ذکر ہے جو بچپن سے ہی نیک اور پرہیز گار تھی۔ پیدائش کے پہلے ہی مہینے میں جب وہ روتی تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ اس کی دادی اور نانی کہتیں کہ وہ امام حسینؑ کے عظیم عزاداروں میں سے ہو گی۔ بچپن سے ہی وہ سچی، باادب، صوم وصلوٰۃ اور مجالس کی پابند تھی۔ اس نے 1994ء اور 1995ء میں ہونے والے اپنے کچھ واقعات سنائے جو قارئین کرام کی نظر کرتے ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ تقریباً انیس یا بیس سال کی عمر میں ماہ رمضان میں میں پہلی مرتبہ اعتکاف میں بیٹھی۔ ایک دن عبادت کرتے ہوئے میرے اوپر غنودگی طاری ہو گئی۔ اس عالم میں میں نے حضرت علیؑ کی زیارت کی۔ وہ ایک ایسے حسین وجمیل نوجوان کی صورت میں تھے جن کے چہرے پر نگاہ کرنے کی تاب نہ ہوتی تھی۔ نوجوانی کے باوجود بھی ان کی شخصیت میں بے پناہ متانت تھی۔ انہوں نے کالا عمامہ پہن رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر میرا دل خوشی سے نہال ہو گیا۔ میں نے ہنس کر کہا کہ یہ آپ ہیں یا علیؑ؟ وہ بھی ہلکا سا مسکرائے۔ اس کے بعد پس منظر میں میری برادری کے کچھ لوگ نمودار ہوئے۔ وہ میری جانب اشارے کرتے تھے اور استہزا سے ہنس کر کہتے تھے کہ ذرا دیکھو تو۔ کیا اس کے پاس حضرت علیؑ آئیں گے؟ ان کی باتیں سن کر مولا نے اس قدر جلالی نظروں سے ان لوگوں کو دیکھا کہ اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے انتہائی جلال کے عالم میں اپنی عبا کو ایک ہاتھ سے جھٹکا دے کر دوسرے ہاتھ پر ڈالا۔ ایسا کرتے ہی زمین سے لے کر آسمان تک بجلیوں کے شعلے نکلنے شروع ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

اس کے کچھ عرصے بعد ہی میں نے دوبارہ حضرت علیؑ کی زیارت کی۔ اس خواب میں میں نے کوئی انجانا سا کمرہ دیکھا۔ اس کمرے میں ایک بیڈ رکھا ہوا تھا اور ایک الماری۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میرا پورشن ہے۔ میں نے سامان اٹھایا ہوا تھا۔ اتنے میں مجھے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہاں تیرہ چودہ سالہ نوجوان کھڑا تھا۔

نوجوان کے بال سنہری تھے اور کسی انہونی روشنی سے چمکتے تھے۔ چہرہ ایسا حسین کہ قوت گویائی ساتھ چھوڑ جائے اور طبیعت میں بے حد متانت تھی۔ میں نے ہنس کر کہا یا علی وہ کچھ نہ بولے۔ ان کی ذات میں ایک انہونی سی سنجیدگی تھی۔ ان کے حسن و جمال کا کچھ ایسا رعب تھا میں نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ اس خواب کے کچھ عرصے کے بعد ہی میرا داخلہ حوزہ علمیہ قم میں ہو گیا۔ جب میں اپنا سامان اٹھا کر حوزہ کے کمرے میں پہنچی تو حیران رہ گئی۔ وہ کمرہ وہی تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔

سیدہ ہمارے علاقے کی اولین فاضلہ قم تھیں۔ ایران سے واپسی پر انہوں نے وہی مخالفتیں برداشت کیں جو خواب میں دیکھی تھیں۔ سچ ہے کہ ہراول دستے کی کاوشیں پہاڑ کاٹنے کے برابر ہوتی ہیں۔ تاریخ ہند میں مغل بادشاہ بابر کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ فرغانہ سے نکلا تو اس کے فوجیوں نے ہندوکش کاٹ کر اپنا راستہ بنایا۔ وہ یخ بستہ پہاڑ کھودتے جاتے اور آگے چلتے جاتے۔ جہاں رات ہو جاتی وہیں برف پر سو جاتے اور اگلے روز دوبارہ سے پہاڑ کھودنے کا عمل شروع ہو جاتا۔ اسی طرح ایک روز انہوں نے تمام پہاڑ کھود ڈالا اور میدانی علاقے میں پہنچ گئے۔ بالکل یہی قصہ ان علماء دین کا ہے جنہوں نے آغاز میں دین میں موجود افراط و تفریط کے خلاف تبلیغ کی۔

سیدہ کا تعلق ایک روایتی سید برادری سے تھا۔ ان کے ہاں خواتین میں پردے کا رواج عام تھا۔ خواتین چادر، گول عبا یا برقعہ پہن کر گھروں سے باہر نکلتی تھیں۔ البتہ گھر کے اندر شرعی پردے کے احکام کسی حد تک فراموش کر دیئے گئے تھے۔ وہ اس طرح کہ فرسٹ کزنز گھروں میں آتے جاتے رہتے۔ پرانی روایات کے مطابق ان موقعوں پر خواتین دوپٹوں سے سر ڈھانپ لیتیں لیکن دوپٹہ مکمل طور پر بال نہیں چھپاتا تھا۔ ایک اور رواج یہ بھی تھا کہ شادی بیاہ کے موقع پر خواتین کی کچھ تقریبات میں قریبی مرد بھی شرکت کرتے تھے۔ ان مواقع پر اکثر خواتین دوپٹہ سر پر ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کرتیں۔ کیونکہ دوپٹہ ڈالنے سے ان کی تیاری خراب ہوتی تھی۔ جب سیدہ نے ہر نامحرم کے سامنے حجاب پہننا شروع کیا تو انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں نے منہ در منہ اور پیٹھ پیچھے مذاق اڑایا۔ انہوں نے صبر اور خاموشی کے ساتھ اس مخالفت کا مقابلہ

کیا۔ دوپٹے اور چادر سے لے کر حجاب تک کا سفر کچھ زیادہ تو نہ تھا لیکن انسانی ذہن نے اس معمولی تبدیلی کو بھی ماننے سے انکار کردیا۔ لیکن ان کے صبر اور عملی نمونہ کی وجہ سے حجاب پہلے ان کے خاندان اور بعد میں برادری میں عام ہوگیا۔ یہاں پر ہم حجاب اور میڈیا کے کردار کے سلسلے میں ایک تجویز پیش کریں گے۔ ترک میڈیا نے خواتین کے حجاب کے سلسلے میں عمدہ ڈرامے تخلیق کئے ہیں۔ وہ ڈرامے عوام میں مقبول بھی ہوئے۔ گو کہ پاکستان میں حجاب کا سفر ترکی جیسا دشوار نہیں تھا اور سن 2000ء تک حجاب ملک کے ہر مکتب فکر میں رائج ہو چکا تھا لیکن اب بھی یہ موضوع دعوت فکر دیتا ہے۔ دینی چینلز پر اس موضوع کے بارے میں ڈرامے اور دستاویزی پروگرام عوام کے لئے فائدہ مند ثابت ہوں گے۔

مجالس امام حسینؑ کے سلسلے میں سیدہ کو حجاب کے مقابلے میں زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ گو کہ وہ آسان اور سادہ انداز بیان اختیار کرتی تھیں اور متفرقہ موضوعات کو زیر بحث نہیں لاتی تھیں۔ لیکن روایتی مجلس پڑھنے والوں نے ان کے خلاف پروپگنڈہ شروع کردیا۔ انہیں کہا گیا کہ ہم نے تو اس سے پہلے ایسی باتیں کبھی نہیں سنیں۔ تمہاری باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ جب وہ فاضلہ قم کی ڈگری لے کر آئیں تو نوجوان تھیں۔ جب لوگ حوصلہ شکنی کرتے تو دل برداشتہ ہو جاتی تھیں۔ لیکن انہوں نے اپنا عمل نہ چھوڑا۔ آہستہ آہستہ خدا نے ان کے کام میں اتنی برکت ڈالی کہ ہر کوئی ان کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے لگا۔ البتہ کچھ عرصہ خاموشی اور صبر کے ساتھ گزارنے کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ وہ دوسرے شہر منتقل ہوگئیں۔ اللہ پاک کے حکم سے وہاں انہیں پذیرائی ملی اور انہوں نے شہر کے علاوہ آس پاس کے دیہاتوں میں بھی مجالس اور تبلیغ کا کام شروع کردیا۔ ایک مرتبہ اپنی ایک سالہ بیٹی کو لے کر ایسے علاقے میں عشرہ پڑھنے گئیں جہاں نہ تو بجلی کا باقاعدہ انتظام تھا اور نہ ہی گرم پانی کا۔ اس علاقے میں مجالس امام حسینؑ، میت، کفن اور دفن کے سلسلے میں غیر شرعی رواج عام تھے۔ وہ موقع محل دیکھ کر خواتین کو غیر شرعی رواجوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتی رہتیں۔ اس علاقے کی ایک اور علت سیدوں کا بے جا افتخار بھی تھا۔ بعض اوقات اہل سنت افراد کے ہاں میت کو غسل یا کفن دینے کے لئے خاتون میسر نہ ہوتی۔ وہ سیدانیوں سے درخواست کرتیں تو وہ معذرت کرلیتیں اور بعد

میں کہتیں کہ ہم بھلا سید ہو کر غیر سیدوں کے پاؤں کیوں دھلائیں؟ انہوں نے سمجھایا کہ شیعہ اور غیر شیعہ افراد کا آپس میں میل جول بہت ضروری ہے۔ اگر مشکل میں ان کے کام آؤ گی تو وہ بھی تم سے محبت کریں گی۔ دوسرے میت کو غسل اور کفن دینے کا بہت ثواب ہے۔ اس سے انکار مت کرو۔ اس امر سے تمہارے لئے اور میت کے لئے بھی بہت سے درجات بلند ہوتے ہیں۔ ان کی تبلیغی کاروائیوں کی وجہ سے نہ صرف علاقے کی غلط رسومات میں کمی آئی بلکہ شیعہ اور اہل سنت کے تعلقات بھی بہتر ہوئے۔

5۔2۔3۔وہ کسی کا ادھار نہیں رکھتے

یہ قصہ ایک ایسے حسینی عاشق کا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کے کم از کم ساٹھ (60) یا اس سے زائد سال امام حسینؑ کے نوحے اور قصیدے لکھنے میں گزارے۔ وہ ذخیرہ الفاظ، شاعری اور سر کے بے تاج بادشاہ تھے۔ وہ اپنے نوحوں کی سر بھی خود ہی ترتیب دیتے تھے اور سریں بھی ایسی لازوال جو عرصہ دراز تک پورے ملک میں رائج رہیں۔ ان کے نوحے کراچی سے لے کر کوئٹہ، اور بلوچستان سے لے کر گلگت تک پڑھے جاتے تھے۔ انہوں نے نوحہ خوانی کی روایت اور بہترین سر اپنی نسلوں میں منتقل کی۔ شاید ان کی ساری زندگی کی محنتوں کا صلہ ہے کہ ان کی اولادوں میں اعلیٰ تعلیمی، تدریسی اور روحانی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔

ان کے بیٹے (ش 2) نے بتایا کہ میرے والد نے اس وقت نوحے لکھنے شروع کئے جب وہ دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ عزاداری امام حسین ? کی چاہ میں انہوں نے اپنی نوکری بھی چھوڑ دی۔ اس کے بعد وہ تمام عمر (80 سال) نوحے لکھتے رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خلوص نیت سے نوحہ و قصیدہ لکھنے والوں پر آمد ہوتی ہے اور جس بزرگ ہستی پر ساٹھ یا پینسٹھ سال کربلا و شام کے موضوعات کی آمد ہوتی رہی ہو اس کی خوش نصیبی کے کیا کہنے۔

انہوں نے مزید بتایا کہ 1994ء کا واقعہ ہے کہ میں ان کے ساتھ دادا دادی کی قبر پر گیا۔ سردی ہو یا گرمی، وہ ہر صبح باقاعدگی سے اپنے والدین کی قبروں پر جاتے اور حدیث کسا پڑھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم بھی میری قبر پر اس طرح آؤ گے جیسے میں آتا ہوں؟ مجھے

دھچکا لگا۔ میں نے کہا ابو جی آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ یہ تو ایک قدرتی بات ہے۔ تم میری بات کا جواب دو۔ میں نے کہا کیوں نہیں ابو جی۔ انہوں نے کہا کہ تم میری بات یاد رکھنا۔ دس محرم کا دن ہوگا اور میرا جنازہ جلوس امام حسینؑ کے سائے میں جائے گا۔ 1990ء میں بھی انہوں نے یہی بات کہی تھی۔ 2007ء میں ان کی طبیعت ناساز رہنا شروع ہو گئی۔ ایک دن ہم ایک مقدس مقام پر گئے۔ ان کا کالر گردن سے ہٹا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ ان کی گردن کے قریب ایک گلٹی ہے۔ واپسی پر میں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ان کے ٹیسٹ ہوئے تو پتا چلا کہ پھیپھڑوں کا کینسر آخری درجے پر ہے اور شاید وہ ایک آدھ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہ پائیں گے۔ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ (meta statis) کا مریض بہت تکلیف میں ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنی انگلی کو بھی حرکت نہیں دے سکتا۔ لیکن وہ آخری دن تک بالکل ٹھیک رہے۔ سات محرم کو ان پر ہلکی سی غنودگی طاری ہوئی۔ آٹھ محرم کو وہ مکمل بے ہوشی میں چلے گئے۔ عاشورہ کی رات میں نے ان کے ساتھ گزاری۔ عاشور کی صبح میں نے ان کے بے ہوش بدن سے اجازت طلب کی اور مختصر وقفے کے لئے جلوس میں حاضری دینے کے لئے چلا گیا۔ اس وقت انہی کا لکھا ہوا شہزادہ علی اکبرؑ کا نوحہ پڑھا جا رہا تھا جب میرے کان میں ہلکی سی آواز پڑی کہ ابو انتقال کر گئے ہیں لیکن ہم نوحہ و ماتم میں اتنے مصروف تھے کہ اس آواز پر کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ ہر سال جب یہ نوحہ پڑھا جاتا تھا تو ابو کہتے تھے کہ اس نوحے کے ساتھ ہی میں بی بی سے اگلے سال کی ضمانت لے لیتا ہوں۔ اس سال ان کی ضمانت ختم ہو چکی تھی۔ میرا ابو کے ساتھ بہت گہرا تعلق تھا اور اتفاق دیکھئے کہ ابو کا دم میرے سامنے نہ نکلا۔ جیسے ہی میں ان سے دور ہوا وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ جب وہ فوت ہوئے تو میرا بھتیجا ان کے ساتھ تھا۔ انہیں ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔ بھتیجا بولا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا بھتیجا بھی نوحہ خواں ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے دادا اور والد سے روحانی صلاحیتیں ورثے میں لی ہیں۔ میں اپنے خدا اور امام زمانہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جب اس نے اسٹیتھوسکوپ ابو جی کے سینے سے لگائی تو اسے زنجیروں کی آوازیں آئیں۔ جب انہیں گھر لایا گیا تو اس وقت جلوس بالکل ہمارے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ ماتمیوں نے ان کا جسد خاکی ایمبولینس سے اتارا اور انہیں غسل اور کفن دیا۔ اور ابو کا جنازہ جلوس کے

درمیان چلتا ہوا قبرستان تک پہنچا۔

انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ان کا چہلم امام حسینؑ کے چہلم کے ساتھ ہوا۔ دوسرے شہر سے آنے والے مومنین اور نوحہ خوانوں نے منبر پر بتایا کہ آج سے 30 یا چالیس سال پہلے انہوں نے بتا دیا تھا کہ ان کا انتقال عاشورہ کے دن ہوگا۔ عشق حسینؑ بھی کیا کیا رنگ دکھاتا ہے۔ جس نے تمام عمران کے نوحے لکھے، جس کے لکھے نوحے اپنی مثال آپ ہیں، جو تمام عمران کے غم میں رویا، جس نے ہمیشہ ان کے یوم کو اپنا یوم بنانے کی خواہش کی، اس نے انہی کا روز پایا۔ ان کی وفات پر کسی نے کیا خوب کہا کہ وہ کسی کا ادھار نہیں رکھتے۔ ان کے بیٹے نے بتایا کہ ان کی برسی ہر سال امام مظلوم کی شہادت کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہمیں کوئی انتظام نہیں کرنا پڑتا۔ سارا انتظام امام مظلوم کا ہوتا ہے۔

6۔2۔3۔ قصہ ایک مرد قلندر کا

یہ ایک ایسے سید صاحب کی کہانی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے الہامی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ 1990ء کی دہائی میں ان کی عمر ستر سال کے لگ بھگ ہوگی لیکن طبیعت کی نیکی کے باعث بچوں کی طرح معصوم، سادہ دل اور نیک نیت تھے۔ وہ بیسویں صدی کی اولین دہائیوں کے کالج گریجویٹ تھے جب ہمارے متوسط درجے کے شہر میں لوگ میٹرک بھی مشکل سے مکمل کرتے تھے۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے ماہر تھے۔ ان کی ہاتھ کی لکھائی سچے موتیوں سے بڑھ کر خوبصورت تھی۔ پاکستان کے قیام سے پہلے وہ رائل فوج کے ملازم تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ایک غیر ملکی تمبا کو کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئے۔ اعلیٰ تنخواہ، بنگلہ اور دیگر مراعات کے باوجود بھی ان کی طبیعت کی درویشی نہ گئی۔ آخر اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر نوکری چھوڑ دی اور اپنے آبائی شہر واپس گئے۔ وہ شکل و صورت کے لحاظ سے جاذب نظر اور پاکیزہ اطوار کے مالک تھے۔ چھ ساڑھے چھ فٹ سے نکلتا قد، گوری رنگت، جلد ایسی نرم و نازک گویا کہ خون وریدوں میں چلتا نظر آتا تھا۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند، طبیعت کے کھرے، نیت کے سچے اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ اکثر

بیداغ سفید لباس میں ملبوس نظر آتے اور ایک انہونا سا نوران کی شخصیت کو اپنے ہالے میں لئے رکھتا۔ جب گلیوں میں چلتے تو تمام افراد سے الگ نظر آتے۔ اگر کہیں بیٹھے ہوتے تو وہاں کا ماحول خوشگوار اور معطر ہو جاتا۔ لوگ کہتے تھے کہ انہوں نے تمام عمر نہ کبھی جھوٹ بولا اور نہ ہی کسی اور معصیت کا شکار ہوئے۔ وہ زیادہ تر اچھے موڈ میں ہوتے۔ طبیعت میں مزاح کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ ان کی گفتگو شائستہ اور الفاظ کا چناؤ بہترین ہوتا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے کی عزت کا خیال کرتے۔ عالم جلال میں بھی طبیعت پر مکمل کنٹرول ہوتا اور منہ سے کوئی بھی ایسی بات نہ نکالتے جو کسی کی دل آزاری کا باعث بنے۔ وہ اپنی الہامی کیفیت میں آنے والے واقعات کا پتا دے دیتے تھے۔

م23 نے سید صاحب کی کہانی کچھ اس طرح سنائی کہ ان سے میری ملاقات 1990ء کی دہائی میں ہوئی۔ ہر نوجوان کی طرح میں بھی ان دنوں تجرباتی نظریہ کی حامل تھی۔ خاندان کے کچھ نوجوان سید صاحب کے پاس جاتے تھے۔ جب میں نے پوچھا کہ کیوں جاتے ہو تو کہنے لگے کہ ان کی دعا بہت جلد قبول ہو جاتی ہے۔ میں بہت ہنسی اور کہا کہ تمہیں اپنے اوپر یقین نہیں کہ خدا تمہاری دعا قبول کرے گا؟ وہ کہنے لگے کہ یقین ہے لیکن اللہ والوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ایک دن اللہ کا کچھ ایسا حکم ہوا کہ میری ملاقات سید صاحب سے ہو گئی۔ وہ ملاقات نہیں تھی بلکہ ایک تبدیلی تھی۔ اس مختصر ملاقات نے نہ صرف میری سوچ بلکہ میری زندگی کا رخ ہی بدل ڈالا۔ میں نے ان دنوں ایک غیر معروف لیکن دلچسپ مضمون میں ایم اے کرنے کے لئے داخلہ لیا تھا۔ میرے گھر والے اس داخلے کے خلاف تھے۔ ایک دن میں سید صاحب کے پاس چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ شفقت سے مسکرائے اور کہنے لگے کہ۔۔۔ہمیں انہوں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آپ تشریف لائیں گی۔ ہم آپ کے انتظار میں تھے۔ میں نے اپنے داخلے کا قصہ ان کی خدمت میں بیان کیا۔ اچانک ان کی کیفیت جلالی ہو گئی۔ وہ کہنے لگے کہ۔۔۔وہ بڑے لوگ ہیں۔ ہم تو فقیر آدمی ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں صحیح ہوں گے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ اس مضمون کو ہرگز نہ چھوڑیں۔ آپ اسی مضمون میں ایم اے کرنے کے بعد ان شاء اللہ امریکہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں جائیں گی اور پورے

خاندان کا نام روشن کریں گی۔

انہوں نے مزید بتایا کہ اس وقت جب مجھے ایم-اے میں بھی مشکل سے داخلہ ملا تھا امریکہ جانے کی بات گویا کہ چاند پانے کی خواہش تھی۔ اس کے علاوہ اس وقت حکومتی یا یونیورسٹی کی سطح پر سکالرشپ ناپید تھی۔ پاکستان کے لئے امریکی امداد بند تھی۔ جب گھر والوں نے وہ بات سنی تو مذاق اڑایا کہ واہ کیا خوب مفروضہ ہے۔ اب خدا کا کرنا کیا ہوا کہ یونیورسٹی میں دوسرے سال کے آغاز کے ساتھ ہی ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلے کے چانس نظر آنے شروع ہو گئے۔ میرے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ نے ہارورڈ یونیورسٹی سے آئے ہوئے سنیئر پروفیسر سے میری ملاقات کروائی۔ انہوں نے ابتدائی تربیت کے بعد درخواست بھیجنے کا مشورہ دیا۔ ایم اے مکمل کرنے کے فوراً بعد میں نے درخواست بھیجی اور میرا داخلہ ہو گیا۔ جس دن اور جس وقت ہارورڈ یونیورسٹی میری ایڈوائزری کمیٹی نے میرے داخلے کا فیصلہ کیا اسی وقت سید صاحب نے آکر ہمارے گھر کا دروازہ بجایا اور داخلے کا مژدہ سنایا۔ مجھے وہ واقعہ اس طرح سے یاد ہے جیسے آج ہی رونما ہوا ہو۔ کڑکتی گرمیوں کی دوپہر تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر دیکھا تو سید صاحب کھڑے تھے، بیداغ سفید لباس میں ملبوس، پسینے میں شرابور، کمزوری اور پیاس سے نڈھال، لیکن پرنور چہرے پر ننھے بچوں جیسی معصومیت اور بیتابی کے آثار تھے۔ میں جلدی سے انہیں اندر لے کر آئی اور روح افزا پیش کیا۔ وہ بتانے کے لئے بیتاب تھے کہ ابھی اسی وقت تمہاری کمیٹی نے ہارورڈ کے فلاں آفس میں بیٹھ کر تمہارے داخلے کی منظوری دے دی ہے۔ مجھے اس خبر کی توقع نہ تھی کیونکہ جب میں نے درخواست بھیجی تو اس وقت تک باقاعدہ داخلے کا وقت گزر چکا تھا۔ بعد ازاں پتا چلا کہ میرے سپروائزر کی درخواست پر بعض شرائط کے ساتھ مجھے ایک سال کا داخلہ اور اسکالرشپ دیا گیا تھا۔

انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ 1997ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن اچانک میرے دل پر بوجھ پڑ گیا۔ ان دنوں ہم ایک دوسرے شہر میں منتقل ہو گئے تھے۔ میں نے امی سے کہا کہ میں کچھ تحفے سید صاحب کے لئے بھیجنا چاہتی ہوں۔ امی کہنے لگیں کہ جب ہم اپنے شہر

جائیں گے تو اپنے ہاتھ سے دینا۔ میری زبان پر آتے آتے رہ گیا کہ تب وہ نہیں ہوں گے۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ سید صاحب وفات پا گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سید صاحب کے فوت ہونے کے بعد میں نے ان کے ایال ثواب کے لئے فروٹ تقسیم کیا۔ اسی رات وہ میرے خواب میں آئے اور کہنے لگے کہ۔۔۔ آپ نے جو پھول ہمیں بھجوائے ہیں وہ ہم نے وصول کر لئے ہیں۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میری طبیعت بچپن سے حساس تھی۔ معمولی باتوں پر افسردہ ہو جاتی۔ ایسے میں سید صاحب کی شخصیت میرے لئے ابر باراں کی طرح تھی۔ وہ میری باتوں کو غور سے سنتے اور عمدہ مشورہ دیتے۔ سید صاحب سے ملاقات کے بعد میری روحانی بالیدگی میں اضافہ ہوا اور میری طبیعت میں ٹھہراؤ آتا گیا۔ عبادت الٰہی اور دین میں ریسرچ کی عادت پڑی۔ غور و فکر میں اضافہ ہوا۔ ان کی وفات کے بعد کچھ عرصے تک مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں سارے جہان میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ گو کہ بھرپور محبت کرنے والا خاندان موجود تھا لیکن سید صاحب کا اپنا ہی ایک مقام تھا۔ ان کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری بات سمجھنے والا یا میرے سرعت خیال کو محسوس کرنے والا کوئی بھی نہیں۔

ایک اور شریک ریسرچ م 22 نے بھی سید صاحب کے بارے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سید صاحب ایک فقیر منش انسان تھے۔ ان کی وفات کو عرصہ گزر گیا لیکن مشکل حالات میں انہوں نے جس طرح سے میری رہنمائی کی میں محسوس کرتا ہوں کہ آج بھی وہ میرے ساتھ ہیں۔ ان کے بارے میں ایک غیر معمولی واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ان دنوں میں خود روحانیت کی جانب گامزن تھا۔ نماز، روزہ کے علاوہ درود بر محمد و آل محمد کی جانب میری طبیعت بہت زیادہ مائل ہو گئی تھی۔ میں نے اکثر سید صاحب کے پاس جانا شروع کر دیا۔ ان کے موڈ بدلتے رہتے۔ کبھی تو مجھے دیکھ کر انتہائی خوشی کا اظہار کرتے۔ اگر کبھی مجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی تو چاہے بظاہر انہیں اس کا پتا بھی نہ ہوتا تو بھی مجھے دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کرتے اور کہتے کہ 'جا۔۔۔ میرے پاس کیا کرنے آیا ہے؟ گلیوں میں جا کر ہوا کھا'۔ جب میں ان سے ملنے جاتا تو اپنے کمرے میں بیٹھے ہوتے۔ ان کے ہاتھ میں پتوں سے بنی ایک پنکھی ہوتی اور

ایک بجلی کا پنکھا آہستہ رفتار میں چل رہا ہوتا۔ وہ پنکھی سے اپنے آپ کو ہوا دیتے رہتے۔ ان کے جسم پر زخموں کے نشان نظر آتے۔ شاید وہ گرمی کے اثر سے بنتے ہوں۔ ان کی جلد ننھے بچوں جیسی نرم و نازک تھی۔ وہ تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کرتے۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ حضرت علیؑ سے باتیں کرتے ہیں۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ 1997ء کی گرمیوں کا ذکر ہے۔ میں بی-ایس-سی کا امتحان دے کر حال میں ہی فارغ ہوا تھا کہ اپنے مکان کی چھت سے گرا اور لوہے کے گیٹ سے لگتا ہوا زمین پر آرہا۔ اندرونی اور بیرونی چوٹیں سیریس تھیں۔ مثانہ بری طرح سے زخمی ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد میں سید صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ میری حالت دیکھ کر خاموش سے ہو گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں بہت پریشان ہوں۔ انہوں نے شفقت سے وجہ پوچھی۔ میں نے بتایا کہ تین ماہ کے بعد میرا بی ایس سی کا رزلٹ آنا ہے۔ میرے پیپر اچھے نہیں ہوئے۔ نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمسٹری کا کالج میں استاد نہ تھا اور استاد کے بغیر مشکل تصورات سمجھنے مشکل تھے۔ میں جانتا ہوں کہ میں کیمسٹری میں فیل ہو جاؤں گا۔ اس وقت تو وہ کچھ نہ بولے اور میں گھر واپس آ گیا۔ ٹھیک دو گھنٹے کے بعد انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو ایک رقعہ دے کر میرے پاس بھیجا اور ہدایت کی کہ وہ اسے کھول کر نہ دیکھے۔ جیسے ہی میں نے رقعہ کھولا تو ان کی خوبصورت لکھائی میں انگریزی زبان کی یہ تحریر نظر آئی۔۔۔۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم امتحان پاس کر چکے ہو۔ نیچے لکھا ہوا تھا کہ تمہارا رزلٹ تین نہیں بلکہ ایک مہینہ میں آئے گا۔ انہوں نے یہ بھی تحریر کیا تھا کتنے نمبر حاصل کروں گا۔ اس تحریر کو پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آج بھی جب میں یہ قصہ بیان کرتا ہوں تو مجھے اس وقت کی کیفیت یاد آ جاتی ہے۔ صحیح ایک مہینے کے بعد بی ایس سی کا نتیجہ نکلا اور میں نے اتنے ہی نمبر حاصل کئے جتنے سید صاحب نے بتائے تھے۔

انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ان کا لاغر بدن ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ موت کے سائے صاف منڈلاتے نظر آرہے تھے لیکن ان کا نورانی چہرہ پرسکون تھا۔ گویا کہ ایک نفس مطمئنہ اپنے رب سے ملاقات کے لئے تیار

تھا۔انتقال سے کچھ دیر پہلے انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ ہر وقت باوضو رہا کرو اور محمد وآل محمد پر درود بھیجتے رہا کرو۔ میں آج بھی ان کی نصیحت پر عمل پیرا ہوں لیکن میں اس روحانی بالیدگی سے بہت دور ہوں جو سید صاحب کی ذات کا حصہ تھی۔ جتنے وہ صاف نیت تھے اور مادہ پرستی سے دور ہمارے لئے شاید ان جیسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ جب وہ زندہ تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خدائی امداد خود چل کر میرے پاس آتی تھی اور میری انگلی پکڑ کر مجھے راہ دکھاتی تھی۔ان کے بعد میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔خدا انہیں اپنی جوار رحمت میں خاص مقام عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔

اسی سلسلے میں ایک اور شریک تحقیق م24 نے بتایا کہ انہوں نے ایم-ایس-سی کرلی تھی اور نوکری کے لئے تگ ودو کر رہے تھے۔نوکریوں کا یہ حال تھا کہ اگر اپنی قابلیت سے بہت کم نوکری کے لئے بھی درخواست دیتے تو جواب نہ آتا۔اگر آ بھی جاتا تو پتا چلتا کہ انٹرویو تو صرف ایک دکھاوا تھا۔انتخاب تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ان افسردہ دنوں میں میری والدہ صاحبہ سید صاحب کے پاس گئیں۔ان کی عادت تھی کہ بات کرنے سے پہلے ہواؤں میں دیکھتے تھے۔اس کے بعد بات کرتے تھے۔اس دن بھی انہوں نے اسی طرح کیا اور کہا کہ اسے بہت جلد اعلیٰ نوکری ملے گی۔وہ امریکہ، سعودیہ، جرمنی، اٹلی اور ہالینڈ جائے گا۔امی نے مجھے بتایا تو میں ہنس پڑا اور کہا کہ یہاں تو نوکری ہی نہیں مل رہی اور سید صاحب نے پینتیس (35) (زیادہ ہونے کا استعارہ) ملک گنوا دیئے ہیں۔کچھ ہی دن گزرے تھے کہ مجھے آئی-او-پی سے کال آ گئی۔نوکری شروع ہونے کے صرف چھ ماہ بعد ادارے کی جانب سے مجھے امریکہ بھیج دیا گیا۔ واپسی پر مجھے عمرہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ش12 نے مزید بتایا کہ جب ان کے ہاں دوسرے بچے کی نوید آئی تو وہ سید صاحب کے پاس گئے۔ان کی عادت تھی کہ وہ بات سن کر اوپر کی جانب دیکھتے، کچھ سوچتے اور پھر جواب دیتے۔اس دن بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔کچھ سوچنے کے بعد بولے کہ تمہارے ہاں بیٹا ہوگا۔اس کا نام تو تم جانتے ہی ہو۔جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو کہنے لگے کہ بھلا کیا؟ میں نے کہا زین العابدین۔کہنے لگے نہیں یہ مکمل نام نہیں ہے۔جو نام تمہیں بتایا گیا تھا وہ سید زین العابدین تھا۔قصہ یوں تھا کہ کچھ سال پہلے

جب میں ایم۔ایس۔سی کر رہا تھا اور پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹل میں قیام پذیر تھا تو امام زین العابدین میری خواب میں تشریف لائے اور فرمایا کہ تمہارا ایک بیٹا پیدا ہوگا اس کا نام سید زین العابدین رکھنا۔اس کے علاوہ انہوں نے گلہ کیا مجالس میں میرا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا جاتا(1)۔ جب میں اپنے آبائی شہر گیا تو پھوپھی سے کہا کہ امام زین العابدینؑ کے نام کی مجلس کروائیں جو انہوں نے کروادی۔حیرت کی بات تو یہ تھی کہ میں نے اس خواب کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔حتیٰ کہ پھوپھی سے بھی نہیں لیکن سید صاحب تمام واقعہ پہلے سے ہی جانتے تھے۔

م25 ایک اور نوجوان طالبہ تھیں جنہوں نے سید صاحب کی شخصیت سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے بتایا کہ ایم اے کرنے کے فوراً بعد مجھے ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری مل گئی۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد چند غلط فہمیوں کی بنا پر میری نوکری ختم ہوگئی۔ایک عزیز کے ذریعے ایک اور ادارے تک رسائی حاصل کی لیکن ڈائریکٹر صاحب ٹال مٹول کر رہے تھے۔ایک دن دوست کے توسط سے میری ملاقات سید صاحب سے ہوئی۔انہوں نے کوئی حوصلہ افزا بات نہ کی اور کہنے لگے کہ جب وہ ڈائریکٹر اس طرح کر رہا ہے تو کیا کر سکتے ہیں۔کچھ ہی دن گزرے تھے کہ انہوں نے میری سہیلی کے ذریعے پیغام بھیجا کہ تمہارا کام ہوگیا ہے۔تم ان کے خط کا

1 یہاں پر ہم ایک نوٹ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ایسے خواب کچھ اور لوگوں نے بھی دیکھے کہ کسی بی بی نے آکر گلہ کیا کہ تم لوگ مکمل طور پر میری مجلس نہیں برپا کرتے۔اب ان پاک ہستیوں کا ماجرا تو کچھ یوں ہے وہ سب ایک ہی تھے۔ان کی سیرت ایک، ان کے اعلیٰ مقاصد ایک اور بصیرت ایک جیسی تھی۔پھر گلہ کیوں کہ میرا تفصیلاً ذکر نہیں کیا جاتا؟ میرے خیال کے مطابق ان کا زمانہ اور حالات ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھے۔مثلاً واقعہ کربلا جیسا واقعہ اور کسی امام کے ساتھ پیش نہ آیا۔امام جعفر صادق ؟ جیسی دینی اور دنیوی علوم کی ترویج کا موقع کسی اور کو نہ ملا۔امام موسیٰ کاظم جیسی قید و بند کی صعوبتیں کسی اور امام نے برداشت نہ کیں۔امام مہدی ؟ آخر زمان کے ساتھ جیسی دشمنی کی گئی اور کسی نے اتنے طویل عرصے تک دشمنوں کے مذموم ہتھکنڈوں کا سامنا نہ کیا وغیرہ۔حالات و واقعات کے اس تغیر و تبدل میں حکمت اور معنوں کا ایک جہان آباد ہے۔اگر ہم ان کا تفصیلی ذکر کریں تو شاید پنہاں پہلو روشن ہوجائیں اور چراغ راہ کا کام دیں۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ حالات میں مخصوص اذکار کی ضرورت ہوتی ہے۔مثلاً بیسویں صدی کی آخری اور اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں فرقہ وارانہ شدت کی جو فضا چلی اس سے نپٹنے کے لئے مخصوص ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ہوسکتا ہے کہ کوئی نورانی ہستی خواب کے ذریعے ان ہتھیاروں کی جانب اشارہ کرتی ہو۔

انتظار نہ کرو اور جا کر ڈائریکٹر صاحب سے ملو۔ ان دنوں فون کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ خطوط بھیجے جاتے تھے۔ میں اسی روز اسلام آباد گئی اور ڈائریکٹر صاحب سے ملی۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے آج ہی آپ کو خط بھیجا تھا۔

انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ کچھ عرصے کے بعد پنجاب پبلک سروس کمیشن کی طرف سے انٹرویو کے لئے بلاوا آیا۔ میں سید صاحب سے ملی تو کہنے لگے کہ آپ جائیں وہ لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس انٹرویو میں میرا انتخاب کانٹریکٹ پر ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب میری نوکری مستقل ہوئی تو میری تعیناتی کوہ مری کے ایک کالج میں ہوئی۔ میرے والدین ضعیف تھے اور میں اپنا گھر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میں بہت پریشانی کے عالم میں سید صاحب سے ملی۔ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ فکر نہ کرو تمہارے حق میں بہتری ہوگی۔ اب خدا کا کرنا کیا ہوا کہ راولپنڈی کی ایک لڑکی کا تبادلہ ہمارے شہر میں ہوا تھا۔ جب وہ جوائننگ دینے ڈائریکٹریٹ گئی تو اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے ذہن میں خود بخود ہی ایک خیال آیا۔ وہ کہنے لگے کہ تم نے تو ہر حال میں ہاسٹل میں ہی رہنا ہے۔ اگر تم مری چلی جاو اور وہ۔۔ اپنے ہی شہر میں رہ جائے تو اس کا بھلا ہو جائے گا۔ وہ لیکچرار مان گئی۔ اس طرح سے میری مشکل کا حل نکل آیا۔ مجھے لگتا ہے یہ سب کچھ سید صاحب کی دعا کی وجہ سے ممکن ہوا۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اس بیٹی نے بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ ان کی بات سچ ثابت ہوئی۔ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔ میں اپنے والدین کا سہارا بنی۔ اپنی بہنوں اور بھائیوں کے بچوں کو تعلیم دلوائی۔ نہ صرف یہ بلکہ خاندان کے علاوہ دوسرے غریب بچوں کی تعلیم کے اخراجات بھی پورے کئے۔

اگر غور کیا جائے تو اوپر بیان کئے گئے تمام واقعات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ جب ان شرکاء کی ملاقات سید صاحب سے ہوئی تو وہ سب تگ و دو کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ وہ اوسط درجے کے طلباء تھے لیکن سید صاحب سے ملاقات کے بعد ان کی سوچ میں نکھار پیدا ہوا اور سید صاحب کی شخصیت کی برکت اور رہنمائی کی وجہ سے عبادت الٰہی، ارتکاز اور غور و فکر میں اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم سے خاص شغف پیدا ہوا اور محنت میں لطف آنے لگا۔ نتیجتاً انہوں نے تعلیمی

میدان میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور بروقت اپنے پیشے سے منسلک ہو گئے۔آخرکار وہ اپنے پیشوں کے ماہر بنے اور اپنی فیلڈ میں نام پیدا کیا۔گویا کہ سید صاحب کی روحانی طاقت اور نیک نیتی نے ہیرا تراش کا کام کیا۔شاید ان کی زندگی کا مقصد یہی تھا کہ نوجوان نسل کی رہنمائی کریں اور انہیں اس وقت راہ راست پر ڈالیں جب ان کی بات سننے اور سمجھنے والا کوئی نہ ہو۔افسوس کہ اس سب کے باوجود صرف چند لوگ ہی سید صاحب کی روحانی بالیدگی کے قائل تھے اور اس سے بھی کم ان کی خداداد صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکے۔

چوتھا باب

مجالس امام حسینؑ: ارتکاز انعکاس اور جذبات

اس تحقیق کے شرکاء میں شیعہ بچوں سے لے کر عمر رسیدہ خواتین و حضرات تک نے شرکت کی (دیکھئے جدول # 2)۔ان شرکاء میں پاکستان کے علاوہ، امریکہ اور ایران میں رہنے والے پاکستانی بھی شامل تھے۔ایک شریک تحقیق امریکہ میں رہائش پذیر عربی خاتون تھیں۔اس کے علاوہ پانچ علما یا حدیث پڑھنے والے خواتین و حضرات تھے۔جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا کہ تحقیق کے پہلے تین سوال مجالس امام حسینؑ کے فوائد اور چوتھا سوال معنوی تھا۔لہٰذا پہلے تین سوالوں کے جوابات تقریباً سب شرکاء نے دیئے جبکہ چوتھے سوال کا جواب چند شرکاء نے دیا۔ممکن ہے کہ شرکاء چوتھے سوال کو ذاتی سمجھتے ہوں اور اس کا جواب اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتے ہوں۔ مندرجہ ذیل حصے میں شرکاء کے جوابات تحریر کئے جاتے ہیں۔

4.1۔سوال نمبر 1 کے جوابات

سوال نمبر 1 مجالس کے روحانی فوائد کے بارے میں تھا۔اس سلسلے میں م 1 ذاکرہ عالمہ ہیں۔انہوں نے کہا کہ ہمارے وجود کے دو حصے ہوتے ہیں ایک جسم اور دوسری روح۔جسم کو تو ہم محسوس کر سکتے ہیں، ناپ تول سکتے ہیں، جبکہ روح غیر مرئی ہوتی ہے۔مجالس امام حسینؑ پڑھنے کے جسمانی اور روحانی فوائد بہت زیادہ ہیں۔مثال کے طور پر مجلس پڑھنے کے بعد ایک عجیب روحانی سکون ملتا ہے۔مومنین کی دعائیں، محبت اور چاہتیں ہمارے حوصلے کو مزید بڑھاتی ہیں، ایک عجیب سی توانائی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔میں سمجھتی ہوں سب سے بڑا روحانی فائدہ تو یہی ہے۔اس کے علاوہ مجالس امام حسینؑ پڑھنے کے اتنے فوائد ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔یہ ذکر ان ہستیوں سے متصل ہے جو آخرت میں ہماری شفاعت کی ضامن ہیں اور یہی ہماری اساس ہے۔بس یہی احساس رہتا ہے کہ اگر ہماری حاضری بی بی کے ہاں منظور ہو جائے تو ہم گناہگاروں کی آخرت سنور جائے گی۔اس کے علاوہ ذکر حسینؑ فکری عروج عطا کرتا ہے۔ یہ عالی شان ذکر قلوب اور روح کو جلا بخشتا ہے۔

انہوں نے مزید بتایا کہ دوسرا روحانی فائدہ ذہنی پرواز ہے۔کہاں ہم اور کہاں ان بزرگ

ہستیوں کا ذکر؟ ہم نے نہ تو کسی حوزہ سے پڑھا نہ ہی کسی مکتب یا مدرسہ سے۔ لیکن مولا کا ذکر بیان کرتے ہوئے ہماری نظریاتی پرواز اس قدر بلند ہو جاتی ہے ایسے اعلیٰ خیالات، ایسا ذخیرہ الفاظ اور ایسی قوت، ہمارے جیسے عام انسانوں کے بس کی بات نہیں اور پھر بیان اس قدر منسلک اور بامعنیٰ ہوتا ہے کہ ہر سطح اور ہر عمر کے سامعین آسانی سے اس بیان کو سمجھتے ہیں اور اپنے حالات کے مطابق اسباق حاصل کرتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہر ذاکر کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آتا ہے۔ جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو اس کے ادراک کا حق ادا نہیں کر پاتے۔ لیکن جب مجلس کے لئے کسی آیت کو موضوع بناتے ہیں تو اس کے اندر سے مطالب و معنی کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

م 2 مجتبیٰ نے کہا کہ آپ نے مجھ سے مجلس امام حسینؑ کے بارے میں پوچھا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کے دور میں امام حسینؑ کا اصل پیغام لوگوں تک پہنچ نہیں پا رہا۔ منبر امام حسینؑ سے فاسد نظریات پھیلائے جا رہے ہیں۔ منبر امام حسینؑ پر بیٹھنے والے پہلے سے اپنے بیان کی قیمت چکاتے ہیں۔ آپ خود سوچیں کہ جو افراد دوسرے انسانوں سے مانگ رہے ہوں وہ سامعین کو کیا سبق دے پائیں گے۔

انہوں نے مزید کہا کہ مجالس امام حسینؑ ایک وسیع موضوع ہے۔ مجالس میں شرکت کرنے سے ہمارے دل گداز ہو جاتے ہیں۔ مجلس بیان کرنے والا چاہے کوئی ہی کیوں نہ ہو ہم اپنی روحانی بالیدگی کی وجہ سے امام حسینؑ کی مظلومیت پر گریہ کرتے ہیں۔ اس گریے سے ہمارے غم کم ہوتے اور ہمارے دل تقویت پاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ اپنے بندوں کے گناہ، غفلتیں اور معصیتیں معاف کرنے والا ہے تو گریہ امام حسینؑ کی بدولت ہمارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مریضوں کو اس در سے شفا عطا ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ امور بہت بڑی کرامات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنا نقطہ نظر مزید واضح کرتے ہوئے کہا کہ ہر مقرر کی اپنی ایک روحانیت ہوتی ہے۔ یہاں میں مولانا جان علی کاظمی کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ وہ پاراچنار مجلس پڑھنے کے لئے گئے۔ جب وہ سات یا آٹھ مجالس پڑھ چکے تھے تو ایک دن اتفاقاً اس عمارت کی چھت پر جانا ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں ناچ گانے کی محفل جمی ہوئی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ مقامی باشندوں نے بتایا کہ وہاں روزانہ ناچ گانے کی محفل جمتی

ہے۔انہوں نے اسی وقت واپسی کا ارادہ کرلیا۔لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ جس عمارت میں میں کئی ایک مجالس پڑھ چکا ہوں اگر اسی جگہ لوگ ناچ گانے کی محفلیں سجارہے ہیں تو میرے بیان یا نیت میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ بہتر ہے کہ میں یہاں مزید مجالس نہ پڑھوں۔

م 3 رضا نے کہا کہ آپ نے مجالس امام حسینؑ کے بارے میں سوالات بھیجے تھے لیکن میں کچھ وجوہات کی وجہ سے جواب نہیں دے پارہا تھا۔کل رات مجھے کچھ اشارہ ہوا جس کی وجہ سے صبح سویرے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے آپ کو جواب دے رہا ہوں۔۔۔انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جن سوالوں کو آپ نے آسان اور سادہ کہا ہے ان کے جواب اتنے آسان نہیں ہیں۔ان سوالات میں مطالب ومعنی کے لامحدود خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ مجالس امام حسینؑ فیوض وبرکات سے لبریز ایک لامتناہی سمندر ہے۔ ہر دور اور ہر مذہب کے انسان نے کربلا کی تفصیلات بیان کرنے کی کوشش کی لیکن روز عاشور وقوع پذیر ہونے والے اس واقعہ کو آج تک کوئی بھی مکمل طور پر سمجھ نہیں پایا۔اگر کوئی دعوی کرتا ہے کہ اس نے مکمل طور پر کربلا کو سمجھ لیا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ اس کے باوجود بھی کربلا نے ہمیں اتنا کچھ سکھا دیا ہے جو ہماری دنیاوی اور اخروی زندگی کے لئے کافی ہے۔شیعہ قوم کے بچے بچپن سے ہی مجالس سنتے چلے آتے ہیں۔مجالس ہماری درس گاہ ہیں۔البتہ مجلس میں بیٹھے ہوئے ہر شخص کا اپنا ادراک ہوتا ہے اور اپنی روحانیت۔دین کی معرفت رکھنے والوں کا اپنا مقام ہوتا ہے اور کم علم رکھیہ والوں کا اپنا۔لیکن ہر سننے والا اپنی توفیق کے مطابق اس محفل سے اپنی جھولی بھر کرلے جاتا ہے۔۔۔آپ نے مجالس امام حسینؑ کے ہماری زندگیوں پر اثرات کے بارے میں سوال کیا ہے۔اگر میں اپنی بات کروں تو میں نے زندگی میں جو کچھ بھی سیکھا مجالس امام حسینؑ سے سیکھا۔ سیکھنے سکھانے کا یہ سلسلہ صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔مجالس ہمیں کربلا کا راستہ دکھاتی ہیں۔کربلا انسانیت ہیاور انسانیت حسینیت کا دوسرا نام ہے۔کربلا کے بغیر نہ صرف ہم نامکمل ہیں بلکہ ہمارے اعمال بھی بے اثر ہیں۔کربلا نے ہمیں عمل کا راستہ دکھایا۔زندہ رہنے کے اصول سکھائے۔مجالس نے ہمیں قرآنی آیات کے مطالب بیان کئے۔مثلاً حضرت یونس کا

واقعہ ہی لے لیجئے۔ وہ تین دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ مچھلی نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہیں پوری دنیا گھما دی۔ یہ واقعہ میں نے مجلس امام حسینؑ میں سنا اور اس سے کئی ایک نتائج اخذ کئے۔ مجالس کے ذریعے سے ہم نے معصومین کی زندگی کے روشن پہلو دیکھے۔ معصومین نے عوام میں رہ کر عوام کی طرز پر زندگی گزاری۔ ان امور پر ہم جتنا بھی سوچیں ہماری سوچ کے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں اور ادراک کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

م4 حوزہ علمیہ قم میں قیام پذیر عالم دین ہیں۔ انہوں نے شہریار سے کہا کہ میں مجالس امام حسینؑ کی وجہ سے عالم دین ہوں اور قم شریف میں میرا قیام ہے۔ میں نے مجلس امام حسینؑ سے سیکھا کہ ایک سچے انسان کی تعریف کیا ہے؟ مجھے امام حسینؑ کی مجالس سے ہدایت ملتی ہے۔ میں راہ بھٹکا ہوا ہوں لیکن مجالس امام حسینؑ سے مجھے حق کا راستہ ملتا ہے۔ میری سیاہ روح کو مجلس امام حسینؑ کی وجہ سے روشنی ملی۔ حالات کی سختی جب مجھے کمزور کر دیتی ہے تو میں مجلس امام حسینؑ سے طاقت حاصل کرتا ہوں۔ میں نے یہ سب کچھ اور اس سے بہت زیادہ مجالس امام حسینؑ سے سیکھا۔ انہوں نے زندگی کے بیشمار مشکل لمحات بی بی معصومہ قمؑ کی معیت میں گزارے۔ ان کے کہنے کے مطابق۔۔۔ بی بی کا روضہ صحن مادر کی طرح ہے جہاں جا کر انسان سب غم فراموش کر دیتا ہے۔ بی بی کی محبت میں انہوں نے گویا کہ ایک قصیدہ لکھ دیا جو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

'اگر میں روضے پر حاضری کی بات کروں
تو جب میں اداس ہوتا ہوں تو بی بی معصومہ قم کے روزے پر حاضری دیتا ہوں۔
جب میں خوش ہوتا ہوں تو بی بی کے روضے کو سلام کرتا ہوں
جب میں پریشان ہوتا ہوں تو بی بی کے روزے کی جانب دیکھتا ہوں
جب میں تنہائی محسوس کرتا ہوں تو بی بی کا روضہ میرا رفیق بن جاتا ہے۔
میں خانہ بدوش ہوں، میرا کوئی گھر نہیں
بی بی کا روضہ ہی میرا گھر ہے' (فارسی متن کے لئے دیکھئے ضمیمہ 1)۔

م5 پاکستانی نژاد امریکی شہری ہیں جن کا قیام ایران میں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بی بی معصومہ قم کے روضے پر حاضری دینے سے میں اپنے تمام غم بھول جاتی ہوں۔ وہاں جا کر میرا دل

مطمئن ہو جاتا ہے، ایک ایسا اطمینان جو اور کسی مقام پر حاصل نہیں ہوتا۔ بی بی کے گنبد پر نظر پڑتے ہی میں اپنی سب پریشانیاں بھول جاتی ہوں۔ عام طور پر میں ہجوم میں جانا پسند نہیں کرتی۔ لیکن بی بی کے حرم کا ہجوم مجھے پریشان نہیں کرتا۔ وہاں باجماعت نماز پڑھنا بھی عجب سرور رکھتا ہے چاہے بچے تنگ ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

حوزہ علمیہ قم میں مقیم ایک اور خاتون م 6 نے بیان دیا کہ مجالس امام حسینؑ مجھے اللہ تعالیٰ سے ملاتی ہیں۔ امام کے مصائب پر گریہ کرنے سے میرا دل نرم و گداز اور سوچ پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ میرے حالات کتنے ہی دگرگوں کیوں نہ ہوں یہ سوچ کر صبر آ جاتا ہے کہ میری مشکلات امام مظلوم کی مشکلات جیسی تو نہیں۔ مجالس مجھے اپنی تخلیق، اپنے خاندان، کردار اور امام العصر کی جانب اپنے مقاصد سمجھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مجالس امام حسینؑ سے میں بچے پالنے اور گھر چلانے کے طریقے سیکھتی ہوں۔ انہوں نے مزید کہا کہ بی بی کے حرم میں جانا ایسا ہی ہے جیسے اپنے گھر لوٹ آنا۔ اگر میرا دل اداس ہو تو صحن حرم میں شاد ہو جاتا ہے۔ اگر ایمان کسی وجہ سے ڈگمگا جائے تو بی بی کے روضہ پر حاضری دینے سے وہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ ضریح پاک میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں سکون کے سمندر میں غوطہ زن ہوں۔ وہ میری ماں کی طرح ہیں۔

م 7 نے کہا کہ مجلس امام حسینؑ میں شرکت کرنے سے نہ ڈرنا چاہیے نہ پیچھے ہٹنا چاہیے کیونکہ یہی امام کا مقصد تھا۔

م 8 نے مجالس امام حسینؑ کے بارے میں اس طرح اپنی رائے کا اظہار کیا کہ، ہم نے مجالس امام حسینؑ سن کر اپنی زندگی کی مشکلات پر صبر کرنا سیکھا۔ پاک امام کی ذات نے ہمیں سکھایا کہ سچ اور حق کو پانے کے لئے اپنا دل کس طرح بڑا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مجالس کی وجہ سے ہمارے دل میں نرمی پیدا ہوئی۔ اہل بیت سے محبت میں اضافہ ہوا۔ امام نے دین اور نماز کو بچانے کے لئے پورا کنبہ لٹا دیا۔ ہم نے بھی عہد کیا کہ ہم امام کی اتباع کریں گے اور اول وقت پر نماز کی پابندی کا خیال رکھیں گے۔ اس کے علاوہ مجالس میں جانے کی وجہ سے ہم نے وقت کی پابندی بھی سیکھی۔ مجلس کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اس کے حساب سے آپ کو تمام کام مکمل کرنے پڑتے ہیں۔ مجلس میں بیٹھنے اور خاموشی کے ساتھ مجلس سننے کے ادب آداب سیکھے۔ مجالس امام

حسینؑ میں شرکت کرنے سے زندگی پاک و پاکیزہ ہوجاتی ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ منہ سے کوئی غیر مہذب بات نہ نکلے اور نہ ہی کسی کی غیبت کی جائے۔

م 9 غیر شیعہ سے شیعہ ہونے والی خاتون تھیں۔ شادی کے بعد پہلے ان کے خاوند نے اور اس کے بعد انہوں نے خود شیعیت اختیار کی۔ ہمارے سوالات کے جواب میں انہوں نے اپنی زندگی کے حالات سے آگاہ کیا۔ مندرجہ ذیل دو بیانات ان کے اور ان کے خاوند کے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ نماز روزے کے پابند تو ہم پہلے سے تھے لیکن شیعہ عقائد اختیار کرنے کے بعد تو ہماری زندگی بدل گئی۔ مجالس امام حسینؑ تو گویا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے لئے ایک خاص تحفہ ہیں۔ جب ہم محمد و آل محمدؐ کی داستانیں سنتے ہیں تو دل کو ایک خاص قسم کا سکون ملتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ عبادت الٰہی کا جو لطف اب آتا ہے وہ ہم نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ جیسے کچھ کمی تھی جواب پوری ہوگئی ہے۔ ہمارے دادا اہل سنت تھے، لیکن وہ محمد و آل محمدؐ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ وہ مجالس امام حسینؑ کے باہر گارڈ کے طور پر کھڑے رہتے، منبر پر پڑھتے اور عزاداری میں بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ہمارے والد روزی کی تلاش میں اپنے علاقے سے نکل گئے۔ اس کے ساتھ ہی عزاداری سے بھی ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ شادی کے بعد میرے خاوند کو ان کے ایک رفیق کار نے اس راستے پر لگایا۔ انہوں نے کہا کہ تم خود تحقیق کرو اور غور کرو کہ تم کون سا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ میرے خاوند نے مجلسوں میں جانا شروع کر دیا۔ ان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ وہ شیعہ ہوگئے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ اہل بیت کا راستہ حق کا راستہ ہے۔ انہوں نے گھر میں کسی کو بھی مجبور نہیں کیا کہ وہ شیعہ ہو جائیں۔ بلکہ کہا کہ تم خود تحقیق کرو اور جس جانب تمہارا ذہن جائے وہی راہ اختیار کرو۔ اس کے بعد میں نے مجالس میں آنا جانا شروع کیا تو اہل بیت کی آزمائشیں سن کر دل خون کے آنسو روتا تھا۔ مجالس سن کر میرے علم میں اضافہ ہوا اور ذہن نے کہا کہ یہی حق کا راستہ ہے۔ اسی پر چلو۔ اس کے بعد میرا پورا گھرانہ شیعہ ہوگیا۔ ابھی بھی تشنگی باقی ہے۔ لیکن مجالس میں جانے کی وجہ سے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس راستے پر قائم رکھے اور میرے بہن بھائی بھی اسی راستے پر چل نکلیں۔

م10 نے کچھ اس طرح اپنا بیان دیا کہ السلام علیکم کربلا جنت ہے شکر الحمدللہ کہ اس جنت کا راستہ مجھے دکھا دیا گیا ہے اور جیسا سنا تھا اس مقام کو اس سے ہزار گنا بڑھ کر پایا۔ کیا پرسکون مقام ہے کربلا کا۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو وہاں جانا نصیب فرمائے۔ تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے اس مقام کو دیکھ سکیں اور محسوس کریں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ جنت ہے کربلا تو واقعی کربلا جنت ہے۔

م11 نے کہا کہ آپ مجالس کی وجہ سے زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا پوچھتی ہیں تو میری زندگی میں ان مجالس کی وجہ سے بے شمار تبدیلیاں آئیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ مجھے صبر کی برکات کا پتا چلا۔ کربلا کے واقعات سن کر اپنی مشکلات حقیر نظر آتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ بھلا انسان کی زندگی کا مقصد ہی کیا ہے؟ اس مقصد کی پہچان کرنی ہے اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہے۔

م12 ایک چھ سالہ بچی تھی۔ اس نے جب اپنی والدہ کو اس تحقیق میں شامل ہوتے دیکھا تو خود بھی اس تحقیق میں شامل ہونے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ جب اس سے سوالات پوچھے گئے تو اس نے کہا کہ مجلس میں جانے کی وجہ سے سیرت بی بی فاطمہؑ پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ جس طرح وہ اپنے گھر کا کام خود کرتی تھیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی تھیں، اول وقت پر نماز پڑھتیں اور پردہ کرتی تھیں، اسی طرح سے ہماری کوشش بھی ہوتی ہے کہ اچھی بیٹی، بیوی اور ماں بننے کی سعی کریں۔

م13 بارہ سالہ بچی تھی۔ م12 کی طرح اس نے بھی تحقیق میں شمولیت پر اصرار کیا۔ سوالوں کے جواب میں اس نے کہا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم مجلس امام حسینؑ کی وجہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں نماز اول وقت پر پڑھتی ہوں اور ہر کام وقت پر کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ذکر امام حسینؑ سننے کی وجہ سے مولا کے لئے دل میں محبت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ میں بی بی زینبؑ کی سیرت پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتی ہوں۔

م14 عالمہ تھیں۔ انہوں نے کہا کہ مجلس پڑھنے سے میرے اندر روحانی تبدیلی رونما ہوئی ہے اور یہ ایک حقیقی امر ہے کہ مجلس پڑھنے والے کے اندر روحانی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ ہم عوام کے لئے رول ماڈل کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ وہ ہم سے نصیحت پاتے ہیں۔ اگر ہم باعمل

نہ ہوں تو ہماری زبان میں اثر نہیں رہتا۔ جب میں نے مجلس پڑھنے کا آغاز کیا تو میرے اندر بتدریج تبدیلی رونما ہوئی۔ یقیناً ابھی بھی کئی ایک اس امور میں کمی ہے اور ان میں بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ذاکرہ امام حسینؑ ہونے نے ہر قدم پر مجھے برے کاموں سے روکا۔ کئی ایک کام ایسے ہوتے ہیں جن سے میں ذاکرہ ہونے کی وجہ سے رک جاتی ہوں۔ مجھے خیال آجاتا ہے کہ اپنے رب کو شکل دکھانی ہے۔ امام حسینؑ کو شکل دکھانی ہے۔ کیا مجھے یہ زیب دیتا ہے کہ میں تنہائی میں کچھ اور ہوں اور لوگوں کے سامنے کچھ اور؟ یقیناً یہ مجالس امام حسینؑ ہی ہیں جنہوں نے میری طبیعت میں تبدیلی رونما کی ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ، مجالس امام حسینؑ اپنے ساتھ بے شمار فوائد لے کر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں نے ایسے بہت سے گھرانے دیکھے ہیں، جو باقاعدگی کے ساتھ مجالس برپا کیا کرتے تھے لیکن عملی طور پر مذہبی نہیں تھے۔ یعنی کہ وہ نماز، روزے یا حجاب کی پابندی نہ کرتے تھے۔ غیر شرعی موسیقی سنتے تھے۔ لیکن انہوں نے عزاداری کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا تو عزاداری امام حسینؑ نے ان کے لئے قلعے کا کام کیا اور اس قلعے کی مضبوط دیواروں کے اندر فروع دین بھی پنپ گئے۔ اگرچہ آغاز میں وہ فروع دین کو لے کر نہیں چلے تھے لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں عزاداری کا اصلی مقصد سمجھ آ گیا اور ان کے اندر روحانی تبدیلی واقع ہوگئی۔ میرے سامنے ایسی بہت سی مثالیں ہیں جہاں عزاداری امام حسینؑ کے صدقے میں خاندان کے خاندان سدھر گئے اور جب ایک مرتبہ آپ ان پر نگاہ ڈالتے ہیں تو آپ کو حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں؟ جو باقاعدہ کھلم کھلا معصیت کا شکار تھے اور اب اس قدر نماز کی پابندی کرنے والے اور مراجع کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ہو گئے ہیں۔ میرے خیال میں اس انقلابی تبدیلی میں، مجالس، شب بیداری، ماتم حسینؑ اور جلوس کا بہت بڑا کردار ہے۔

م15 ایک عربی شریک تحقیق تھیں۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح سے کیا کہ مجالس میرے جسم، روح اور ذہن کو تازہ کرتی ہیں۔ مجھے مجالس سے روحانیت حاصل ہوتی ہے۔ کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری روح میدان کربلا میں پہنچ گئی ہے اور میں کربلا کا واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ دیکھ رہی ہوں۔ جتنا جتنا مجھے اہل بیت پاک کا علم حاصل ہوتا چلا

جاتا ہے اتنا ہی میرا تقوی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ میری روح سے تمام زہریلا مواد نکل جاتا ہے اور میری روح ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔ میں غیبت سے بچتی ہوں اور میرا جسم برے کاموں سے رک جاتا ہے۔ میری عبادت کا دورانیہ بڑھ جاتا ہے۔ میری آنکھیں امام کے غم میں گریہ کرتی ہیں۔ میرے لب اذکار اور تسبیح و تحلیل میں مصروف رہتے ہیں۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ میری زبان، ہاتھ یا جسم سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ اس کے علاوہ کربلا ہمیں ظالم کے سامنے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

م 16 نے کہا کہ مجالس اللہ تعالیٰ سے قرب بڑھاتی ہیں اور نظریہ توحید کو اور زیادہ مضبوط کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اللہ کو یاد کرتے ہیں تو آپ کے مرنے کے بعد بھی آپ کا نام اس دنیا میں باقی رہ جاتا ہے۔ مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے کی وجہ سے مجھے گھریلو اور پیشہ ورانہ زندگی کے لئے طاقت حاصل ہوتی ہے۔

م 17 مقررہ اور ذاکرہ امام حسینؑ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میری روح کو مجلس پڑھنے کے بعد اتنی تسلی ہوتی ہیاور میں خود کو اتنا ہلکا محسوس کرتی ہوں جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ہر وقت خیال رہتا ہے کہ جو کچھ مجلس میں پڑھنا ہے اس پر پہلے خود عمل کروں اور اس کے بعد دوسرے لوگوں تک پہنچاؤں۔ اگر طبیعت کی پاکیزگی کی بات کروں تو محرم، صفر اور سال کے دوسرے مہینوں میں اپنی طبیعت میں ایک خاص قسم کا فرق محسوس کرتی ہوں۔۔۔ اگر نماز کی بات کی جائے تو مجالس امام حسینؑ کی وجہ سے اول وقت پر نماز پڑھنے کا رجحان بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ہم مجلس روک کر اول وقت پر نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب ہم اپنے گھروں میں ہوتے ہیں تو خیال آتا کہ مجلس کے دوران تو ہم اول وقت پر نماز ادا کرتے ہیں تو اپنے گھروں میں ایسا کیوں نہ کریں۔۔۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں دوسروں کی بات تو نہیں کرتی صرف اپنی کیفیت بیان کر رہی ہوں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ بی بی نے مجلس پڑھنے کے لئے مجھے منتخب کیا ہے۔ میں اپنے آپ کو بالکل بھی اس قابل نہیں سمجھتی۔ میں ہاتھ جوڑ کر عرض کرتی ہوں کہ بی بی نے اس منبر کے صدقے میں میرے عیب چھپانے کا انتظام کیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں جو کچھ بھی پڑھتی ہوں اس کا ثواب میری والدہ کو جاتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر

میں مجلس برپا کرنے کی بات کروں تو یہ بھی میرے پاک پروردگار کا کرم ہے کہ اس نے مجھے یہ شرف بخشا ہے۔کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ میں نے مجلس برپا کرنے میں سستی اختیار کی تو مجلس کا سارا انتظام جیسے خودبخود ہی سرانجام پا گیا۔

م 18 پاکستانی نژاد امریکی شہری ہیں۔وہ نہ صرف مقررہ امام حسینؑ ہیں بلکہ اپنے گھر کثرت کے ساتھ مجالس بھی برپا کرتی ہیں۔انہوں نے کہا کہ مجالس امام حسینؑ برپا کرنے سے ہر سال روحانیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ہم نہیں جانتے کہ یہ کیسے ہوا۔بس حیرانی سی حیرانی ہے۔۔۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی مجالس کی کرامات کے دو واقعات بیان کئے۔ایک تو یہ کہ جب میرے خاوند فوت ہوئے تو ہم نے چالیس روز تک اپنے گھر پر مجالس برپا کیں۔ایک دن میری بیٹی نے کہا کہ ہم روزانہ مجالس برپا کرتے ہیں۔پتہ نہیں یہ مجالس قبول بھی ہو رہی ہیں یا ابو کو اس کا ثواب مل رہا ہے کہ نہیں؟ اسی رات جب وہ سوئی تو اس نے خواب میں وہ مقام دیکھا جہاں بیٹھ کر مومنات مرثیہ پڑھا کرتی تھیں۔وہاں سفید لباس میں کوئی ہستی کھڑی تھی اور سب عورتیں کہہ رہی تھیں کہ وہ دیکھو! امام زمانہ مجلس میں تشریف لائے ہیں۔گویا کہ انہوں نے بتا دیا کہ ہم تمہارے آس پاس موجود ہوتے ہیں اور تمہاری سب کوشش دیکھ رہے ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے بتایا کہ ان کے ہاں ایک مومنہ پرسوز آواز میں نوحے پڑھا کرتی تھیں۔ایک روز انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ہمارے گھر کے باہر ایک کنواں ہے اور لوگ اس سے پانی پینے کے لئے آ رہے ہیں۔اتنے میں ایک بس آ کر رکی اور اس میں سے مسافر نکلنے لگے۔ وہ پانی پیتے بھی جاتے تھے اور ساتھ لے کر جانے کے لئے محفوظ بھی کر رہے تھے۔وہ مومنہ خواب میں سوچتی ہیں کہ یہ زوار ہیں اور پیاس کی وجہ سے اس جگہ رکے ہیں۔اسی اثنا میں انہیں احساس ہوتا ہے کہ سفید لباس میں ملبوس کوئی ہستی ہمارے گھر میں موجود ہے۔اس خواب کے ایک ہفتے کے بعد ایک اور مومنہ نے فون کیا کہ انہیں اشارہ ملا ہے کہ مسجد جمکران میں موجود امام العصرؑ کے کنویں کی شبیہ بنائیں اور ہمارے گھر ہدیہ کریں۔اس کے ساتھ یہ اشارہ بھی ملا کہ تمام مومنین اس کنویں میں اپنی عرضیاں ڈالیں۔اللہ پاک کے حکم سے ان کی امیدیں برآئیں گی۔بعد میں وہ عرضیاں پانی میں ڈال دی جائیں گی۔

م19 نے پہلے سوال کے جواب میں کہا کہ عزاداری ہماری شہ رگ ہے۔ مولا کی عزاداری کرنے سے جو سکون حاصل ہوتا ہے اس کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ مجالس کی وجہ سے میری زندگی میں بہت تبدیلی آئی ہے۔ میں جب کربلا والوں کی آزمائش اوران کا صبر دیکھتی ہوں تو مجھے اپنے غم اور آزمائشیں بہت چھوٹی نظر آتی ہیں۔ مجھے صبر کی دولت ملتی ہے۔ مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے کی وجہ سے میں اپنے تمام غم بھول جاتی ہوں۔ مولا کا غم ایک عظیم غم ہے۔ اس کے علاوہ عزاداری ہمیں حق اور سچ کا راستہ دکھاتی ہے۔ مولا کے دربار سے یہی دعا مانگتی ہوں کہ ہمیں حق اور سچ کا فرق سمجھا دیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ امام حسینؑ نے نماز کے لئے اپنا پورا گھرانہ قربان کر دیا۔ میری دعا ہے کہ ہمیشہ نماز پر کاربند رہوں۔

م20 ایک نوجوان شریک تحقیق تھے۔ انہوں نے کہا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ آپ نے مجلس امام حسینؑ سے کیا سیکھا؟ ہم نے ان مجالس سے زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں معلومات حاصل کیں لیکن ہمیں اس علم کا اپنی زندگی میں عملی مظاہرہ بھی کرنا چاہیے۔ میں خصوصی طور پر تحمل کا ذکر کروں گا۔ کیونکہ آج ہمیں سب سے زیادہ تحمل کی ضرورت ہے۔ اسی کا درس ہمیں کربلا سے بھی ملتا ہے۔ ہمیں اپنے کردار اور اخلاق سے واضح کرنا چاہیے کہ ہم غلامان حسینؑ ہیں۔

م21 ایک 19 سالہ نوجوان شریکہ تحقیق تھیں۔ انہوں نے کہا کہ مجالس امام حسینؑ کی وجہ سے ہمیں بچپن سے ہی زندگی کا ایک مقصد مل جاتا ہے۔ کہ آپ نے زندگی میں کیا کرنا ہے۔ ہم نے اچھائی، بھلائی اور سکون کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنی ہے اور انتظار کا فلسفہ جو آپ کو دوسرے مسالک میں نہیں ملتا اور اگر ملتا بھی ہے تو تحریف شدہ۔ لہٰذا انتظار امام ہی ہمارا اثاثہ حیات ہے۔

م22 نے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا کہ مجالس امام حسینؑ کا بہت بڑا تحفہ گریہ ہے۔ گریہ سے ہماری اندرونی صفائی ہوتی ہے اور روحانی بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ گریہ آپ کے نفس کو ایک معصوم بچے کی طرح صاف ستھرا کر دیتا ہے۔ گریہ ایک عبادت ہے۔ جس عبادت کے دوران آپ گریہ کرتے ہیں وہ عبادت قبول ہوتی ہے۔ دوسری جانب جب قلوب سخت ہو جاتے ہیں تو آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب آپ ان پاک و پاکیزہ ہستیوں کے ساتھ منسلک ہو

جاتے ہیں تو آپ کا دل گداز ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھل جاتی ہیں اور آپ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا مشاہدہ بھی کرنے لگتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ بعض لوگ عرفان کے اس مقام پر ہوتے ہیں جہاں ان ہستیوں کا صرف نام لینا ہی ان کے گریہ کے لئے کافی ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آنکھ میں آنسو آنے کے علاوہ اپنی زندگیوں کو ان پاک ہستیوں کے ساتھ منسلک کرنا اور ان کا اتباع کرنا بھی بہت ضروری ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ مجالس امام حسینؑ کا اصلی تحفہ روحانی بالیدگی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کو جسمانی فوائد حاصل نہیں ہوں گے۔ بنیادی طور پر مجالس امام حسینؑ میں جو بھی جائے گا، وہ کچھ نہ کچھ لے کر آئے گا۔ لیکن مادی فوائد تو مجالس امام حسینؑ کے (by products) ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ اس مقام پر انسان کو روحانی بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔

4.2۔ سوال نمبر 2 اور 3 کے جوابات

م 1 نے کہا کہ جہاں تک دوسرے اور تیسرے سوال کا تعلق ہے تو جسمانی اور دنیاوی برکتیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ مجالس امام حسینؑ سننے اور پڑھنے سے رزق میں کشادگی حاصل ہوتی ہے۔ میرے والد اور دادا ذاکر امام حسینؑ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجلس پڑھنے کا معاوضہ طے نہ کرو لیکن اگر کوئی تمہیں نذر نیاز دے تو اسے ردمت کرو۔ نذر نیاز میں برکت ہوتی ہے۔ انہوں نے اظہار خیال کیا کہ میں سمجھتی ہوں کہ اگر ذکر حسینؑ کو کوئی اپنی روزی کا ذریعہ بنائے تو اس سے اچھی بات کیا ہوگی؟ ایک مرتبہ میں مولانا علی رضا رضوی کی مجلس سن رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ذکر حسینؑ کی بدولت مجھے دنیا کی جتنی آسائشیں اور سہولتیں میسر آئی ہیں شاید اور کسی نوکری میں نہ آتیں۔ اس وقت انگلینڈ میں میرا مستقل قیام ہے اور میں تونگر ہوں۔ مولا کے ذکر سے میرا رزق بھی بندھا ہوا ہے اور روحانیت بھی درجہ بدرجہ بالیدگی اختیار کر رہی ہے۔ مجالس کے جسمانی فوائد بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اگر میں اپنی مثال لوں تو مجھے الرجی کا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے میں کھانسی کا شکار رہتی ہوں۔ لیکن جب میں منبر حسینؑ پر بیٹھ جاتی ہوں تو گلے کی الرجی کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا۔ میں حدیث کے علاوہ مرثیہ نگاری بھی کرتی ہوں۔ اگر کبھی مرثیہ کے

لئے معذرت چاہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ آپ آغاز تو کریں مولا خود مدد کریں گے۔ اور حقیقت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں بڑے بڑے علما، ذاکرین اور مرثیہ خوانوں کے بارے میں سوچتی ہوں کہ وہ طویل گھنٹوں کے لئے، بلکہ دن رات مرثیہ خوانی کرتے ہیں تو ان کے پاس اتنی طاقت کہاں سے آتی ہے؟ اس کے علاوہ ان کی آواز میں ذرہ بھر بھی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا۔ اگر سوچا جائے تو یہ ایک بہت بڑا فائدہ ہے۔

انہوں نے اپنی بات کو ایک اور مثال سے بھی واضح کیا کہ میرے بچپن کے دنوں میں کراچی کی ایک مشہور ذاکرہ تھیں۔ انہیں گلے کا کینسر ہوا۔ جب انسان کو گلے کی ایسی شدید بیماری ہو جاتی ہے تو ڈاکٹر خاموش رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن اس بیماری کی شناخت کے بعد وہ بیس سال یا اس سے زیادہ زندہ رہیں۔ وہ آخر دم تک مجالس پڑھتی رہیں۔ ان کے گلے کے لوچ، گونج دار آواز اور دبنگ میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ ذکرِ حسینؑ کا بہت بڑا معجزہ تھا۔۔۔ البتہ دنیوی فوائد کے لحاظ سے کبھی کبھی ہم خودغرض ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اپنے چھوٹے بھائی کا قصہ بیان کرتی ہوں۔ وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہے۔ جس دن اس کا نکاح ہونے والا تھا تو تقریب سے صرف دو گھنٹے اسے بہت زیادہ تھکن ہو رہی تھی۔ میں نے اسے دوا دی تو وہ اسے ری ایکٹ کرگئی۔ اس کا بی پی زیرو پر چلا گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ہم اسے لے کر ایمرجنسی بھاگے۔ اس وقت میرے اندر سے ایک خودغرض وجود باہر آیا۔ میں نے با آواز بلند فریاد کی کہ مولا میں نے آپ کے جوان بیر کی بہت مجالس پڑھی ہیں۔ ان مجالس کے صدقے میں مجھے میرے جوان بھائی کی زندگی لوٹا دیجیے۔ گویا کہ میں نے مولا کے ساتھ ایک سودا بازی والی بات کی لیکن میری فریاد کا جواب آیا اور کچھ ہی دیر کے بعد ڈاکٹر نے اطلاع دی کہ آپ کے بھائی کی زندگی خطرے سے باہر ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میری فریاد سن لی گئی تھی اور میرا بھائی زندگی کی جانب لوٹ آیا۔

م 6 نے کہا کہ اگر مادی فوائد کی بات کی جائے تو امام کی نذر و نیاز کے لاتعداد فوائد ہیں۔ مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے کی وجہ سے ہم روزمرہ کے جھمیلوں سے آزادی حاصل کرتے ہیں۔ ہماری تنہائی کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور ہم اپنے روزمرہ کے کاموں کے لئے

دوبارہ سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے عزیزوں اور دوسرے جاننے والوں سے ملاقات ہوتی ہے اوران کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے جنہیں ملنے کے لئے عام طور پر ہمارے پاس وقت نہیں ہوتا۔

م14 نے اپنے خیالات کا کچھ اس طرح اظہار کیا کہ اس نورانی محفل کی وجہ سے میرا گھر معطر اور بابرکت ہوجاتا ہے۔ ہم یہ سوچ کر ہی بلند روحانی پرواز محسوس کرتے ہیں کہ بی بی کے قدم ہمارے گھر آ گئے ہیں۔ ہمیں اپنے اوپر فخر محسوس ہوتا ہے۔ وہی بات ہے کہ کہاں ہم اور بی بی کے قدم کہاں؟ یہ ہستیاں کسی کا ادھار تو رکھتی نہیں۔ اگر ہم مجلس برپا کرتے ہیں اور نذر ونیاز کا اہتمام کرتے ہیں تو وہ اس کے بدلے میں ہمیں ستر گنا زیادہ عطا کرتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ مجلس برپا کرنے سے یقیناً روحانی، جسمانی اور دنیاوی بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ مجلس کے انتظام کے لئے ہم چاہے کتنا ہی کام کیوں نہ کر لیں، گھر میں نیاز تیار کریں، لیکن مجلس ختم ہونے کے بعد ہم خود کو تروتازہ محسوس کرتے ہیں۔ جسم ایک نئی توانائی سے بھر جاتا ہے۔ اگر میں اپنی مثال لوں تو مجلس پڑھنے کے لئے میں صبح سویرے سے تیاری شروع کر دیتی ہوں۔ اس کے درمیان میں کوئی وقفہ نہیں لیتی۔ اس کے باوجود بھی میں کسی قسم کی تھکاوٹ محسوس نہیں کرتی۔

م16 نے کہا کہ ہم مادی فوائد کو مجالس امام حسینؑ کے ساتھ نہیں جوڑ سکتے۔ مجالس تو ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے اور کسی بھی حال میں ظلم کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہیے لیکن اگر ہم مجالس امام حسینؑ کا دنیاوی فوائد کے ساتھ رابطہ جوڑنا چاہیں تو میں یہ کہوں گی مجلس پڑھنے اور برپا کرنے سے میرے معاشرتی روابط میں اضافہ ہوا۔ امام حسینؑ کے صدقے میں میں اپنے علاقے کی ہر مجلس کا حصہ ہوتی ہوں اور لوگ مجھے مجلس پڑھنے کے لئے مدعو کرتے ہیں۔

م17 نے کہا کہ مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے کے بیشمار جسمانی فوائد ہیں۔ میں نے آج تک مجالس امام حسینؑ میں جب بھی اپنی صحت کے لئے دعا مانگی وہ قبول ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی اگر دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو گویا کہ ایک غیبی ہاتھ اس خواہش کو پورا کر دیتا

ہے۔مجلس پڑھنے، سننے اور برپا کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے میرے پورے گھرانے کو برائیوں سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔امریکہ کے ماحول میں رہتے ہوئے میری اولاد ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہے۔

م 18 نے کہا کہ مجالس امام حسینؑ برپا کرنے کے بیشمار مالی فوائد ہیں۔ان مجالس کی وجہ سے ہمارے گھر میں ہمیشہ برکت رہی۔ جب ہم سعودیہ میں رہتے تھے تو ایک مرتبہ میرے خاوند کی نوکری ختم ہوگئی۔ مجھے بہت پریشانی تھی کہ اس سال تبرک کا انتظام کس طرح ہوگا۔اب خدا کا کرنا دیکھئے کہ اس سال تبرک کا انتظام ہمیشہ سے بہتر رہا۔

4.3۔سوال نمبر 4 کے جوابات

م 1 نے کہا کہ آپ کا جو آخری سوال ہے یعنی کہ اگر آج کربلا برپا ہوجائے۔۔۔تو میں کہوں گی کہ ہم دعویٰ تو بہت کرتے ہیں کہ اے کاش ہم بھی ہوتے کربلا میں۔۔۔لیکن اگر کربلا برپا ہو جائے تو کم از کم میں نہیں جانتی کہ میرا ردعمل کیا ہوگا۔اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہ کچھ اشارہ دے سکتی ہوں۔تمام عمر مجالس امام حسینؑ پڑھنے اور روحانی فوائد حاصل کرنے کے بعد میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ شاید۔۔۔شاید۔۔۔آگے بڑھ کر امام کے ناصرین میں شامل ہوجاؤں لیکن میں نہیں کہہ سکتی کہ اپنی اولاد کو امام کی نصرت کے لئے اپنے ہاتھوں سے سجا سنوار کر روانہ کرسکوں گی۔ میں آپ کو ایک چھوٹی سی مثال پیش کرتی ہوں کہ آج بھی میں نے اپنے بیٹے کو فون کر کے کئی مرتبہ ہدایت کی کہ Covid کے بہت زیادہ کیسز سامنے آرہے ہیں چہلم کے جلوس میں مت جانا۔تو آپ سوچیں کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں؟ اگر مجھے معلوم ہو کہ میں جس معرکے میں جارہی ہوں وہاں موت یقینی ہے تو میں خود وہاں جاؤں یا اپنی اولاد کو بھیجوں میں نہیں سمجھتی کہ میں ایسا کروں گی۔ ہمارا عقیدہ اتنا پختہ نہیں ہے۔ہم صرف زبانی کلامی باتیں کرتے ہیں۔ ہاں البتہ اگر مولا ہدایت دے دیں یا حر بنا دیں تو شاید یہ معاملہ بدل جائے۔اس بیان پر لوگ چاہے مجھے لعن طعن کریں لیکن میں نے دل پر ہاتھ رکھ کر، اپنے دل کی بات بیان کی ہے۔

م 10 جو کہ غیر شیعہ سے شیعہ ہونے والے صاحب تھے انہوں نے اپنے جذبات کا کچھ

اس طرح اظہار کیا کہ آپ کا آخری سوال کربلا کے دوبارہ واقع ہونے کے بارے میں ہے تو اگر کربلا کل واقع ہو رہی ہے تو نہ بچوں کی فکر ہے نہ دنیا کی۔ شہادت تو مومن کی مطلوب و مقصود ہوتی ہے۔ امام حسینؑ کا قول ہے کہ زندگی کا اختتام اگر موت ہے تو اس کے لئے شہادت سے بہتر کوئی شے نہیں۔ ہم ہر وقت اور ہر لمحہ کربلا کی خاطر شہید ہونے کے لئے تیار ہیں۔

م13 ایک نوجوان شریکہ تحقیق اور ایک دو سالہ بچی کی والدہ ہیں۔ انہوں نے کچھ اس طرح شوق شہادت بیان کیا کہ کربلا میں یقیناً شہادت ہے۔ ہم اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں اور ایک سچا مومن وہی ہوتا ہے جو حق کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ شہادت حق کا راستہ ہے۔ جو خود کو سچا مومن مانتا ہے وہ کل کو کربلا میں ضرور شریک ہوگا اور شہادت کا جام پیئے گا۔ ہماری زندگی ایک امانت ہے جسے ایک نہ ایک دن ہم نے اپنے رب کو لوٹانا ہے۔ تو کیوں نہ ہم اس امانت کو اس طرح واپس کریں کہ ہمارا رب ہم سے راضی ہو جائے۔ ہم آل رسولؐ کے لئے کیوں نہ اپنی جان قربان کریں؟ انہوں نے مزید کہا کہ البتہ یہ راستہ چننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس راستے پر کانٹے ہیں لیکن جو ایک مرتبہ اس راستے پر چل نکلے وہ اس سے ہٹ نہیں سکتا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے اپنے بندوں کو آزمائش کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ اپنے عزیز ترین بندے کا امتحان لیتا ہے تو پھر ہم اس امتحان میں پورے کیوں نہ اتریں۔ اگر کل کو کربلا واقع ہوتی ہے اور ہم زندہ ہیں تو ضرور اس کربلا میں حصہ لیں گے اور امامؑ کے لشکر کا حصہ بنیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کے راستے پر قائم رکھے اور جو حق کے راستے پر نہیں ہیں وہ بھی اس راستے پر لوٹ آئیں۔

م14 نے کہا کہ آپ نے آخری سوال کربلا کے بارے میں پوچھا ہے۔ چونکہ آپ نے سوال کیا ہے اس وجہ سے جواب دے رہی ہوں کہ میری خواہشوں میں سے ایک شہادت کی موت ہے۔ میں اکثر و بیشتر تصورات میں دیکھتی ہوں کہ میں ایک گاڑی میں سفر کر رہی ہوں۔ ساتھ والی گاڑی میں بیٹھا ایک شخص صرف حجاب کی وجہ سے مجھے گولی مار دیتا ہے اور میری جان نکل رہی ہے اور میں کلمہ طیبہ پڑھ رہی ہوں۔ انہوں نے مزید کہا کہ مجھے شہادت کا بے انتہا شوق ہے۔ لیکن شوق ہونا اور اس پر عمل پیرا ہونا دو مختلف امور ہیں۔ وقت آنے پر انسان کے اصل ایمان کا پتا چلے

گا۔ میں کوئی گارنیہ نہیں دے سکتی کہ وقت آنے پر میرا رخ دنیا کی جانب ہوگا یا حق کی راہ پر لیکن فی الحال اپنے بارے میں 99.9 فیصد گواہی دے سکتی ہوں کہ میں ضرور جاؤں گی۔ البتہ مجھے یقین ہو جائے کہ وہ میرے امام ہیں اور ہمیں نصرت کے لئے بلا رہے ہیں۔ میرے ذہن میں کوئی دوسرا خیال نہیں آئے گا۔ بلکہ میں سو (100) فیصد یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ میں اپنے مولا پر اپنی جان نثار کردوں گی۔

م15 اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے کہا کہ آپ نے جو یہ سوال کیا ہے کہ اگر کربلا برپا ہو جائے۔۔۔تو ہم جیسے گناہگار لوگ تو جذبات میں آکر کہہ دیں گے کہ ہم ضرور جائیں گے۔ باتوں کی حد تک تو صحیح لیکن ہم جیسے لوگ جن کا ایمان اتنا کمزور ہے ہمارے لئے جان دینا بہت مشکل کام ہے۔ البتہ مجالس امام حسینؑ ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہیں۔ اگر میرے اوپر میرے خاندان کا دباؤ نہ ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک رات میں تو کیا ایک لمحے میں فیصلہ کرلوں گی۔ اگر شہادت یقینی ہے تو کیا ہوا؟ ہم کس کے ساتھ شہید ہو رہے ہیں؟ یہ سوچ کر انسان ایک لمحے میں ہی فیصلہ کر لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں باتوں کی حد تک تو کہہ رہی ہوں کہ میں جا سکتی ہوں اور اگر واقعی ایسا واقعہ ہو جائے تو میں ڈر جاؤں۔ لیکن۔۔۔اگر آپ اور لوگوں سے بھی یہ سوال کریں تو 99 فیصد جواب دیں گے کہ کیوں نہیں؟ اگر آپ والدین سے پوچھیں تو وہ اپنی اولاد کے لئے بھی یہی جواب دیں گے کہ کیوں نہیں؟

م16 نے کہا کہ آخری سوال کا جواب دینا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ وقت آنے پر میں کیا کروں گی؟ لیکن امید کرتی ہوں میں امام حسینؑ کے ناصرین میں سے ہوں۔ ان کی نصرت کا جھنڈا اٹھاؤں اور شہیدوں کے شہنشاہ کے استغاثہ پر لبیک کہوں۔

م17 نے کہا کہ آپ کے چوتھے سوال کے جواب میں میں کہوں گی کہ مجھے یقین ہے کہ امام عج کے ظہور کے ساتھ کربلا کا کچھ نہ کچھ حصہ بھی لوٹ کر آئے گا۔ اس وقت ہمارا کام بغیر کوئی سوال کیئے صرف اور صرف ان کے احکامات پر عمل کرنا ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس وقت میرے اندر اتنی معرفت پیدا ہو جائے گی کہ میں ان کے کارواں میں حصہ لوں اور دوسروں کو بھی آمادہ کر سکوں۔ یہ ایک اعزاز ہوگا اور ایک خواب جو شاید کہ پورا ہو جائے۔ کہ میں

امام کی خدمت میں حاضر رہوں اور شہادت کا درجہ حاصل کرسکوں۔

م22 نے چوتھے سوال کے جواب میں کہا کہ 61ھ میں اور آج بھی امام کو ماننے والوں میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ وہ بھی جنہیں اپنی جان، مال اور خاندان عزیز ہیں۔ اور وہ بھی جو امام عالی مقام کے ایک اشارے پر جان فدا کر سکتے ہیں۔ آج بھی حسینیت اور یزیدیت دونوں اپنا زور دکھا رہی ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یزیدی بھی نماز اور قرآن پڑھنے والے مسلمان تھے جو امام عالی مقام کے بالمقابل جنگ کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔ ہمارے اندر بھی بیشمار نقائص ہیں۔ ہمیں اپنے کالر میں جھانک کر اپنی برائیوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور عبادت کے ساتھ عقل وشعور کی بھی ضرورت ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ حسینیت اور یزیدیت کے مشن پر ہی جنت اور جہنم کا فیصلہ ہوگا۔ روز قیامت ہر جماعت کو اس کے امام کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنا تجزیہ کریں کہ کس حد تک اپنے نفس کو مضبوط رکھ سکتے ہیں اور یزیدیت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے نفس پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ آج ہم کس کے ساتھ ہیں؟ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آیئے ہم سب اپنا تجزیہ کریں کہ دوسروں کے ساتھ ہمارا رویہ کیسا ہے؟ ہم ان کی تسکین کا باعث بنتے ہیں یا تکلیف کا؟ ہمیں اپنے اعمال وافعال اپنے منہ سے بولتے نظر آئیں گے۔ ہمیں ہر قدم پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نے جو کیا کیوں کیا؟ آج ہم نے کون کون سے کام کئے جو اصولاً ہمیں نہیں کرنے چاہیے تھے؟ ہم روز گناہ کرتے ہیں، روز اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے ہیں۔ آخر یہ معافی کب تک قبول ہوتی رہے گی؟ آخر میں انہوں نے کہا کہ لطف تو تب ہے کہ جب موت آئے تو لبوں پر علیؑ علیؑ ہو۔ لیکن موت کے وقت منہ سے اسی وقت علیؑ علیؑ نکلے گا جب تمام عمر حضرت علیؑ کی راہ پر چلے ہوں۔

پانچواں باب

شرکاء کے انٹرویوز
اور
ان کا تجزیہ

شرکاء کے جوابات کو مندرجہ ذیل موضوعات میں تقسیم کیا گیا۔

1.5 مجالس امام حسینؑ کے روحانی فوائد

شرکا کے جوابات کے مطابق اس موضوع کو ہم ذیلی موضوعات میں تقسیم کرتے ہیں:

i. دینی اور دنیاوی علوم میں اضافہ
ii. عملی طور پر دین کی جانب رغبت
iii. تسبیح وتہلیل اور دعا ومناجات
iv. مجلس امام حسینؑ کی کرامات
v. مکارم اخلاق

2.5۔ مجالس امام حسینؑ کے مادی فوائد

53.۔ مجالس کے چند گھمبیر گوشے

5.4۔ مقصد حیات، امامؑ کا اتباع اور شوق شہادت

مندرجہ ذیل حصے میں ہم ان مضامین کی تفصیل بیان کریں گے۔

5.1۔مجالس امام حسینؑ کے روحانی فوائد

1۔5۔1۔دینی اور دنیاوی علوم میں اضافہ

کربلا ہماری علمی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور تبلیغی درسگاہ ہے۔منبر امام حسینؑ سے توحید ورسالت، امامت، قرآن وسنت، فلسفہ حیات وموت، سیاست، حکومت، حالات حاضرہ اور سائنس وٹیکنالوجی پر سیر حاصل گفتگو کی جاتی ہے۔ان محافل کی سب سے بڑی کرامت تو یہ ہے کہ ہر عمر، جنس اور طبقے کا انسان صحن مجلس سے علوم کا ایک خزانہ لے کر اٹھتا ہے۔یہ دنیا کا واحد ادارہ ہے جہاں افسر اور مزدور طبقہ، عالم اور کم پڑھے لکھے افراد، امراء اور غربا، حتیٰ کہ جھونپڑیوں میں رہنے والا خانہ بدوش طبقہ[1] بھی ایک ہی وقت میں، ایک ہی کمرہ جماعت میں بیٹھ کر ایک ہی سبق حاصل کرتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ کس مقام پر کون کس سے سبقت لے جاتا ہے۔

موجودہ تحقیق کے شرکاء نے بیان دیا کہ مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے سے دینی اور دنیاوی علوم میں اضافہ ہوتا ہے۔خصوصاً اہل بیت کے حالات سننے سے نظریہ توحید اور تقویٰ میں اضافہ ہوتا ہے۔بعض شرکاء کا خیال تھا کہ مجلس پڑھنے اور اپنے گھر میں برپا کرنے کی وجہ سے پورا گھرانہ برائیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔البتہ ہر مجلس پڑھنے اور سننے والے کی اپنی ذہنی اور روحانی سطح ہوتی ہے۔مجلس پڑھنے والے کی نیت اور روحانی پاکیزگی قارئین کے ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے اور سننے والے اپنی توفیق کے مطابق علم ومعرفت اور روحانی اور دنیاوی فائدے حاصل کرتے ہیں۔اس تحقیق میں شریک ایک عالم دین نے بیان دیا کہ مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے کی وجہ سے انہیں عالم دین بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔وہ ایک

[1] شاید عوام اس بارے میں زیادہ معلومات نہ رکھتے ہوں لیکن ہماری نژادی تحقیق بتاتی ہے کہ زیادہ تر خانہ بدوش اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے صوم وصلوٰۃ کا خیال نہیں رکھتے لیکن وہ جانتے ہیں کہ اہل بیت کے در پر دعا قبول ہوتی ہے اور دنیا کے غم ڈھلتے ہیں۔اس وجہ سے وہ مجالس میں حاضری دیتے ہیں۔اس کے علاوہ حضرت عباس علمدار سے وہ ایک خاص قسم کا انس رکھتے ہیں۔

پاکستانی نژاد امریکی شہری ہیں۔ وہ بچپن سے مجالس میں شرکت کیا کرتے تھے۔ امریکہ کی ایک مشہور یونیورسٹی سے ایم۔بی۔اے کرنے کے بعد ان کا رجحان دینی تعلیم کی جانب ہو گیا اور وہ آرام و آسائش کی زندگی کو خیر باد کہہ کر حوزہ علمیہ قم میں تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ اسی طرح ایک اور عالمہ نے بیان دیا کہ ان کا علم کلام، علم بیان اور تفسیر قرآن پاک سب کچھ مجالس امام حسینؑ کی دین ہے۔ کچھ شرکاء نے اظہار خیال کیا کہ انہوں نے دین و دنیا کا جو بھی علم سیکھا مجالس امام حسینؑ کی وجہ سے سیکھا۔ اگر زندگی کی مصروفیات کی وجہ سے وہ باقاعدہ طور پر تفسیر قرآن کا علم حاصل نہ کر سکے، تو انہوں نے ہر مجلس میں تفسیر قرآن سے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ صالح عادات اور اخلاق بھی مجالس امام حسینؑ کی دین ہے۔ مثال کے طور پر رزق کے فلسفے اور خدا پر یقین کی وجہ سے رشتہ داروں کی مدد اور خاطر تواضع کرنا سیکھی۔ فلسفہ رزق سمجھنے کی وجہ سے ان کے اندر شعور پیدا ہوا کہ جتنا ماں باپ، رشتہ داروں اور دوسرے اعزاء و اقارب پر خرچ کریں گیا اللہ تعالیٰ اس سے کئی گنا زیادہ عطا کرے گا۔

موجودہ تحقیق کے اولین خاکے میں بچوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ کچھ بچوں کو ان کی خواہش پر اس تحقیق میں شامل کیا گیا۔ ان میں چھ (6)، بارہ (12) اور تیرہ (13) سال کے بچے شامل تھے۔ ان بچوں اور انیس یا بیس سال کے نوجوانوں کا ذخیرہ الفاظ، نظریات اور عقائد کی پختگی حیران کن تھی۔ عموماً اس عمر کے بچے اور نوجوان لاپرواہ اور کھلنڈرے ہوتے ہیں۔ آج کل تقریباً تمام بچے پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکولوں میں جاتے ہیں اور انگلش میڈیم میں پڑھنے والے بچے سادہ اردو بھی مشکل سے بولتے ہیں۔ لیکن مجالس امام حسینؑ سننے والے بچوں کا ذخیرہ الفاظ وسیع اور سوچ میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اعلیٰ درجے کا فلسفہ سمجھنے کے قابل بھی ہو جاتے ہیں۔ ان بچوں کی باتیں سن کر احساس ہوتا ہے کہ ہم بچپن سے ہی مجالس امام حسینؑ سے بہت کچھ لے کر اٹھتے ہیں۔ مجالس ہماری بنیاد بناتی ہیں اور ہم تمام عمر اسی بنیاد کے زور پر کھڑے رہتے ہیں۔ بنیاد جتنی مضبوط اور گہری ہوگی عمارت اتنی ہی دیر پا ثابت ہوگی۔ جس نسل کی بنیاد محمد و آل محمدؐ کی محبت سے گوندھی گئی ہو اس کی مستقل مزاجی اور ارادے کی مضبوطی کے کیا کہنے۔ زندگی کی مصروفیت میں کبھی کبھار نوجوان نسل ذکر حسینؑ سے

دور بھی ہو جاتی ہے لیکن ہر شے بالآخر اپنی اصل کی جانب لوٹتی ہے اور پشت در پشت آل رسولؐ سے لو لگانے والوں کی نسلیں یقیناً ایک دن اپنی اصل کی جانب لوٹ آتی ہیں۔

1.5.2 عملی طور پر دین کی جانب رغبت

ایک شریک تحقیق نے بیان دیا کہ ان کی نظر میں کئی ایک ایسے گھرانے ہیں جو مجالس امام حسینؑ کے اعجاز سے معصیت سے روحانیت کی جانب لوٹ آئے۔ یہاں پر ہم روحانیت اور دنیاوی عوامل کے باہمی اثر و نفوذ کی ایک مثال پیش کرتے ہیں یعنی کہ ایسے گھرانے جنہوں نے مجالس امام حسینؑ کی برکت سے عسرت سے تونگری کا سفر طے کیا۔ دولت کی فراوانی کی وجہ سے ان کی دوسری نسل دنیا پرست ہوگئی لیکن ایک مرتبہ پھر مجالس امام حسینؑ کی وجہ سے تیسری نسل مکمل طور پر دین پر عمل پیرا ہوئی۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ آج سے تقریباً نوے یا اس سے کچھ زائد عرصہ پہلے ایک قریبی گاؤں میں ایک غریب سید رہتے تھے۔ وہ سارا سال پیسے اکٹھے کرتے اور ایک سالانہ مجلس کروایا کرتے تھے۔ ان کے گاؤں والے ذکر اہل بیت سے پرخاش رکھتے تھے۔ ہمارے علاقے سے عزادار جاتے اور وہاں مجلس و ماتم کی محفل برپا ہوتی۔ ان کے گاؤں والوں نے پہلے پہل تو مجلس سے روکنے کی کوشش کی۔ جب وہ نہ مانے تو ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا۔ ان کے بہت سے بچے تھے۔ بائیکاٹ کی وجہ سے نوبت فاقوں تک آن پہنچی۔ آخر کار انہوں نے اپنا گاؤں چھوڑا اور ہمارے علاقے میں منتقل ہو گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے روزی میں برکت ڈالی اور ان کی اولاد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی۔ اب خدا کا کرنا دیکھئے کہ ان کے بیٹے امریکہ اور لندن منتقل ہو گئے اور ترقی کرتے ہوئے سینٹ تک پہنچ گئے۔ جو بیٹے پاکستان میں رہ گئے وہ بھی صوبائی اسمبلی کے ممبر بنے۔ لیکن جیسا کہ عام رواج ہے کہ تونگری کے ساتھ دین سے دوری کا رجحان پیدا ہوجاتا ہے اسی طرح ان کے گھر عزاداری تو جاری رہی لیکن مجالس کی روح سے وہ بے بہرہ ہو گئے۔ تیسری نسل گو کہ امراء میں تھی لیکن ان میں دوبارہ تبدیلی رونما ہوئی اور ان کا رخ دین کی جانب ہو گیا۔

اس کے علاوہ ہم نے امریکہ میں مقیم کئی ایک خاندان دیکھے جنہوں نے مجالس امام حسینؑ کی وجہ سے اپنی ظاہری ہیئت تبدیل کر لی۔ ایک مومنہ نے بتایا کہ وہ ایک ایسی اسٹیٹ میں رہتی

تھیں جہاں امام بارگاہ نہیں تھی۔ وہ اوران کا خاندان نماز تو پڑھتے لیکن بہت سختی سے اس کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حجاب کا زیادہ خیال نہیں رکھتے تھے کیونکہ ان کے آس پاس کوئی بھی حجاب نہیں لیتا تھا۔ اتفاقاً ان کے خاوند کی نوکری ختم ہوگئی۔ انہیں بے حد پریشانی ہوئی۔ لیکن اتفاق دیکھئے کہ وہ لوگ ایسی سٹیٹ میں آ گئے جہاں امام بارگاہ بھی تھی اور کئی ایک مومنین بھی آباد تھے۔ اب انہیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ فروع دین کی پابندی اور حجاب کس قدر ضروری ہے۔ ان کا پورا خاندان بدل گیا۔

3۔1.5 تسبیح وتہلیل اور دعا ومناجات

تسبیحات اور ائمہ کرام سے منسوب دعائیں پڑھنے کے روحانی اعجاز روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ موجودہ تحقیق کے دوران بعض شرکاء نے بیان دیا کہ مجالس امام حسینؑ میں باقاعدگی سے شرکت کرنے کی وجہ سے انہیں تسبیح وتہلیل اور دعا ومناجات کی عادت پڑی۔ اس کے علاوہ علماء باقاعدگی کے ساتھ تسبیحات اور ادعیاء کی کرامات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ رسول اللہؐ اور ائمہ اطہارؑ سے منسوب دعاؤں میں مطالب ومعنی کے سمندر پنہاں ہیں۔ امام حسینؑ سے منسوب دعائے عرفہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بہترین نغموں میں سے ایک نغمہ ہے۔ خوف کے زمانے میں دل جری کرنے ،قوہ مضبوط اور ارادہ پکا کرنے کے لئے امام زمانہ سے منسوب دعائے عہد بہترین نسخہ ہے۔ اسی طرح حاجات کی قبولیت کے لئے زیارت عاشورہ ایک بے بہا خزانہ ہے۔ ایک شریک تحقیق نے بتایا کہ ان کی بیٹی کا داخلہ یونیورسٹی میں ہوگیا تھا۔ لیکن ان کے پاس فیس ادا کرنے کے پیسے نہ تھے۔ ان کی اہلیہ روزانہ زیارت عاشورہ پڑھ کر اس کے لئے دعا مانگتی تھیں۔ دسویں دن اچانک بیرون ملک رہنے والی ایک عزیزہ نے فون کر کے پوچھا کہ انہیں کسی مقصد کے لئے پیسوں کی ضرورت تو نہیں؟ حالات معلوم ہونے پر انہوں نے مطلوبہ رقم ان صاحب کو ارسال کر دی۔ کچھ ہی روز گزرے تھے کہ ایک اور عزیزہ کا فون آ گیا۔ انہوں نے بھی بالکل وہی سوال کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی ضرورت پہلے ہی پوری ہو چکی تھی۔ وہ حیران تھے کہ یکے بعد دیگرے دو خواتین کو ان کی

مدد کرنے کا اشارہ ملا تھا۔ وہ سب کچھ زیارت عاشورہ کا اثر تھا۔ روحانی پاکیزگی اور بالیدگی حاصل کرنے کے لئے یا اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کرنے کے لئے صحیفہ سجادیہ سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ملے گا۔ ڈاکٹر ادریس سماوی (جن کا ذکر مذکورہ بالا حصے میں کیا گیا) کا تعلق ایک روشن فکر اور نامور اہل سنت خاندان سے ہے۔ انہوں نے اہل بیت کے مطالعہ کی بنیاد پر شیعیت اختیار کی۔ ان کے بیان کے مطابق انہیں صحیفہ سجادیہ اور زیارت جامعہ کبیر کے مطالعے سے ایسا ادراک ملا جس کی وجہ سے وہ شیعہ ہو گئے۔

م 1 بتاتی ہیں کہ انہوں نے حدیث کساء کی برکات اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ کالج سے گریجویشن ختم کرنے کے بعد ان کی تعلیم میں کچھ وقفہ آ گیا تھا۔ جبکہ وہ تعلیمی میدان میں بہت آگے تک جانا چاہتی تھیں۔ ان کا دل بے چین رہتا اور وہ نماز اور دعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات پوری ہونے کی التجا کرتی تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ایک روز انہوں نے تحفۃ العوام کھولی اور حدیث کساء خود بخود ہی ان کے سامنے آ گئی۔ انہوں نے حدیث کساء پڑھی تو کچھ ایسا لطف آیا کہ روزانہ حدیث کساء پڑھنی شروع کر دی۔ ہر مرتبہ دعا ختم کرنے کے بعد وہ دعا مانگتیں کہ ان کی زندگی کے راستے کھل جائیں۔ کچھ ہی عرصے کے بعد بالکل غیر محسوس طریقے پر ان کی راہیں کھلنا شروع ہو گئیں اور وہ نہ صرف تعلیمی بلکہ روحانی لحاظ سے بھی بتدریج ترقی کی منزلیں طے کرتی چلی گئیں۔

شہید مرتضی مطہریؒ (light within me ?P.158) میں لکھتے ہیں کہ نماز، دعا اور مناجات انسانی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں اور معاشرہ تشکیل دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں مناجات شعبانیہ عجب روحانی تاثیر کی حامل ہے۔ میں نے اس کے علاوہ کسی اور دعا کے بارے میں نہیں پڑھا جسے تمام ائمہ کرام پڑھتے ہوں۔ یہ دعا انسان کو اندھیرے سے باہر نکالتی ہے اور جب انسان اندھیرے سے نکل آتا ہے تو اپنا ہر کام خدا کے لئے انجام دیتا ہے۔ البتہ دعا و مناجات کے علاوہ فرض نمازوں کے بعد سنت اور نوافل، تسبیح فاطمہ زہراؑ، دعا، سجدہ شکر، تعقیبات اور زیارات پڑھنے کا بھی اپنا ہی ایک مقام ہے۔ ماضی قریب میں فرض نمازوں کے بعد تعقیبات اور زیارات پڑھنے کا رواج عام تھا۔ موجودہ دور کی افراتفری میں نماز کے بعد زیارات پڑھنے کا رواج کم ہو گیا

ہے لیکن مجالس کے بعد زیارات کا خصوصی انتظام کیا جاتا ہے۔ان زیارات کا مقصد مقدس ہستیوں پر سلام بھیجنا ہے۔سلام کا اصول ہے جواب سلام۔آپ سلام بھیجتے ہیں، جواب آتا ہے، سلام جاتا ہے، جواب آتا ہے۔کئی ایک مومنین نے روحانیت کی اعلیٰ منازل پر پہنچ کر اس جواب کو محسوس بھی کیا اور سنا بھی ہے۔اوپر بیان کیئے گئے تمام اعمال فرض نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ دراصل شیطان فروع دین اور خصوصاً فرض نمازوں سے حد درجہ بغض رکھتا ہے۔اور کیوں نہ ہو جس ملعون کی ہزاروں سال کی نمازیں حضرت انسان کی وجہ سے ضائع ہو گئی ہوں اور وہی انسان صحت ارکان کے ساتھ نماز پڑھتا ہو تو حاسد کا حسد تو دیدنی ہو گا ہی۔درحقیقت سنت نمازیں اور نوافل، دعاومناجات، تعقیبات اور زیارات اس فرض نماز کی محافظ ہیں جو شیطان کو انسان کے دل پر کاری ضرب لگانے سے باز رکھتی ہیں۔اسی وجہ سے ہم بزرگ یا کم پڑھی لکھی خواتین کو مشورہ دیا کرتے تھے کہ اگر ان کے لئے دعاومناجات کا پڑھنا ممکن نہ ہو تو ایک وقت مقرر کریں اور کمپیوٹر پر تلاوت قرآن پاک یا دعائیں سننے کا اہتمام کریں۔

4۔5۔1۔مجالس امام حسینؑ کی کرامات

اس تحقیق کے دوران کرامات مجالس امام حسینؑ کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا گیا تھا۔کیونکہ یہ بذات خود ایک مکمل موضوع ہے۔البتہ چند شرکاء نے حال میں واقع ہونے والی چند کرامات کا ذکر کیا۔یہ بات تو ہر مومن محسوس کرتا/کرتی ہے کہ خلوص نیت، عاجزی اور مکارم اخلاق کی پاسداری کرتی ہوئی مجالس میں کرامات ظاہر ہوتی ہیں۔کبھی کبھار ان مجالس میں خاک شفا کی تسبیح اپنا رنگ بدلتی ہیں۔ ہماری کیس اسٹڈی میں بیان کی گئی امام بارگاہ میں دو مرتبہ تسبیح کا رنگ بدلا۔اسی طرح امریکہ اور پاکستان میں حال میں ہی کچھ تسبیحوں کا رنگ بدلا۔حالیہ سالوں میں ایسی مجالس بھی دیکھی گئیں جن میں شرکت کرنے کی وجہ سے غیر شیعہ، شیعہ ہوئے۔ان میں سے کچھ افراد ایسے بھی تھے جو پہلے سے اہل بیت کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔لیکن مجالس میں شرکت کرنے کی وجہ سے ان کے دل اہل بیت کی محبت سے بھر گئے اور انہوں نے مجالس میں باقاعدگی سے شرکت کا آغاز کیا۔

5۔1.5.5 مکارم اخلاق

موجودہ تحقیق کے تمام شرکا نے کہا کہ مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے کی وجہ سے ان کے مکارم اخلاق میں بہتری آئی جس میں اولین درجہ سچ بولنا اور حق اور سچ کا ساتھ دینا تھا۔ شرکاء نے کہا کہ امام کا راستہ سچ کا راستہ ہے اور مجالس امام حسینؑ ہمیں اسی کا سبق دیتی ہیں۔ شرکا نے یہ بھی اظہار کیا کہ مجالس کی وجہ سے ان کی معاشرتی اخلاقیات میں بہتری آئی یعنی کہ دوسروں کے بارے میں نیک نیتی اور ایک مومن کا دوسرے مومنین کے لئے بے ضرر ثابت ہونا۔ انہوں نے اظہار کیا کہ مجالس امام حسینؑ سننے کی وجہ سے وہ غیبت، حسد اور بغض جیسی علتوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ خواتین اور بچیوں نے کہا کہ انہوں نے بی بی فاطمہؑ اور بی بی زینبؑ کی مثالوں سے اپنے کردار، گفتار، پاکیزگی، پردے اور گھر چلانے کے اصول سیکھے اور وقت کی پابندی سیکھی۔

مکارم اخلاق میں مصائب کا مقابلہ صبر سے کرنے کا بھی بہت بڑا مقام ہے۔ موجودہ تحقیق کے تقریباً تمام شرکاء نے بیان دیا کہ انہوں نے واقعات کربلا و شام سے اپنی مصیبتوں پر صبر کرنا سیکھا۔ زندگی میں چاہے کتنے ہی مشکل حالات کیوں نہ درپیش ہوں اچانک خیال آ جاتا ہے کہ ہماری تکالیف امام مظلوم کے مصائب سے زیادہ تو نہیں۔ یا ہماری آزمائش بی بی زینب وکلثوم کے امتحان سے بڑی تو نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی طبیعت سکون پا جاتی ہے اور اس سکون کی بدولت مشکلات سے نکلنے کی راہیں نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر شریک تحقیق نے امام حسینؑ کے مصائب پر گریہ اور اس کے جسمانی اور روحانی اثرات کا ذکر کیا۔ مجالس امام حسینؑ میں گریہ کرنے سے روح پاک و پاکیزہ اور دل گداز ہو جاتا ہے۔ گناہ دھلتے ہیں اور طبیعت مطمئن ہو جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جذباتی گریہ صرف اور صرف انسان کا خاصہ ہے۔ گریہ عظیم ترین روحانی مشق ہے جو محب کو محبوب کے ساتھ اور حاجب کو محجوب کے ساتھ ملاتا ہے۔ گریہ مادیت کے حجابات چاک کرتا ہے اور آفاقی دنیاؤں کی سیر کراتا ہے۔ پرخلوص گریہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمتوں میں سے ایک بلکہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ ترین عادات میں سے ایک عادت ہے۔ آج کے مادی دور میں جب اصل غائب اور نقل حاضر

ہے، جب خواہشوں کے ہنگام نے دل سخت کر دیئے ہیں، جب باپ بیٹے کے ساتھ اور بیٹا باپ کے ساتھ مخلص نہیں رہا، ایسے پر آشوب دور میں مجالس امام حسینؑ میں شرکت کا پہلا صلہ گریہ اور گداز دل ہے۔ گریہ انسانی جسم اور روح سے زہریلے مادے نکال کر انسان کو ایک نو زائیدہ بچے کی طرح صاف اور پاک کر دیتا ہے۔ گریہ انسان کو بندگی اور روحانیت کی اعلیٰ منازل تک پہنچاتا ہے۔ گریہ میں شفا ہے۔ جذباتی آنسو انسان کو غم، پریشانی، ذہنی تناؤ اور انتشار ذہن سے نجات دلاتے ہیں۔ موجودہ دور کی سائنسی تحقیق کے مطابق آنسو نہ صرف اندرونی صفائی کا کام کرتے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے نظر بھی تیز ہوتی ہے۔

سورہ الاسراء: 109 کے مطابق وَيَخِرُّونَ لِلۡأَذۡقَانِ يَبۡكُونَ وَيَزِيدُهُمۡ خُشُوعًا۔ ترجمہ: اور وہ ٹھوڑیوں پر روتے ہوئے گر پڑتے ہیں اور یہ چیز ان کی عاجزی کو بڑھاتی ہے۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ جنہیں علم دیا گیا ہے اگر وہ گریہ نہیں کرتے تو ان کا علم انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ دنیا میں پانچ شخص بہت زیادہ گریہ کرنے والے گزرے ہیں۔ حضرت آدمؑ و یعقوبؑ و یوسفؑ، حضرت فاطمہ زہراؑ اور امام زین العابدینؑ۔ حضرت آدم جنت سے جدائی پر اتنا روئے کہ ان کی گالوں سے دو نہریں جاری ہو گئیں (حیات القلوب)۔ امیر المومنین حضرت علیؑ دعا الصباح میں فرماتے ہیں کہ اور اپنی ہیبت سے ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کو جاری کر دے۔ امام زین العابدینؑ صحیفہ سجادیہ کی دوسری مناجات میں اللہ تعالیٰ سے اس طرح راز و نیاز فرماتے ہیں کہ اے معبود میں تجھ سے دل کی سختی کی شکایت کرتا ہوں اور مسلسل وسوسوں کی شکایت کرتا ہوں اور ان آنکھوں کی جو گریہ نہیں کرتی۔ استاد حسین انصاریان آیت اللہ ملا علی ہمدانی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں کئی سال ان کی خدمت میں حاضر رہا۔ ان کا گریہ بہار کی بارش کی طرح تھا۔

مشہور انگریز تاریخ دان ایڈورڈ گبن کے مطابق امام حسینؑ کا اندوہناک واقعہ بے حس انسان کو بھی گریہ کے لئے مجبور کرتا ہے۔ امام حسینؑ کے مصائب پر رونے سے دل پاک اور روح صاف ہو جاتی ہے اور وہ پاک و پاکیزہ دل دوسرے معاملات میں بھی خدا کے سامنے گریہ کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ دنیا کے عظیم دانش وروں کا خیال ہے کہ برائی کی جڑ سخت دلی ہے۔ جب انسان

کے دل میں ہمدردی کے جذبات مانند پڑ جاتے ہیں تو وہ اندرونی آوازوں کو دبا دیتا ہے۔ اخلاقی اور روحانی لحاظ سے برائیوں کی جڑ سخت دلی ہے۔ سخت دلی، محبت اور شفقت کے نرم ونازک جذبات کی قاتل ہے۔ خدا کی نافرمانی اور نفس امارہ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے سخت دلی پیدا ہوتی ہے۔ ضد اور ہٹ دھرمی آنسو بہانے سے روکتی ہے۔

ایک اور اہم امر کسی مقام پر پائے جانے والے جذبات، سوچ اور آواز کی لہریں اور اس سے بڑھ کر قدرتی لہریں ہوتی ہیں۔ ایسے ماحول میں ایک بہت بڑا اثر انسانی وائبز کا بھی ہوتا ہے۔ نائیدی موود نیورولوجی ٹائز کی 2018ء کی اشاعت میں لکھتی ہیں کہ بعض اوقات لوگ کسی ماحول کو خوشگوار یا ناگوار محسوس کرتے ہیں۔ تحقیق بتاتی ہے کہ کسی مقام پر موجود طاقتور وائبز وہاں پر ماضی میں ہونے والے کسی غیر معمولی واقعہ کا پتا دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ انسان پسینے یا آنسوؤں کے (chemo signals) کافی عرصے تک ہوا میں موجود رہتے ہیں۔ بعض حساس افراد ان اشاروں کا ادراک کر لیتے ہیں۔ یونیورسٹی آف نیدرلینڈ کے Gun Semin اور ساتھیوں نے نیورولوجی ٹائزر میں ایک تحقیقی پیپر شائع کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انسانی جذبات فضا میں تحلیل ہو کر وبائی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور تیزی سے دوسرے انسانوں کو متاثر کرتے ہیں (neurologytimes.com)۔ یہی وجہ ہے کہ مجالس امام حسینؑ کی سوگوار فضا سخت دل افراد یا ایسے لوگ جو کسی صدمہ یا بیماری کی وجہ سے آنسو نہ بہا سکتے ہوں انہیں بھی رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔

یونیورسٹی آف کیلی فورنیا لاس اینجلس کے پروفیسر اور راؤل ویلین برگ انسٹیٹیوٹ آف ایتھکس کے ڈائریکٹر سٹیفن سائیڈروف کے مطابق آنسوؤں کی تین اقسام ہوتی ہیں یعنی کہ ریفلیکس آنسو، مسلسل آنسو اور جذباتی آنسو۔ ریفلیکس آنسوؤں میں lysozyme پایا جاتا ہے جو ناک اور آنکھوں کو نم رکھتا ہے، ان کی صفائی کرتا ہے اور انہیں بیکٹیریا سے محفوظ رکھتا ہے۔ مسلسل گریہ کے بعد انسان کے دل کی دھڑکن آہستہ ہو جاتی ہے اور وہ سکون کی حالت میں چلا جاتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق انسان کو سب سے زیادہ فائدہ جذباتی آنسوؤں سے ہوتا ہے۔ ایسے آنسو تناؤ کے ہارمونز جسم سے خارج کرتے ہیں۔ ان آنسوؤں سے oxytocin اور

endorphins خارج ہوتے ہیں جو جذباتی تکلیف کو کم کرتے ہیں۔ گریہ سے غیر ہمدردانہ نظام اعصاب فعال ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے جسمانی اور ذہنی توازن حاصل ہوتا ہے (webmd.com)۔ گریہ کے جسمانی اور نفسیاتی فوائد کے مدنظر جاپان کے کچھ شہروں میں رونے والے کلب قائم کیئے گئے ہیں۔

5.2۔ مجالس امام حسینؑ کے مادی فوائد

اس سلسلے میں شرکاء سے دو سوال پوچھے گئے تھے۔ پہلا سوال جسمانی اور دوسرا سوال مالی فوائد کے بارے میں تھا۔ پہلے سوال کا مقصد مرض سے شفا اور دوسرے کا مقصد رزق میں برکت سے تھا۔ البتہ کچھ شرکاء نے کہا کہ دونوں سوالات آپس میں متصل ہیں لہذا دونوں سوالوں کے جوابات ایک ہی نشست میں واضح کیئے۔ جبکہ کچھ اور شرکاء کے مطابق مجالس امام حسینؑ کے تمام مقاصد روحانی ہوتے ہیں۔ اس لیئے ان عظیم الشان محافل کو مادی فوائد کے ساتھ جوڑا نہیں جا سکتا۔ مندرجہ ذیل حصے میں شرکاء کے جوابات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ تقریباً تمام شرکاء نے بیان دیا کہ مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے کے بے شمار فوائد ہیں۔ ان مجالس میں مانگی جانے والی ہر دعا کا جواب آتا ہے۔ مثلاً صحت کی دعا حتیٰ کہ خطرے میں پڑی ہوئی زندگی بھی لوٹ آتی ہے اور بعض اوقات موذی امراض بھی اپنا بدترین اثر نہیں دکھاتے۔ اس کے علاوہ مجلس کے انتظامات کے سلسلے میں جتنا کام بھی کر لو تھکن نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غیبی طاقت مدد کر رہی ہو۔ بلکہ مجالس میں شرکت کی وجہ سے نئی طاقت حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی میں بہتری آتی ہے۔ اس کے علاوہ نذر و نیاز یا مجلس کے دیگر اخراجات پر جتنا بھی خرچ کر لو اس سے ستر گنا زیادہ واپس آ جاتا ہے۔

کئی ایک شرکا نے نذر و نیاز کا ذکر کیا۔ نذر و نیاز اور تبلیغ کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ رسل اور انبیاء ہمیشہ تبلیغ کے ساتھ دعوت کا انتظام کرتے تھے۔ ائمہ اطہار کے روضوں اور اولیاء اللہ کے مزاروں پر ہمیشہ لنگر کا انتظام ہوتا ہے۔ دراصل غذا انسانی جسم کے ہر خلیے تک پہنچتی ہے اور جسم کے ہر حصے کو متاثر کرتی ہے۔ غذا جتنی پاک ہو گی انسانی خیالات اتنے ہی طہارت کی

جانب جائیں گے۔نذر نیاز کے بیشمار فوائد ہیں۔ہم نے کئی ایک افراد ایسے دیکھے جو نیاز لینے مجالس امام حسینؑ میں آئے اور بتدریج حسینی لشکر میں شامل ہو گئے۔

تقریباً تمام شرکاء نے بیان دیا کہ مجالس امام حسینؑ معاشرتی تعلقات استوار کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔بعض اوقات مجالس امام حسینؑ میں قائم کئے ہوئے روابط تمام عمر کام آتے ہیں۔کبھی کبھار روزمرہ کی مصروفیت میں پرانے رفقاء سے رابطہ نہیں ہوسکتا لیکن جب مجالس میں ان لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

5.3۔مجالس کے چند گھمبیر گوشے

کچھ شرکاء نے بعض مقررین کے چند سکوں کے عوض بک جانے اور منبر سے فاسد افکار پھیلانے کا ذکر بھی کیا۔حقیقت ہے کہ گزشتہ دس یا پندرہ سالوں سے ایک جانب تو مجالس امام حسینؑ میں وقت کی ضرورت کے تحت نئے مضامین شامل کئے گئے اور دور حاضر کے مسائل پر بحث کی گئی لیکن انہیں سالوں میں فاسد خیالات بھی تیزی سے پھیلے۔قومی اور بین الاقوامی طاغوتی قوتوں نے پیسے کے زور پر برائے نام شیعہ مقررین تیار کئے۔ان مقررین نے منبر امام حسینؑ سے افراط وتفریط،نصیریت،غلویت اور فرقہ واریت کی بھرمار کردی۔اسی دور میں ٹی وی کے پرائیویٹ چینلز،انٹرنیٹ،یوٹیوب،وٹس ایپ نے بھی انتہائی سرعت کے ساتھ معاشرے کی رگوں میں سرایت کر گئے۔سوشل میڈیا نے جہاں مستند علماء کے بیانات کو فروغ دیا وہاں غیر سند یافتہ خواتین وحضرات کو بھی ایک طاقتور فورم مہیا کیا۔ان حالات میں انفرادی اور اجتماعی طور پر خلوص نیت کے ساتھ تحقیق،تدبیر اور لائحہ عمل تیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ولی العصر عجل اللہ فرجہ کے ظہور تک نظریہ توحید و رسالت اور حجت خدا ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔ان نظریات کی حفاظت کے لئے ہمیں اصل کو نقل سے الگ کرنے کی ضرورت ہے۔اس باب کے سوال 4 کے جوابات میں اس امر پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

ہمارے ہاں ایسے مسائل بھی موجود ہیں جو کسی باقاعدہ تحریک کی وجہ سے نہیں بلکہ کم علمی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ان مسائل کا سدباب بھی بہت ضروری ہے۔ان میں سے چند مندرجہ

ذیل حصے میں پیش کیے جاتے ہیں۔

حضرت علیؑ (نہج البلاغہ حکمت 73) میں فرماتے ہیں کہ جو شخص خود کو قائد ملت بنا کر پیش کرے تو اس کا فرض ہے کہ لوگوں کو نصیحت کرنے سے پہلے اپنے نفس کو تعلیم دے اور زبان سے تبلیغ کرنے سے پہلے اپنے عمل سے تبلیغ کرے۔

مجالس امام حسینؑ میں سب سے پہلا مسئلہ مقررین یا ذاکرین کے انتخاب میں پیش آتا ہے۔ بعض اوقات ان کے علم اور آگاہی کی بجائے خوبصورت آواز کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ماہ صفر کی ایک ایسی ہی مجلس میں ہمیں جانے کا اتفاق ہوا۔ مجلس کے آغاز میں اتنی تاخیر ہوئی کہ مغرب کی نماز کا وقت آن پہنچا۔ ہم نے اہل خانہ سے درخواست کی تو وہ ایک کمرے میں لے گئیں جہاں چند جوان لڑکیاں ہنسنے کھیلنے اور چائے پینے میں مصروف تھیں۔ ہمیں نماز کا ارادہ کرتے دیکھ کر ان میں سے ایک قدرے ناگواری سے بولی کہ آپ نماز کسی اور کمرے میں جا کر پڑھ لیں۔ ہم کہاں جاتے؟ سارا گھر تو مومنات سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم نے نماز کی نیت باندھی انہوں نے ہنسی مذاق کا سلسلہ وہیں سے شروع کر دیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہ کسی کی شادی اور مہندی میں پہننے کے لئے لباس کا انتخاب کر رہی تھیں۔ ہمیں ان کے غیر سنجیدہ رویئے پر حیرت ہوئی۔ ابھی تو غم کے دن ختم ہونے میں کافی عرصہ باقی تھا۔ پھر یہ کہ صفر کی اس پر درد مجلس سے پہلے اور عین مغرب کے وقت جب دل ویسے ہی اداس ہوتا ہے وہ کتنی بے محل گفتگو کر رہی تھیں؟ بعد میں جب مرکزی ذاکرہ کے پڑھنے کا وقت آیا تو پتا چلا کہ وہ کھلنڈری لڑکیاں ذاکرہ اور اس کی ساتھی تھیں۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ذاکرہ علاقے کی ایک بڑی امام بارگاہ کی منتخب کردہ تھی۔ محرم اور صفر میں چونکہ مجالس کثرت سے ہوتی تھیں اس وجہ سے لوگ خود کسی مقرر کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔ اس علاقے کی ایک پرانی اور جانی پہچانی امام بارگاہ نے گھروں میں ہونے والی مجالس کے لئے مقررین مہیا کرنے کا انتظام سنبھالا ہوا تھا۔ اس امام بارگاہ کی منتخب کردہ کچھ اور ذاکرین کو بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ امام بارگاہ کے انتخاب کا کوئی معیار نہ تھا۔ جو بھی ان کے ہاں اپنا نام مجالس پڑھنے کے لئے رجسٹر کروا دیتا یا جو بھی جان پہچان والا ہوتا اور تھوڑا بہت سر یا حرف اٹھانا جانتا ہوتا اسے مجالس پڑھنے کے لئے نامزد کر دیا جاتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شیعہ کمیونٹی کا آپس میں گہرا

تعلق ہوتا ہے۔تقریباً سبھی لوگ ایک دوسرے جانتے ہیں۔کون کتنا پرہیز گار ہے؟ کون فروع دین کی پاسداری کرنے والا ہے؟ کون اخلاق حسنہ کا مالک ہے؟اور سب سے بڑی بات یہ کہ کون منبر پر بیٹھنے کے قابل ہے؟ اگر ہم ان بنیادی معیارات کا خیال نہیں رکھیں گے تو ایک جانب تو منبر حسینؑ کی حرمت پامال ہوگی اور دوسری جانب عوام کی گمراہی کا باعث بنیں گے۔

خوبصورت آواز، سر اور لحن ہمیشہ سے مذہبی محافل کا حصہ رہی ہیں۔سر انسان کی توجہ کھینچتی ہے، روح کے تار جھنجھوڑتی ہے اور سننے والے کو پورے وجود کے ساتھ موضوع میں ضم کردیتی ہے۔ازمنہ قدیم سے مذہبی واقعات گا کر انسانوں کو سنائے جاتے تھے۔صوفیائے کرام عوام خصوصاً ان پڑھ افراد اور بچوں کو اسلامی کہانیاں گا کر سنایا کرتے تھے۔ان کہانیوں کا اتنا اثر تھا کہ ہندو خواتین وہی کہانیاں لوری کے طور پر اپنے بچوں کو سنایا کرتیں۔جو بچے اسلامی لوریاں سن کر بڑے ہوئے وہ اسلام کی حرمت جاننے والے ہوئے۔ان میں سے کچھ تو مسلمان بھی ہو گئے۔ سریلی اور پرسوز آواز آج بھی مذہبی محفلوں کی زینت ہے۔لیکن ہر مذہبی نظم کا اپنا ایک مخصوص لحن ہوتا ہے۔مذہبی سریں احترام اور سوز لئے ہوتی ہیں نہ کہ جذبات کو بھڑکانے والی لے۔نعتیہ مقابلوں میں بھی شرط رکھی جاتی ہے کہ گانوں کی سر پر نعت کی سرنہ بنائی جائے۔افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجالس امام حسنؑ ع میں کثرت سے فلمی گانوں کی سریں سنائی دیتی ہیں۔ایسی سریں سامعین میں جوش تو بڑھاتی ہیں لیکن مجالس امام حسینؑ کے پاکیزہ ماحول کو بری طرح سے متاثر کرتی ہیں۔یہاں پر ہم ایک بار پھر اعادہ کریں گے کہ نوحہ وقصیدہ کی سر کا کم از کم معیار مقرر ہونا چاہیے۔کمیونٹی کے با اثر افراد اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

یہاں پر ہم اپنی امام بارگاہ میں 1960ء کی دہائی کا پیش آنے والا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ہماری امام بارگاہ میں ایک ذاکر صاحب تشریف لائے۔ایک روز انہوں نے کہا کہ آج آپ کو ایک ایسا قصیدہ سناؤں گا جسے آپ عرصے تک یاد رکھیں گے۔جب انہوں نے قصیدہ چھیڑا تو واقعی ایک سماں بندھ گیا۔لوگوں نے جھومنا شروع کیا اور جیسے ذاکر صاحب نیا پینترہ اٹھاتے لوگ وجد میں آتے جاتے۔ہمارے نانا دین ودنیا دونوں کا علم رکھتے تھے اور صاف گو اور جری انسان تھے۔اس وقت تو وہ مصلحتاً خاموش رہے لیکن مجلس ختم ہونے پر چند سرکردہ افراد کی موجودگی

میں ذاکر صاحب سے کہا کہ حضرت جو دھن آپ نے چھیڑی وہ بہت خوب تھی۔ راگ رنگ کی دنیا میں اسے بھیرویں کہا جاتا ہے لیکن وہ دھن صبح صادق کے بعد چھیڑی جاتی ہے۔ آپ نے کچھ جلدی کر دی ابھی تو اس دھن چھیڑنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ ذاکر صاحب بھی جہاں دیدہ انسان تھے۔ نانا کا طنز تو سمجھ گئے لیکن ہاتھ جوڑ کر بولے آپ نے بالکل صحیح کہا سید بادشاہ۔ امید ہے کہ اس واقعہ کے بعد وہ قصیدہ کی سر لگانے میں احتیاط برتتے ہوں۔ فی زمانہ ہمیں ایسے ہی صاف گو اور راست باز لوگوں کی ضرورت ہے جو مجالس امام حسینؑ سے غلو کو دور کر سکیں۔ اسی طرح نانا یہ بھی کہا کرتے تھے کہ مومنین کے جذبات ابھارنے کے لئے حقائق میں افراط و تفریط اور غیر معتبر روایات کا پڑھا جانا جرم ہے اور روز محشر اس کا حساب دینا ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ منبر پر سے جو بھی چیز پڑھی جاتی ہے وہ عوام کی شخصیت اور کردار کا حصہ بن جاتی ہے۔ اگر ہم مجلس میں بیٹھے ہیں اور غلط روایات کی تصحیح نہیں کرتے تو کل کو ہمیں رسول خداؐ کو اس کا جواب دینا ہوگا۔

عام طور پر ماتم امام حسینؑ میں غلو نہیں پایا جاتا لیکن ایک دیہی علاقے میں ہمیں عجیب رواج دیکھنے کو ملا۔ ہمیں وہاں ایک بزرگ شیعہ کی موت پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے ساتھ چند ایک اہل سنت رفقاء بھی تھیں۔ تدفین کے بعد کھانا پیش کیا گیا۔ گاؤں کی خواتین نے کھانا کھانے کے بعد ماتم کے لئے حلقہ بنایا اور ایک انہونے انداز کا ماتم شروع کیا۔ انہوں نے سر کے بال کھولے اور کمر کے گرد دوپٹے باندھ لئے۔ ماتم کے دوران وہ رکوع کی طرح آگے کو جھکتیں۔ اپنے بالوں کو جھٹکا دے کر منہ پر گرا لیتیں اور اپنے منہ سے کچھ عجیب و غریب غیر انسانی آوازیں نکالتیں۔ ماتم کے دوران حالت رکوع میں جانے کی روایت تو عربی ممالک میں بھی ہے لیکن غیر انسانی آوازوں کی منطق ہماری سمجھ سے باہر تھی۔ ہم اپنی شرکاء کار کے سامنے شرمندہ ہو رہے تھے کہ وہ شیعہ روایات کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گی؟

دیہات کی تو بات ہی چھوڑیئے شہروں میں بھی پرانی روایات کے علاوہ نت نئے مجلسی رواجوں کی بھٹی جل رہی ہے۔ شہزادہ قاسمؑ کی مہندی کی رسومات، شہزادہ علی اکبرؑ کا سہرا، اور دوسری کئی ایک تاریخی لحاظ سے کمزور روایات پر مبنی رواج عام ہیں۔ کئی ایک مقامات پر شہزادہ قاسمؑ کی مہندی کی رسومات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ بیان کرتے ہوئے بھی شرم محسوس

ہوتی ہے۔اس کے علاوہ اکثر مجالس میں ایک سے زیادہ ذاکرین اور نوحہ خواں پارٹیوں کو مدعو کرنے کا رواج ہے۔ایسی ہی ایک مجلس میں ہم نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔اس مجلس میں دو خواتین ذاکرہ کو مدعو کیا گیا تھا۔دونوں کے ساتھ اپنی اپنی نوحہ خواں پارٹیاں بھی تھیں۔وہ مجلس تنگ گلیوں میں واقع ایک مکان میں منعقد ہو رہی تھی جہاں تک گاڑیوں کا پہنچنا مشکل تھا۔ان میں سے ایک پارٹی جب مین روڈ پر پہنچی تو کسی نے ذاکرہ صاحبہ کو بتایا کہ دوسری پارٹی پہلے سے پہنچ چکی ہے اور انہوں نے مجلس کا آغاز بھی کر دیا ہے۔عموماً مجالس اپنے وقت پر شروع ہوتی ہیں اس لئے پہلی ذاکرہ کا مجلس شروع کر دینا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔لیکن نہ جانے کیوں دوسری ذاکرہ ضد پر آ گئیں۔انہوں نے مین روڈ پر ہی اپنی ساتھیوں کو ہدایت دی کہ ہم یہیں سے نوحہ و ماتم کرتے ہوئے ان کے گھر تک جائیں گے تاکہ انہیں بھی پتا چلے کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔ان کی ساتھی خواتین نے علاقے کے رواج کے مطابق اپنے سروں سے چادریں ہٹائیں اور سڑک سے لے کر مقام مجلس تک نوحہ و ماتم برپا کرتی چلی گئیں۔اب عالم یہ تھا کہ سڑک اور گلیوں میں ہر قسم کے افراد کھڑے ان کا نوحہ اور ماتم دیکھ رہے تھے۔آج کے ماڈرن دور میں بے پردہ خواتین کا کوئی بھی نوٹس نہیں لیتا لیکن اگر کوئی پردہ دار خاتون عین سڑک پر کھڑی ہو کر سر سے چادر کھسکا دے تو ہر فرد اس کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔یہاں پر ایک عام آدمی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا ماتم کے دوران خواتین کا سر سے چادر ہٹانا اور مردوں کا قمیض اتارنا اخلاقیات کے خلاف نہیں؟ کیا ہم حق کا راستہ اختیار کرتے ہوئے غیر اخلاقی رواج ختم نہیں کر سکتے؟ اس کے علاوہ کئی ایک غیر عقلی امور مجالس کے دوران دیکھنے میں آتے ہیں جن کی ہر سطح پر بیخ کنی کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح مجلس امام حسینؑ کے لئے محبت اور خلوص کے جذبات کی ضرورت ہوتی ہے۔اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ پیش خدمت ہے۔م 1 بتاتی ہیں کہ سردیوں کی ایک خنک شام میں ایک مومنہ کے ہاں ماہ صفر کی ایک سخت مجلس تھی۔ان دنوں شہر میں گیس کی لوڈ شیڈنگ ہو رہی تھی۔مجلس والا کمرہ بھی ٹھنڈا تھا اور ماہ صفر کی سخت ترین مجلس بھی محبت و مودت کے جذبات سے خالی تھی، نہ توجہ نہ گریہ۔حدیث کساء کا تو ذکر ہی کیا دن بھر کی تھکی ہاری خواتین مصائب

کے دوران بھی کھسر پسر کرنے اور اونگھنے میں مصروف تھیں۔ نوحہ اور ماتم بھی جوش وجذبے سے خالی تھا۔ م 1 کہتی ہیں کہ دعا امام زمانہ کے دوران اچانک انہیں اشارہ ملا کہ ہمیں ٹھنڈی آگ کی نہیں بلکہ ایسے جذبوں کی ضرورت ہے جو پانی میں بھی آگ لگادیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اس اشارے نے نہ صرف ان کے رونگٹے کھڑے کر دیئے بلکہ تمام عمر کے لئے مجالس امام حسینؑ برپا کرنے اور اس میں شرکت کا کم از کم معیار بھی سمجھا دیا۔ سبحان اللہ! کیا خوب اشارہ تھا، مطالب ومعنی سے لبریز، مومنین کے لئے بہترین چراغ راہ اور وقت کی اہم ضرورت بیان کرتا ہوا اشارہ۔ موجودہ تحریر میں ہم نے بحث کی کہ مجالس امام حسینؑ عشق کی اعلیٰ ترین مثال پیش کرتی ہیں۔ اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ: ”ان لقتل الحسین علیہ السلام حرارۃ فی قلوب المومنین لن تبرد ابداً“۔ ترجمہ: یقیناً حسینؑ کی شہادت کے لئے مومنین کے دلوں میں ایسی حرارت ہے جو کبھی ٹھنڈی نہیں ہوگی۔

شہید مطہریؒ اپنی کتاب Polarozation Around The Character of Ali Ibne Abi Talib میں فرماتے ہیں کہ شیعیت کی بنیاد عشق ومحبت پر ہے۔ عشق اہل بیت کی تاثیر اکیر کی سی ہے جو انسانوں کے دل اور روح کو بدل دیتی ہے۔ اکیر۔ ایک ایسا عنصر ہے جو مادے کو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل دیتا ہے۔ مثلاً تانبے کو سونے میں، ایلومینیم کو چاندی میں، وغیرہ۔ کیمیادان صدیوں تک اس مادہ کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ اس کے علاوہ ایرانی شاعر وحشی کرمانی (1583ء) نے کیا خوب کہا ہے کہ

جس دل میں چنگاری نہ ہو وہ دل ہی نہیں
ایک جما ہوا دل، دل نہیں بلکہ مٹی کا ڈھیلا ہے
اے خدا مجھے چنگاریوں سے بھری چھاتی عطا کر
اور اس چھاتی میں ایک ایسا دل جسے عشق کی آگ نے جلا کر بھسم کر دیا ہو۔

شہید باقر الصدرؒ کہتے ہیں کہ ایمان کا صرف یہی معنی نہیں کہ حق آپ کے دل میں زندہ ہو لیکن وہ شعلہ جو آپ کے نفس میں بھڑکے اور دوسروں کو روشنی دے۔

بعض اوقات مجالس امام حسینؑ کے انتظام اور نذر و نیاز میں بھی دکھاوا کا عنصر نظر آتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری حقیر محنت قبول ہوجائے، پاک ارواح واجسام ہماری برپا کی ہوئی مجلس میں تشریف لائیں اور مقام عزاداری سے خوشبو آئے تو مقابلے، دکھاوے یا دنیاوی شہرت کی بجائے خلوص نیت کا ہونا ضروری ہے۔

اس حصے کے آخر میں ہم کہیں گے کہ مجالس امام حسینؑ اعلیٰ ترین درجے کی نورانی محافل ہوتی ہیں اور مجالس برپا کرنا ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اس کے کم از کم معیار، قوانین اور اصول وضوابط مقرر ہونے چاہئیں اور تمام متعلقہ افراد کو ان کی پابندی کرنی چاہیے۔ ایک اور عام مسئلہ نئے پڑھنے والوں کی دل شکنی کا بھی ہے۔ انہیں منبر پر آکر پڑھنے کا وقت نہیں دیا جاتا جس کی وجہ سے کئی ایک نوجوانوں کے کچے ذہن مجالس سے برگشتہ ہوجاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا عاجزانہ مشورہ یہ ہے کہ چاہے مجلس کا زیادہ وقت پرانے پڑھنے والوں یا مرکزی مولانا/ ذاکرین کے لئے ہی مخصوص کیوں نہ ہو لیکن منتظمین کو چاہیے کہ کچھ وقت نئے پڑھنے والوں کے لئے مخصوص کردیں۔ جیسے مجلس کے آغاز پر ایک آدھ نئے پڑھنے والے کو وقت دے دیا جائے تو ان کی تسلی ہوتی رہے گی۔ اسی طرح سے ان نورانی محفلوں میں رکھ رکھاؤ، اخلاقیات اور ادب آداب کا ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے۔ وہ مقام جہاں پر نورانی مخلوقات بھی باادب حاضری دیتی ہیں، وہاں ہم جیسے گناہ گاروں کی بھلا کیا حیثیت؟ عورت ہو یا مرد، امیر ہو یا غریب، مجلس پڑھنے والا ہو یا سننے والا اور برپا کرنے والا، حدادب کا اصول سب کے لئے برابر ہے۔ گو کہ علما کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت کئی ایک امور میں تبدیلی واقع ہوچکی ہے لیکن مجالس سے منسلک دیگر افراد کے فرائض اپنی جگہ اہم ہیں، جس طرح مجالس میں شرکت کرنے والے مومنین، یا منتظمین۔ بعض اوقات منتظمین کی جانب سے تلخی وترشی دیکھنے میں آتی ہے۔ جس کو ہم مجلس کہتے ہیں، دراصل وہ مجلس نہیں بلکہ شہزادہ علی اکبرؑ کی جاگیر ہے۔ اس جاگیر میں داخل ہونے کے بعد، ہمارے رویئے میں محبت اور نرمی، ہماری گفتار اور کردار باادب اور اطوار حد درجہ مہذب ہوجانے چاہئیں۔ جس طرح روشنی اور اندھیرا ایک ساتھ نہیں رہ سکتے بالکل اسی طرح مجالس امام حسینؑ اور تلخی وترشی ایک مقام پر نہیں رہ سکتے۔

5.4۔ مقصد حیات، امامؑ کا اتباع اور شوق شہادت

آخری سوال کے متفرق جوابات موصول ہوئے۔ زیادہ تر مومنین و مومنات نے کہا کہ ہماری زندگی کا مقصد ہی کیا ہے؟ اگر زندگی کے آخر پر موت ہی ہے تو کیوں نہ ہم امام کی اقتدا میں شہید ہو جائیں؟ شہادت تو مطلوب و مقصود مومن ہے۔ ایک مومنہ نے اظہار کیا کہ وہ ضرور امام کی صدا پر جواب دیں گی، البتہ انہیں یقین ہو کہ وہ امامؑ ہی ہیں۔ ایک اور مومنہ نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ امام العصرؑ کے ظہور کے ساتھ کربلا کا کچھ حصہ ضرور لوٹ کر آئے گا۔ اس وقت امام کے ہر حکم کی اطاعت ہمارے لئے ضروری ہوگی۔ اس کے برعکس کچھ شرکاء نے اظہار کیا کہ ہم کمزور ایمان کے حامل لوگ ہیں۔ کہاں ہم اور کہاں امام حسینؑ کے اصحاب؟ وہ کسی اور مقام پر تھے۔ کربلا کی مائیں کچھ اور تھیں۔ ہم اس وقت یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن ہماری دلی خواہش ہے کہ امامؑ کی نصرت کا جھنڈا اٹھائیں۔

ہم نے ہر سوال کے جوابات پر بحث کی۔ لیکن یہاں پہنچ کر عقل کے پر جل جاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر انسانی عقل حیران اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ یہ سر فروشی و عشق و عرفان کا معاملہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری روحوں نے شاہ زماں امام العصرؑ کی نصرت کا پیمان ہزاروں سال پہلے باندھا تھا اور ہمارے آبا نے صدیوں سے ہمیں اس واقعہ کے لئے تیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم منتظرین امامؑ میں سے ہیں۔ ہماری تخلیق کا مقصد ہی امامؑ کی نصرت ہے۔ ہمارا پورا وجود اس طرز پر تخلیق ہوا کہ اس سے ہر لحہ لبیک یا ابن رسول اللہؐ، لبیک یا امام العصر کا نغمہ گونجتا رہے۔ ہمارے جسم کا ہر ذرہ پیغام وفا اور خون کے ہر قطرے میں نعرہ تجدید وفا ہے۔ آیئے امام کے ظہور اور منتظرین کے فرائض کے بارے میں قرآن پاک کی آیات، رسول اللہؐ اور ائمہ اطہارؑ کے فرامین کا جائزہ لیتے ہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے: قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَصۡبَحَ مَآؤُکُمۡ غَوۡرًا فَمَنۡ یَّاۡتِیۡکُمۡ بِمَآءٍ مَّعِیۡنٍ ترجمہ: کہہ دو کہ اگر تمہارا پانی گہرائیوں میں چلا جائے تو پھر کون ایسا ہے جو تمہیں دوبارہ چشمے کا پانی نکال کر لا دے؟ ائمہ اطہارؑ کے اقوال کے مطابق لشکر امام العصرؑ میں داخل ہو جانے والے چشمے کی طرح ہیں جو خدا کے حکم سے دوبارہ سطح زمین پر

ابھریں گے اور صدیوں سے پیاسی روحوں کو سیراب کریں گے۔ ینابیع المودہ (591) پر درج ہے کہ خدا ان کے قیام وخروج کے اسباب ایک دن میں مہیا کرے گا۔ ان کے سر پر ہر وقت ایک ابر کا سایہ رہے گا۔ لہٰذا ہمیں سمجھ جانا چاہیے کہ جو مالک ومختار ایک دن میں ان کے ظہور کو ممکن بنا دے گا وہی ان کے شیعوں کے دل جری، ان کی نظر مستحکم اور ارادے مضبوط فرمائے گا۔ زہیر بن قین کو ہی لے لیجئے۔ انہیں اپنا مال و دولت، تجارت اور اہلیہ اتنے عزیز تھے کہ ان کا ذہن امام حسینؑ سے ملاقات کے لئے راضی نہیں تھا لیکن جب امام عالی مقام سے ملاقات ہوئی تو چند لمحوں میں ہی ان کا ذہن بدل گیا۔ انہوں نے انتہائی شوق اور لگن کے عالم میں دنیا کے تمام مال ومتاع کو خیر باد کہا اور امامؑ کے ہمراہ میدان کربلا کی جانب روانہ ہو گئے۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کے حال سے واقف ہیں۔ جیسا کہ وہ شیخ مفیدؒ کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں کہ ہم تمہارے حالات سے آگاہ ہیں اور تمہاری کوئی چیز ہم سے پوشیدہ نہیں (ریاض الابرار فی مناقب الائمہ الاطہار)۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم میں سے کون ان کے گروہ میں شامل ہونے کے قابل ہے اور کون کس مقام پر کھڑا ہے؟ کسے کہاں سے اٹھا کر کس جگہ پہنچانا ہے؟ اس وقت ہمارا حال اس طالب علم کا سا ہے جس نے امتحان کی حتی الامکان تیاری کر لی ہو لیکن امتحان کے خوف سے سبق بھولا ہوا محسوس ہوتا ہو۔ ہمارا کام تو بس خلوص نیت سے اپنا سبق دہرانا، فروع دین کو درست کرنا، بے حیائی سے احتراز اور اخلاق حسنہ کا خیال رکھنا ہے۔ باقی رہ گیا مشکل مراحل سے ہاتھ پکڑ کر نکال لے جانا تو استاد اعظم اپنا کام بہت احسن طریق پر سرانجام دینا جانتے ہیں۔ جس طرح قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ اور پیغمبر کہہ دیجیے کہ تم لوگ عمل کرتے رہو۔ تمہارے عمل کو اللہ اور صاحبان ایمان سب دیکھ رہے ہیں۔ (سورہ توبہ:10) آیئے اب امام العصرؑ کے بارے میں چند اور روایات کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان ارشادات کی روشنی میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ ’وہ شہاب ثاقب کی طرح ظہور کریں گے‘ (بحار الانوار:11،140)۔ اگر ظاہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ تمثیل شہاب ثاقب کی حیران کن سرعت، طاقت اور روشنی کی وجہ سے پیش کی گئی ہے۔ یعنی کہ اللہ تعالیٰ امام کے ظہور کے اسباب ایک رات

میں مکمل فرما دے گا اور وہ اس طاقت اور سرعت سے ظہور فرمائیں گے کہ کوئی بھی ان کے ظہور کو روکنے کی طاقت نہ رکھتا ہوگا۔ مزید ان کا ظہور آواز اور نور کے ساتھ ہوگا جو کہ زمینی مخلوق کے لئے روز روشن کی طرح عیاں ہوگا[1]۔ امام رضاؑ سے منقول ہے کہ ان کی غیبت طولانی ہوگی۔ جس میں مخلص لوگ ان کے ظہور کے منتظر ہوں گے۔ شک کرنے والے ان کے وجود سے انکار کریں گے اور انکار کرنے والے ان کے ذکر کا مذاق اڑائیں گے (65)۔

کفایۃ الاثر میں امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام سے روایت ہے کہ ہمارے وہ شیعہ خوش نصیب ہیں جو ہمارے قائم کی غیبت کے زمانے میں ہماری امامت کے سلسلے سے وابستہ، ہماری محبت پر باقی اور ہمارے دشمنوں سے بیزار رہیں گے۔ (بحار الانوار: 205) میں حضرت علیؑ کا امام حسینؑ کے ساتھ ایک مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مکالمے کا حاصل بحث کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ غیبت و حیرت کے بعد اس وقت (دوران زمانہ غیبت) اپنے دین پر وہی لوگ ثابت قدم رہیں گے جو مخلص ہوں گے اور جن میں روح یقین ہوگی۔ بحار الانوار میں مضمون 'زمانہ غیبت میں شیعیان علیؑ کا فریضہ' (باب 5) باقر مجلسیؒ امام محمد باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ جہاں محمدؐ اور ائمہ

اس تمثیل کے اور معنی بھی نکلتے ہیں۔ مثلاً:

1۔ شہاب ثاقب کے نزول سے پہلے ہی اس کی خبر زمین پر پھیل جاتی ہے۔ لوگ دہشت کا شکار ہوجاتے ہیں لیکن کوئی بھی اس کے نزول کو روک نہیں سکتا۔ ہزاروں سال سے زمین پر گرنے والے شہاب ثاقب آبادیوں کا رخ نہیں کرتے بلکہ غیر آباد علاقوں میں گرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح سے ہزاروں سال سے مخالف قوتیں امام کے ظہور کو روکنے یا تاخیر کی کوشش میں ہیں۔ لیکن جب وقت ظہور آئے گا تو کوئی بھی طاقت اسے روک نہیں پائے گی۔

2۔ شہاب ثاقب آفاقی اور ارضی خصوصیات کا ایک عجیب امتزاج ہوتا ہے۔ وہ سورج سے الگ ہوئی چٹانیں ہوتی ہیں جو بعض وجوہات کی بنا پر زمین پر آ گرتی ہیں۔ دیکھنے میں وہ ارضی چٹانوں جیسی ہیئتیں رکھتی ہیں لیکن ان کی اندرونی ساخت آفاقی معدنیات اور کیمیائی اجزا پر مشتمل ہوتی ہے۔ خصوصی طور پر ان میں پایا جانے والا لوہا اور آکسیجن نہ صرف انسانوں بلکہ زمین، ماحولیات اور حتیٰ کہ اوزون کے لئے بھی آب حیات کا کام دیتے ہیں۔ ازمنہ قدیم سے ان چٹانوں یا ان سے ٹوٹے ہوئے پتھر کے ٹکڑوں کی غیر معمولی مسام دار ساخت، معدنیاتی اور مقناطیسی طاقت کو بہادری، صحت اور روحانی صلاحیتوں کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ ریکی ماسٹران پتھروں کی روحانی صلاحیتوں کی وجہ سے انہیں استعمال میں لاتے ہیں۔ اسی طرح امام العصر کی ہستی ارضی اور آفاقی عناصر کا ایسا مجموعہ ہے جو انسانوں کے لئے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

طاہرینؑ جائیں تم بھی وہیں جاؤ۔ جہاں سے الگ ہٹ جائیں تم بھی گریز کرو۔۔۔ان ہی سے محبت کرو جن سے محبت کرتے تھے اور ان سے بغض رکھو جن سے بغض رکھتے تھے۔ پس جلد ہی (قائم کا) ظہور ہو جائے گا اور تمہاری مشکلات دور ہو جائیں گی۔

باقر مجلسیؒ بحار الانوار میں موضوع ظہور کے وقت اہل ایمان کا اجتماع میں امیر المومنینؑ سے روایت کرتے ہیں کہ ’جب دین کا تاجدار آکر خیمہ زن ہوگا تو لوگ اس کے پاس اس طرح جمع ہو جائیں گے جس طرح بادل کے چند ٹکڑے موسم خریف میں ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں‘ (210)۔اسی طرح نہج البلاغہ میں امام فرماتے ہیں کہ ’۔۔۔اور آج کے دن سے کل دور ہی کتنا ہے۔ انتظار کرو، وعدے کا وقت قریب ہے جو بہت جلد افق پر طالع ہونے والا ہے۔ جس سے تم لوگ واقف نہیں ہو‘۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ ’ظہور کے لئے عجلت چاہنے والے (ہلاک ہو جائیں گے) اور وہ لوگ جو اس کے قائل ہوں گے کہ ظہور قریب ہے وہ نجات پائیں گے اور مخالفین کی سلطنت اپنی بنیاد پر قائم رہے گی۔ اس وقت تم لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے رہنا۔ کیونکہ یہ فتنہ خود اس کے لئے مضر ہوگا جو اس کو برپا کرے گا۔ یا یہ کہ تم لوگ اپنی زبانیں بند رکھنا اور اپنے گھروں میں بیٹھے رہنا‘ (غیبۃ النعمانی)۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ ’زمین پکڑے رہو۔ مصائب پر صبر سے کام لو۔ اپنے ہاتھوں اور اپنی تلواروں کو بالکل حرکت نہ دو۔ زبان روکے رہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے خود تمہارے لئے جلدی نہیں کی تو پھر تم کیوں جلدی کرتے ہو؟‘ (بحار الانوار:11، 691)۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ ’جب تک یہ زمین اور آسمان ساکن ہیں تم بھی ساکن رہنا اور کسی پر بھی خروج نہ کرنا۔ اس لئے کیونکہ جب تمہارے صاحب الامر آئیں گے تو کسی پر مخفی نہیں رہے گا۔ ان کے پاس بندوں کی دی ہوئی نشانیاں نہیں بلکہ اللہ عزوجل کی عطا کردہ نشانیاں ہوں گی۔ وہ آفتاب سے بھی زیادہ واضح اور روشن ہوں گی اور کسی نیکوکار و بدکار سے پوشیدہ نہیں رہیں گی۔ تم لوگ صبح کو تو پہچانتے ہو؟ بس ان کا ظہور بھی ایسا ہی ہوگا۔ جیسے صبح کا ظہور ہوتا ہے۔ اور وہ کسی پر پوشیدہ نہیں رہتا‘ (بحار الانوار:11، 681)۔

ائمہ اطہارؑ کے ان اقوال میں لاتعداد حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اول تو یہ کہ ان پاکیزہ ہستیوں نے چودہ سو سال پہلے جو ارشادات فرمائے ہم نے گزرتی صدیوں میں ان میں سے بعض کی

حقیقت دیکھ لی۔اس عرصے میں تقریباً ہر تہذیب اور مذہب میں مہدویت کے جھوٹے دعویدار پیدا ہوئے۔لیکن جس نے بھی امام ہونے کا دعویٰ کیا اور جس نے اس کا ساتھ دیا وہ سب ذلت کی موت مرے۔اس کے علاوہ کچھ مخصوص عرصے کے بعد میڈیا سے ظہور اور دنیا کے ختم ہونے کا چرچا کیا جاتا ہے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد ایسا پروپیگنڈہ اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔یاد رہے کہ ان امور کے پیچھے طاغوتی طاقتوں کا اپنا ہی ایک ایجنڈا ہوتا ہے۔امامؑ کا ظہور سوشل میڈیا کی فلموں یا ڈاکومنٹری کا محتاج نہیں ہے۔امامؑ کے ظہور کا انتظام تو بس ایک رات میں ہی ہو جائے گا اور وہ صبح کے طلوع کی طرح ہوگا جسے اپنے پرائے سبھی پہچان لیں گے۔ہمیں تو بس اپنے ایمان کی حفاظت کرنی ہے، اپنی اولاد کی صالح تربیت کرنی ہے۔صبر، خاموشی اور استقامت کے ساتھ ان کا انتظار کرنا ہے۔

لیکن امامؑ کا ظہور اس وقت تک قرار نہیں پائے گا جب تک کہ ظلم کی انتہا نہ ہو جائے۔ جب تک کہ ایمان والوں کو چنگاریاں اپنے ہاتھوں سے نہ چننی پڑیں اور جب تک کہ صاحبان ایمان کو منافقین کے درمیان سے اس طرح الگ نہ کر لیا جائے جیسا کہ آٹے کو چھان بورے سے الگ کیا جاتا ہے۔امامؑ کے ظہور سے قبل پیش آنے والے ان حالات کا ذکر چودہ سو سال پہلے ہی کیا جاچکا ہے۔مثلاً حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ...... میرے بھائی تو وہ ہیں جو آخر زمانہ میں پیدا ہوں گے۔وہ بغیر مجھے دیکھے ہوئے مجھ پر ایمان لائیں گے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے نام مجھے اس وقت بتا دیئے تھے جب وہ ابھی اپنے آباء کی صلبوں اور ماؤں کے شکموں سے نکلے بھی نہ تھے۔ان بیچاروں کے لئے اپنے دین پر قائم رہنا اس سے زیادہ مشکل ہوگا جتنا اندھیری رات میں کانٹوں پر چلنا یا آگ کے انگارے ہاتھ سے اٹھانا اور وہی لوگ تو درحقیقت اندھیری رات کے چراغ ہوں گے۔اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہر قسم کے گھمبیر فتنوں سے نجات دے گا (بصائر الدرجات)۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ یہ امر یاس و ناامیدی کے بعد ہی ظہور پذیر ہوگا جب تک کہ تمہیں پرکھ نہ لیا جائے۔خدا کی قسم اس وقت تک ظہور نہیں ہوگا، جب تک تمہیں چھانٹ نہ لیا جائے (باہر الانوار: 11، 627-28)۔اسی طرح امام حسن عسکریؑ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ ظہور اس وقت تک نہ ہوگا جب تک کہ تم لوگوں کو اچھی طرح چھان پھٹک نہ لیا جائے اور تاوقتیکہ تم میں سے صرف

نادر ترین لوگ رہ جائیں' (630)۔امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ 'دورِ غیبت میں اپنے دین کے ساتھ متمسک رہنے والا ایسا ہے جیسے کانٹوں پر چلنے والا' (بحارالانوار: 11، 628)۔علاوہ ازیں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ 'تم لوگ پہلے سے جس طریقے سے وابستہ چلے آرہے ہو اسی پر کاربند رہنا یہاں تک کہ تم پر صاحب الامر ظاہر ہو جائے' (بحارالانوار: 11، 672)۔

حضورؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ 'اے علی! تمہیں معلوم ہو کہ لوگوں میں سب سے بڑا صاحب یقین ایک گروہ ہو گا جو آخر زمانہ میں پیدا ہو گا۔ نہ تو انہوں نے اپنے نبیؐ کو دیکھا ہو گا اور حجت (امام) بھی پردہ غیبت میں ہو گا۔ اس کے باوجود وہ ہر سیاہ و سفید پر ایمان رکھتے ہوں گے' (اکمال الدین)۔اسی طرح امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ 'اے عمار! پوشیدہ خیرات خدا کی قسم اعلانیہ خیرات سے بہتر ہے۔ اسی طرح باطل حکومتوں کے دور میں اپنے امام وقت کے دامن سے وابستہ رہتے ہوئے چھپ چھپا کر عبادت کرنا جس میں دشمنوں کا خوف بھی لاحق ہو ان لوگوں کی عبادت سے افضل ہے جو امام قائم کے عہد حکومت میں ان کے ساتھ رہ کر بے خوف و خطر عبادت کریں گے۔ کیونکہ خوف کے عالم میں عبادت اور بے خوفی کے عالم میں عبادت کرنے میں بہت فرق ہے' (بحارالانوار: 11، 659)۔اس کے علاوہ ائمہ کرام کے فرمودات کے مطابق غیبت کے زمانے میں امام کا انتظار اور ان کی مدد کا ارادہ ہی عظیم ترین عبادات ہیں۔ جس طرح امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ 'اگر تم میں سے کوئی اس کا قائل ہو کہ اگر میں قائم آل محمد کا زمانہ پاؤں گا تو میں ان کی مدد کروں گا تو وہ بھی اس شخص کی مانند ہو گا جو ان کی معیت میں رہ کر تلوار چلائے اور شہید ہو جائے (المحاسن)۔

بس تو مذکورہ بالا فرمودات میں ہمیں اپنے سوالوں کا جواب مل گیا۔ جس میں سب سے اہم یہ ہے کہ امامؑ کے ظہور میں جلدی نہ کرو۔ امامؑ کا انتظار ہی غیبت کے پر آشوب دور میں سب سے بڑی عبادت ہے۔ خاموشی سے اپنے دین پر قائم رہو۔ آپس میں محبت و آشتی سے کام لو۔ اپنے ظاہری اور چھپے ہوئے دشمن کی پہچان رکھو۔ کسی فتنے کا حصہ نہ بنو۔ گویا کہ زمین پر گڑی ان کیلوں کی مانند ہو جاؤ جو زمین سے فقط اتنی بلند ہوتی ہیں کہ باطل کی راہ کھوٹی کریں لیکن اتنی نہیں کہ طوفان بلا انہیں اکھاڑ پھینکے۔ بس یہی ہے زمانہ غیبت میں زندہ رہنے کی ترکیب۔ امامؑ

کا ظہور خدائے ذوالجلال والا کرام کا وعدہ ہے اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ وہ سورج کی طرح طلوع ہوں گے۔ ان کی پہچان نہ شیعہ کا مسئلہ رہے گی نہ غیر شیعہ کا، نہ ہی مسلم اور غیر مسلم کا بلکہ جس طرح مشرق و مغرب میں بسنے والی تمام اقوام کا سورج ایک ہی ہے بالکل اسی طرح سے عسکری کا چاند بھی ایک ہی ہے۔ جب وہ طالع طلوع ہو گا تو ہر ذی روح حتیٰ کہ غیر روح بھی اسے پہچان لے گا۔ عجل اللہ فرجہ

امام ؑ کے ظہور سے پہلے پیش آنے والے بہت سے واقعات ظہور پذیر ہو چکے اور کچھ کا ظہور ابھی باقی ہے۔ آج جس تیزی کے ساتھ انواع و اقسام کے نظریات تیار ہو رہے ہیں اس سے پہلے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اہم تو یہ ہے کہ آج چند سکوں پر بک جانے والے انسانوں کی جتنی کثرت ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ طاغوتی قوتیں سکوں کی چمک کی بدولت منافقین کا سودا کرتی ہیں اور وہ اپنے ہی قوم اور قبیلے کی صفوں میں پھوٹ ڈالتے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو گا کہ توحید و رسالت و امامت کے عقائد کو دھندلا کر دیا جائے یا حلال اور حرام کے فرق کو مٹا دیا جائے یا (خدانخواستہ) ایک جانب تو امامت کے وجود سے ہی انکار کیا جا رہا ہو اور دوسری جانب توحید و امامت کو آپس میں گڈمڈ کر دیا جائے۔ چونکہ طاغوتی طاقتیں ان امور کو سرانجام دینے کے لئے منافقین کو خریدتی ہیں اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ اپنی صفوں میں موجود منافقین کو پہچانیں۔ حضرت علیؑ (نہج البلاغہ: خط 27) میں محمد بن ابی بکرؓ کو لکھتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے مجھ سے فرمایا کہ 'میں نہ تو ایمان والوں کے لئے پریشان ہوں اور نہ کافروں کے لئے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی حفاظت فرمائے گا اور کافروں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا۔ میں صرف منافقوں سے خوفزدہ ہوں جن کا دل منافق اور زبان عالم جیسی ہوتی ہے۔ وہ ایسے بولتا ہے جسے تم قبول کر لیتے ہو۔ لیکن اس کا عمل تم قبول نہیں کر سکتے'۔ حضرت علیؑ کی مخالفت تمام عمر منافقین نے کی اور ان کا قتل بھی منافقین کے گروہ میں سے ایک نے کیا۔

اس کے علاوہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ 'اے مالک بن ضمرہ! اس وقت تیرا کیا حال ہو گا جب گروہ شیعہ آپس میں ہی اختلاف کریں اور اس طرح گتھ جائیں گے' اس کے بعد آپ نے ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں کس کر گتھ دیا کہ اس طرح۔ دراصل منافقین اصل حقائق کو توڑ موڑ

کر فاسد عقائد اور نظریات کی ایک نئی کھیپ تیار کرتے ہیں۔ حقائق کی یہ الٹ پھیر آپس میں پھوٹ ڈلوانے کا باعث بنتی ہے۔ ان کے مذموم ہتھکنڈوں سے بچنے کے لئے عوام کا باشعور ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ شیعہ قوم کے ہر فرد کے لئے اسلامی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ تاکہ اگر کوئی مقرر معتبر تاریخ سے انحراف کرے تو سامعین اس بیان کی حقیقت کو سمجھ جائیں۔ ہم نوجوانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ خالص اسلامی نظریہ توحید سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹیں۔ کوئی بھی مقرر چاہے وہ عوام میں کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو اور کسی بھی اعلیٰ شخصیت کا بیان کیوں نہ پیش کر رہا ہو۔ اگر نظریہ توحید سے انحراف کرے تو اس کے مذموم ارادے سمجھنے میں دیر نہ کریں [1]۔ نظریہ توحید کی حفاظت کے لئے اول وقت کی نماز نہ چھوڑیں۔ ایسی نماز نہ صرف معراج انسانیت کا ادراک ہے بلکہ ہر قسم کے شیطانی وسوسوں سے بچاتی ہے۔ مزید یہ کہ اگر کوئی مقرر مومنین کے جذبات ابھارنے کے لئے عبد و معبود یا دیگر فروعی اور اخلاقی حدود سے تجاوز کرے تو اس کے مقاصد سمجھنے کی کوشش کریں۔ سب سے اہم امر تو یہ ہے کہ بیغرض اور سچی قیادت کے پرچم تلے جمع رہیں۔ قیادت کے بغیر کوئی بھی گروہ بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح ہوتا ہے اور طاغوتی طاقتیں آسانی کے ساتھ اس کی صلاحیتوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔

اس تحریر کے آغاز پر ہم نے ترانہ محبت گایا اور اس کا اختتام بھی اسی الوہی فسانہ مودت سے کرتے ہیں۔ شہید مطہریؒ اپنی تصنیف قطبین (57-58) میں تحریر فرماتے ہیں کہ ’محبت طاقت ہے۔ وہ انسان کو بے غرض، کنجوس کو فیاض، بے صبر کو صبر و سکون کا پہاڑ اور سخت دل کے دل کو گداز کرتی ہے۔ وہ انسان کو وسوسوں سے دور کرتی اور سوچوں کو پاکیزہ بناتی ہے۔ وہ چھپی ہوئی

ماضی قریب میں ایک مشہور مقرر نے ایک جلیل القدر صحابی رسول کے بارے میں بیان دیا کہ وہ ہمہ وقت در فاطمہ ؟ پہ سجدہ کرتے تھے اور حضرت علی ؟ کے پیچھے چلتے ہوئے ان کے جوتوں کے تلووں سے اڑنے والی مٹی کے ذرات کھاتے جاتے تھے۔ نعوذ باللہ۔ اس بیان میں نہ صرف نظریہ توحید بلکہ توقیر انسانیت کو بھی چیلنج کیا گیا ہے۔ کوئی بھی مسلمان ایسی لغویات سننے کو تیار نہیں ہوگا۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہزاروں کا مجمع اس مقرر کو داد و تحسین کے ٹوکروں سے نواز رہا تھا۔

صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ ارادہ مضبوط کرتی ہے۔ وہ کرامات دکھاتی ہے اور محیر العقل حالات واقعات کو عمل میں لاتی ہے‘ مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے کہ ’محبت کی حدت تانبے کو سونا بنا دیتی ہے‘۔ ہاں البتہ یہ محبت روحانی ہونی چاہیے نہ کہ مادی۔ محبت انا کا خاتمہ کرتی ہے۔ وہ ہمیں محبوب کا عکس بنا دیتی ہے۔ وہ ایک برقی تار ہے جو عاشق کا تار معشوق کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔ آج انسانیت کو شدت سے ایسے اکیرب اور کیمیا کی ضرورت ہے جو ان کی روح کو زندہ کر دے۔ تو بس پیغام محبت تو ہم تک پہنچ گیا۔ موجودہ زمانے کے کیمیا گر کے آنے تک ہم توحید الٰہی، رسالت اور امامت کی مودت کی برقی تاروں سے منسلک ہیں۔ یہی برقی رو ہماری جسمانی اور روحانی غذا کا کام کرتی ہے اور ہماری زندگیوں کی ضامن ہے۔ اس برقی رو کا اختیار مجالس امام حسینؑ کے ہاتھ میں ہے۔ جیسے کہ ہم نے بیان کیا کہ بدھ مت کی روایات کے مطابق مہا آتما بدھا نے اپنا لبادہ اپنے قریب ترین پیروکار مہا کشیاپا کو دیا تا کہ وہ اسے مستقبل میں آنے والے نجات دہندہ تک پہنچا دیں۔ کون جانے کہ جب انہوں نے اپنا لبادہ میتریا کو پہنچانے کے لئے دیا تو اس پر کتنے نشان وفا اور جفا تھے [1]۔ اسی طرح شیعیان علیؑ کو کربلا کے میدان میں دین کا خون آلودہ لبادہ امانت کے طور پر عطا ہوا۔ اس لبادے کی حفاظت اور کسی قسم کی افراط و تفریط کئے بغیر اس کو بقیۃ اللہ فی الارض تک پہنچانا شیعیان علیؑ کا مقصد حیات ہے۔

5۔5۔ نتائج اور سفارشات

مذکورہ بالا تحریر میں ہم نے موجودہ دور کے مخصوص حالات کے تحت مجالس امام حسینؑ کے مادی اور روحانی فوائد کا جائزہ لیا۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا مجالس امام حسینؑ کے ضمن میں لفظ کرامت یا فیوض و برکات کی بجائے فوائد، مفید یا افادیت استعمال کیا گیا کیونکہ یہ موجودہ دور کی عام فہم

1 موجودہ تاریخ نے مہا آتما بدھا کی اصلیت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ہم ان کے روحانی مقام سے واقف نہیں۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ سفید لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ انہوں نے مستقبل میں آنے والی الٰہی حجتوں کی بشارت انسانوں تک پہنچائیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس دور میں دین میں اصلاح کرنے کے بدلے میں جتنے مظالم مہا آتما بدھا پر ڈھائے گئے شاید ہی کسی اور پر ڈھائے گئے ہوں۔ آخر کار ان کی خوراک میں ایسا زہر ملایا گیا جو بتدریج انہیں موت کی جانب لے گیا۔

اصطلاحات ہیں جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر سکہ رائج الوقت کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ یہ تحریر عزاداران حسینؑ کے علاوہ بین المذہبی قارئین کو سامنے رکھ کر بھی لکھی گئی ہے۔اس لئے مذہبی کے علاوہ عام فہم اصطلاحات کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ موجودہ تحقیق کے سوالات ترتیب دیتے ہوئے روحانی فوائد کا سوال اول اور مادی فوائد دوسرے نمبر پر رکھے گئے۔مجالس امام حسینؑ کے مادی فوائد تو لاتعداد ہیں لیکن جیسا کہ بعض شرکاء نے اظہار کیا کہ وہ عزاداری حسینؑ کی اضافی پیداوار (by product) ہیں۔ درحقیقت مجالس امام حسینؑ کہ مکمل طور پر روحانی تجربات ہیں جو ہمیں خود شناسی، قومی اور گروہی شناخت اور سب سے بڑھ کر اپنے رب سے آگاہی دلاتی ہیں۔تحقیق کے پہلے تین سوالوں کے زیادہ اور چوتھے سوال یعنی کہ اگر کربلا کل واقع ہو رہی ہو۔۔۔کے جوابات نسبتاً کم موصول ہوئے۔لیکن محققین کے لئے اس سوال کے جوابات حاصل کرنے سے زیادہ شرکاء کی سوچ اور لائحہ عمل اہم تھی۔ہمیں یقین ہے کہ اس سوال نے شرکاء کی سوچ کو نئی راہیں دکھائی ہوں گی۔موجودہ تحقیق بین المذہبی ہم آہنگی کی حامل تھی۔لہٰذا دوسرے مذاہب میں موجود حضرت علیؑ اور امام العصرؑ کے تذکرے بیان کئے گئے۔اس ضمن میں زبور، تورات اور انجیل پر پہلے ہی کام ہو چکا ہے لہٰذا یہاں بدھ مت میں موجود معلومات نقل کی گئیں۔یہ بھی بیان کیا گیا کہ بدھ مت میں حضور اکرمؐ اور اہل بیت کے تذکرے بھی موجود ہیں لیکن ان پر تحقیق کے لئے وقت اور سنسکرت زبان سے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔اس کے علاوہ یہ تحقیق بین المضامین (interdisciplinary) بھی تھی اس لئے سائنسی حوالوں سے بھی معلومات اخذ کی گئیں اور ان کا دینی معلومات کے ساتھ موازنہ پیش کیا گیا۔البتہ یاد رہے کہ ہم نے کہیں بھی سائنس یا دیگر مغربی افکار کو دینی یا روحانی معاملات پر فوقیت نہیں دی۔اس کے برعکس ہم نے ثابت کیا ہے کہ سائنس جو حقائق آج سامنے لا رہی ہے دین روز اول سے اس کی عملی تصویر پیش کر چکا تھا۔

ہم نے یہ بھی بیان کیا کہ گزری صدیوں میں ان طاہر و مطہر مجالس نے ایک مضبوط رسی کا کام کیا جسے تھام کر حسینی قافلے نے صدیوں کا سفر طے کیا حتیٰ کہ وہ اکیسویں صدی میں داخل ہو گیا۔دوسرے یہ کہ مجالس امام حسینؑ نے ایک مرکز کا کام دیا جس کی وجہ سے شیعہ کمیونٹی آپس میں

منسلک رہی۔ تیسرے یہ کہ ان مجالس نے مضبوط قلعے کا کام دیا جس نے توحید، رسالت اور امامت کے عقائد کو غلو اور افراط و تفریط سے پاک رکھا۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ گزشتہ صدیوں میں مجالس امام حسینؑ کا کردار سفیر کربلا کا سا رہا ہے۔ انہوں نے کربلا کا پیغام ہر خاص و عام تک پہنچایا۔ اس کے علاوہ مجالس کا جلوس کے ساتھ بھی ایک خاص ربط رہا ہے۔ مجالس امام بارگاہ میں آنے والے مومنین و مومنات کے لئے اور جلوس سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں موجود عوام کے لئے برپا کئے جاتے رہے۔ ماتم حسینؑ جتنا غم اور احتجاج کی نشانی ہے اتنا ہی تبلیغ کا بھی علم بردار ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جلوس امام حسینؑ کا خوبصورت نظام غیر شیعہ کی توجہ کھینچنے کے لئے مرتب کیا گیا۔ اس کیعلاوہ جلوس امام حسینؑ نے شیعہ جوانوں کو بہترین ڈسپلن کی بھی تربیت دی۔ دنیا کے کسی جلسے یا جلوس کی مثال لے لیں نظم و ضبط، قیادت کی پیروی اور صبر و استقامت کی ایسی مثال نہیں ملتی جتنی مجالس اور ماتم امام حسینؑ میں ملتی ہے۔

ہم نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ مجالس امام حسینؑ تعلیم و تربیت کا بہترین ادارہ ہیں۔ جس طرح کسی اعلیٰ درجے کی اکیڈمی کے اثرات اس کے طلبا پر نظر آتے ہیں اسی طرح شیعیان علیؑ کے علم، اخلاق اور ظاہری ہیت سے مجالس امام حسینؑ کے صالح اثرات نظر آنے چاہئیں۔ ہم نے یہ بھی واضح کیا کہ کریم کربلا کے در پر آ کر جو مانگو وہ ملے گا۔ مثلاً دنیا مانگنے والے کو دنیا، آخرت چاہنے والوں کو آخرت اور اگر عشق کا معاملہ ہے تو سودائیوں کو اس مقام تک پہنچائیں گے جہاں تک کسی انس و جن یا ملک تک کا گزر بھی نہ ہوا ہو۔ لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ کریم کربلا کے دربار میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور نقصان کوئی نہیں۔ البتہ ایک قدرتی امر یہ بھی ہے کہ بعض اشیاء کا ملاپ بعض دوسری اشیا کے ساتھ نہیں ہوتا اور اگر انہیں آپس میں جوڑنے کی کوشش کی جائے تو نتیجہ نقصان کے طور پر نکلتا ہے۔ مثلاً مجلس امام حسینؑ شش کا جوڑ معصیت، حرص و ہوس، فسق و فجور، غنا اور فحاشی کے ساتھ نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ دو مخالف قطبین پر واقع ہیں۔ انہیں یکجا کرنے سے جسمانی اور روحانی عارضے لاحق ہوتے ہیں۔ جس طرح سفید لباس پر ایک چھوٹا سا داغ بھی واضح ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جہاں ایک جانب خالص حق اور سچ کھڑا ہو تو دوسری جانب جھوٹ یا ریا کا مہین سا ذرہ بھی توجہ کا باعث بن جاتا ہے۔ اس وجہ سے مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے والوں کو چاہیے کہ

بساط بھر معصیت سے دوری اختیار کریں تا کہ اکیری مکمل طور پر اثر انداز ہو کر تانبے کو سونا اور کوئلے کو ہیرے میں بدل دے۔

6۔5۔سفارشات

مندرجہ ذیل حصے میں ہم اس تحقیق سے اخذ کیے گئے نتائج کی روشنی میں چند سفارشات پیش کرتے ہیں۔

1۔مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرنے والوں کے لئے سفارشات

- مجالس امام حسینؑ پڑھنے، سننے یا برپا کرنے کے لئے سب سے پہلے خلوص نیت کی ضرورت ہے۔لہٰذا مجالس امام حسینؑ کے ساتھ منسلک ہونے سے پہلے اپنے دل، دماغ اور سوچ سے حتی لامکان ریا دور کرنے کی کوشش کریں۔
- مجالس امام حسینؑ میں پہنچ کرانا کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ متقی مومنین بھی اپنی مخصوص جگہ نہ ملنے پر برا محسوس کرتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح آفاق پر جگہ (space) کا تصور ختم ہوجاتا ہے بالکل اسی طرح ان آفاقی محفلوں میں بھی ہر سمت اور مقام برابر ہوجاتا ہے۔علاوہ ازیں اس عالم نور میں مادی درجات بھی بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔مثال کے طور پر وہاں پہنچ کر نہ تو کوئی ایڈووکیٹ ہوتا ہے اور نہ ہی جج۔دنیاوی لحاظ سے ہم چاہے کتنے ہی اعلیٰ عہدے پر فائز کیوں نہ ہوں، مجالس امام حسینؑ میں ایک غریب مومن ہم سے بہتر مقام پر بیٹھنے کا حق رکھتا ہے۔
- مجلس امام حسینؑ عجز وانکساری سکھاتی ہے۔مجلس امام حسینؑ میں شرکت کرنے والوں کی زبان، ہاتھ اور جسم کسی کو نقصان پہنچانے سے عاری ہوجانا چاہیے۔
- بعض اوقات مجالس امام حسنؑ ج میں بھی دنیاوی سکے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔معدودے چند مثالوں میں اہل ثروت حضرات یا جان پہچان والے مومنین کی آؤ بھگت کی جاتی ہے جبکہ نادار یا اجنبی مومنین کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔جبکہ امام کے گھر آنے والا ہر شخص مہمان ہے

اور سب کے لئے قابل قدر ہے۔

- معاملہ مجالس امام حسینؑ کا ہو تو ہم سب کو دیانت داری کے ساتھ اپنے کالر میں جھانکنے اور اپنی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔امام بارگاہ میں داخل ہونے کے بعد انسان کی دلی کیفیت بدل جاتی ہے اور دل معصیت سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔لیکن اہم تو یہ ہے کہ وہ جذبات کتنی دیر تک ہمارا ساتھ دیتے ہیں؟ عملی کوشش کریں کہ اس سرمائے کو ہوا میں تحلیل نہ ہونے دیں اور دعا ومناجات، تسبیح وتہلیل اور استغفار کے ذریعے اس خزانے کو دل وجاں کا حصہ بنالیں۔
- مجالس امام حسینؑ میں حاصل ہونے والی بصیرت کا کم از کم معیار کربلا کا اپنی آنکھوں کے سامنے واقع ہوتے ہوئے نظر آنا ہے۔اگر مجلس امام حسینؑ میں بیٹھ کر ہمیں کربلا نظر نہیں آتی تو اپنی ذات کا تجزیہ کریں کہ کہاں کمی رہ گئی ہے جس کی وجہ سے یہ ملکوتی نظارہ ہماری نظروں سے دور ہے۔

2۔ منتظمین مجالس کے لئے سفارشات

مجالس امام حسینؑ میں قوت باصرہ اور سامعہ بہت اہم ہیں۔مندرجہ ذیل حصے میں ان دونوں قوتوں کی تربیت کے لئے چند سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

- امام بارگاہوں میں چیدہ چیدہ مقامات پر شیعہ کی تعریف بیان کرنے والے فرمودات آویزاں کئے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ فروع دین کے بارے میں فرمودات لگائے جاسکتے ہیں۔
- امام عالی مقامؑ، بی بی زینبؑ اور امام سجادؑ کے خطبات کے اقتباسات آویزاں کئے جاسکتے ہیں جو قیام حسینؑ کا ہدف اور مشن واضح کریں۔
- اکثر اوقات سننے میں آتا ہے کہ نوجوانوں کی دلچسپی مجالس امام حسینؑ میں کم ہوتی جارہی ہے۔نوجوانوں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں رضاکارانہ کاموں میں شریک کریں تاکہ ان کے اندر احساس ذمہ داری کا اضافہ ہو۔بعض اوقات بزرگ حضرات کچھ اہم ذمہ داریاں نوجوانوں کے حوالے کردیتے ہیں۔مثلاً کمپیئرنگ کرنا، سیکورٹی کے فرائض سرانجام دینا،

پمفلٹ ترتیب دینا اور چھپوانا، انٹرنیٹ پر ویب سائٹ بنانا وغیرہ۔ دوسری جانب بزرگ حضرات کیشئر، نذر نیاز کی دیکھ بھال وغیرہ کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں۔

- مقامی امام بارگاہوں سے منسلک نوجوانوں کے درمیان قرآنی آیات اور فرمودات پر مبنی آرٹ کے مقابلے کروائے جاسکتے ہیں۔ ایسے آرٹ کو موضوعاتی بنایا جاسکتا ہے، مثلاً عید میلاد النبی، عید غدیر اور شعبان کے جشن وغیرہ۔ مقابلے کا انعقاد جشن سے پہلے اور تقسیم انعامات جشن کے دوران کروائی جاسکتی ہے۔ چنیدہ آرٹ کے نمونوں کو دوسرا مقابلہ منعقد ہونے تک امام بارگاہ میں آویزاں کیا جاسکتا ہے۔
- انسان تربیت میں صوتی اثرات کی خاص اہمیت ہے۔ ویسے تو مجالس امام حسینؑ مکمل طور پر صوتی اثرات کی حامل ہوتی ہیں لیکن دور جدید کی ڈیجیٹل سہولیات کو بروئے کار لاتے ہوئے ان میں خاطر خواہ تنوع پیدا کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مجالس کے باقاعدہ آغاز سے پہلے چیدہ چیدہ فرمودات وغیرہ کی وڈیو یا آڈیو چلائی جاسکتی ہے۔ کمیونٹی کے نوجوان اس سلسلے میں خود تحقیق کر کے وڈیو یا آڈیو تیار کرسکتے ہیں۔ البتہ ان جہتوں کو ایمان، احتیاط اور بزرگوں کی سرپرستی میں سرانجام دینے کی ضرورت ہے۔ نوجوانوں کی بنائی ہوئی آڈیوز اور وڈیوز کا مقابلہ کروایا جاسکتا ہیاور اول، دوم اور سوم آنے والی کاوشوں کو ایک خاص وقت کے لئے امام بارگاہ میں نشر کیا جاسکتا ہے۔

3۔ محققین اور مدرسی مضامین کے لئے سفارشات

اہل تشیع کے دینی مدارس میں دنیاوی تعلیم سے آراستہ نوجوانوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دینی مدارس سے فارغ شدہ علماء میں سیکولر یونیورسٹیوں میں داخلہ لے کر پی ایچ ڈی کا رواج بھی عام ہوگیا ہے لیکن فی الوقت یہ افراد مذہبی فورم سے عوام الناس کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ خدمات گراں قدر ہیں لیکن ہمیں معاشرے میں پھیلی لادینیت سے مقابلہ کرنے کے لئے مزید جرآت مندانہ اقدامات کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ کہ:

- اہل تشیع بچوں کے لئے ایسے پرائمری اور ہائی اسکولوں کی ضرورت ہے جہاں دنیاوی

کے علاوہ دینی تعلیم وتربیت کا بھی انتظام ہو۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے فوجی اکیڈمی ساتویں جماعت سے بچے کو داخلہ دیتی ہیں اور انہیں تعلیم کے ساتھ فوجی تربیت بھی دیتی ہیں۔ ایسے اداروں سے فارغ التحصیل بچے اپنی مضبوط دینی بنیاد کی وجہ سے معاشرے کا روحانی خلا پر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔

- دینی درس گاہوں میں سال یا دو سال کے بنیادی نصاب کے بعد طلبا کو انتخاب کا حق دیا جائے کہ وہ چاہیں تو اپنی دینی تعلیم مکمل کریں یا دنیاوی تعلیم کے اداروں میں منتقل ہو جائیں۔ اس طرح بہترین دینی بنیاد کے ساتھ ماہر تعلیم، ڈاکٹر اور سائنسدان تیار کئے جا سکتے ہیں۔ ایسے طلباء کی وظائف کے ذریعے حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے۔

- دینی مدارس اور طب کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ فلسفہ یہ تھا کہ ایک طبیب معاشرے میں رچ بس جاتا ہے اس لئے وہ آسانی سے مذہب کی ترویج کر سکتا ہے۔ بدھ بھکشو اور عیسائی مشنری بھی اکثر اوقات طبیب ہوا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے طب نبوی کے ذریعے نہ صرف بیمار انسانیت کی خدمت کی بلکہ دین اسلام کی بھی ترویج کی۔ امام خمینی نے علماء کو قدیم اور جدید طب کی معلومات اکٹھی کرنے کا منصوبہ سونپا تھا جس کے نتیجے میں نہ صرف قابل قدر معلومات اکٹھی کر کے شائع کی گئیں بلکہ کئی ایک علماء نے طبیب کی باقاعدہ ڈگری بھی حاصل کی۔ تاہم ان علماء کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ انہی خطوط پر کام کرتے ہوئے دینی مدارس طلباء کو طب کی ترغیب دے سکتے ہیں اور دلچسپی رکھنے والے طلباء طب کے کالجز میں داخلہ لے کر باقاعدہ طبیب کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔

- ہمیشہ کی طرح آج بھی ہمیں شیعیت کے استحکام کے لئے علماء کی اشد ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ ہمیں ایسے سخت کوش مجاہدین کی بھی ضرورت ہے جو دنیاوی فورم پر بیٹھ کر دینی تعلیم و تحقیق کے فرائض سر انجام دے سکیں۔ اس کے علاوہ وہ بین المذہبی اور بین المضامین فورم پر بھی کام کر سکیں۔ ایسی مضبوط دینی بنیاد رکھنے والے افراد نہ صرف معاشرے کی رگوں میں سرایت کر کے بے روح معاشرے کو روحانی صلاحیتوں سے آشنا کرنے کا باعث بنیں گے بلکہ متفرق گروہوں میں افہام تفہیم کی فضا بھی قائم کریں گے۔ ان شاء اللہ

- اس کے علاوہ پیور(خالص)اور سوشل سائنس سے تعلق رکھنے والے ماہرین مثلاً سائنس دان، ڈاکٹر حضرات اور ماہرین تعلیم کو اپنے شعبوں کے مطابق بین المضامین تحقیق کی جانب راغب کیا جاسکتا ہے۔
- دینی درس گاہوں میں بین المذہبی مضامین تنقیدی جائزہ کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ان مضامین میں موازنہ اور مماثلت کے ذریعے مزید بہتری لائی جاسکتی ہے۔
- دین اور سائنس پر بحث کرنے کے لئے دینی مدارس میں سائنسی ماہرین کو ایک آدھ لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا جاسکتا ہے یا تربیتی ورکشاپ منعقد کروائی جاسکتی ہے جس میں سائنسی ماہرین، سائنس اور دین کی مماثلت کو واضح کریں۔اس کے علاوہ بین المذہبی اور بین المضامین کانفرنس منعقد کی جاسکتی ہیں۔
- ان امور کے لئے دینی درس گاہوں کے روابط دیگر قومی اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں کے ساتھ بڑھانے کی ضرورت ہے۔اس سلسلے میں تعلیم کی منسٹری کے ساتھ روابط بڑھانے اور مختلف یونیورسٹیوں کے ساتھ ایم او یو (Memorandum of understanding) دستخط کرنے کی ضرورت ہے۔یہ ایک مشکل امر ہے لیکن مختلف النوع طاغوتی ہتھکنڈوں کے مقابلہ کے لئے ہمیں ہنگامی کاروائیوں کی ضرورت ہے۔شیطانی قوتوں نے مختلف اقوام، مذاہب اور مکاتب فکر میں نفرت کا زہر بھر دیا ہے۔اس زہر کے اثر کو کم کرنے کے لئے ہمیں بھی معاشرے کی جڑوں تک پہنچنے کی ضرورت ہے۔
- اس تصنیف میں لادینیت کے چند بانیوں کا جدید نظام تعلیم پر اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔لیکن اس بحث کے کئی ایک پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔مثلاً سترہویں 1700ء یا اٹھارویں 1800ء صدی عیسوی کے مخصوص تاریخی حالات جس میں کرسچین چرچ اور سیاسی قیادت کے بے لچک رویئے کی وجہ سے معاشرے میں بے چینی پھیلی اور دین سے انحراف کیا گیا۔فی زمانہ اس موضوع پر تحقیق کی ضرورت ہے، تاکہ ماضی کے حالات سے سبق حاصل کیا جائے اور مستقبل کے لئے بہتر لائحہ عمل تیار کیا جائے۔

استغاثہ بحضور امام العصر عجل اللہ فرجہ

مذکورہ بالا حصے میں ہم نے بیان کیا کہ گزری صدیوں میں مجالس امام حسن نے ہمیں کربلا کا پیغام بھلانے نہ دیا۔ عاشقان حسینؑ نے ذکر، فکر، ماتم اور عملی نمونہ کے ذریعے اس پیغام کو نسل در نسل منتقل کیا۔ مجالس امام حسینؑ نے روح کی اس چنگاری کو جلائے رکھا جو منتظر ظہور ہے۔ اسی چنگاری نے عاشقان کو دریاؤں کے دھارے پر الٹا چلنا سکھایا۔ قید و بند کی صعوبتوں میں مسکراتے لب عطا کئے۔

اے وارث کربلا!

اے ذات معطر!

اے مومنوں کے دلوں کی آخری امید!

اے غمگین دلوں کو خوشی و سرشاری عطا کرنے والے!

اے خدا کا وہ وعدہ جو پورا ہو کر رہے گا۔

آپ غلامان حسینؑ کے صدیوں کے سفر کے چشم دید گواہ ہیں۔

اس قافلہ عشق کا آغاز کربلا کی تپتی ریت پر پڑے سر بریدہ لاشوں سے ہوا، جبکہ صحرا کی فریاد کناں ریت مغرب سے مشرق اور شمال سے جنوب کو اڑتی تھی اور تطہیر رسالت کے جواہرات کو ڈھانپتی تھی۔

وہ دن اور آج کا دن کون سی راہ ہے جس سے ان سرفروش عاشقوں کا یہ قافلہ نہ گزرا ہو؟

ہمارے سروں پر عمارتیں تعمیر کی گئیں۔

ہم نے ہجرت کی صعوبتیں برداشت کیں۔

ہماری بستیوں کی بستیاں اجاڑ دی گئیں اور مکینوں کو پہاڑوں سے دھکے دے کر گرایا گیا۔

ہمیں بندوق، پتھروں، چھری و چاقو اور بم کے دھماکوں سے قتل کیا گیا۔

عاشور آج بھی جاری ہے۔ھل من ناصر ینصر نا۔ کی صدا آج بھی آرہی ہے۔لیکن وفا کا بہتا ہوا یہ پرشور دریا، نہ رکا، نہ جھکا، نہ دبا۔ یہ سیل رواں چلتا رہا اور آپ تک پہنچنے میں اس کی رفتار میں اضافہ تو ہوگا لیکن کمی نہ آنے پائے گی۔

ہمارے لبوں پر، دلوں میں اور ہماری روح پر نام حسینؑ لکھا ہے اور لکھا رہے گا یہاں تک کہ ہم آپ سے یا آپ کے جد امجد سے جا ملیں۔

ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ چودہ سو سال سے غیبت میں احکام الٰہی کی پابندی فرماتے ہیں۔

آپ قیام وقعود کرتے ہیں۔

رکوع وسجود کرتے ہیں۔

آپ نے ہر دور کے مومنین کے حالات سے واقفیت رکھی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کی نصرت فرمائی۔آپ نے ہر دور کے شہیدوں کی لاشیں اٹھائیں،

مومنین کی نماز جنازہ میں شرکت فرمائی اوران کی نماز وحشت کا انتظام کیا۔

آپ ہمارے آس پاس موجود رہتے ہیں لیکن ہماری ناقص قوت بینائی آپ کو دیکھنے سے قاصر ہے۔

آپ کی دل نشیں آواز انہی فضاؤں میں گونجتی ہے لیکن ہماری گناہگار قوت سماعت اس کا ادراک نہیں کر پاتی۔

فریاد ہے آقا فریاد!

ہم گناہگار فریاد کناں ہیں۔

یا صاحب العصر والزماں عج! آپ کو صدا دیتے دیتے دل فگار ہو گیا ہے۔

آپ ظہور فرمایئے تا کہ دل شکستوں کا سفر ختم ہو اور وہ آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔

زمین اپنے پوشیدہ خزانے اگل دے۔

تاریخ وثقافت کی ویران گلیاں نورانی ضوء سے جگمگا اٹھیں۔

آپ اللہ کے حکم سے ظہور فرمایئے تا کہ پیاسی آنکھیں آپ کا دیدار حاصل کر سکیں۔

گنہگار قوت سماعت آپ کی آواز سے فیض یاب ہو اور قوت شامہ آپ کے معطر وجود کی خوشبو پا سکے۔ آپ کے عاشقان صدیوں سے سروں پر خاک ڈالے، برہنہ پا آپ کے دیدار کی خواہش دل میں لیئے سرگرداں پھرتے ہیں۔

نگر نگر، گلی گلی، کوچہ کوچہ، اب تو یہ حال ہے کہ وقت آخر آن پہنچا اور آپ کے دیدار کی پیاس، حشر کا سماں پیش کرتی ہے۔

کاش کہ ہم وہ وقت دیکھیں جب چشم تصور سے نہیں بلکہ اپنی گنہگار آنکھوں سے آپ کا دیدار کریں اور اپنی ظاہری قوت سماعت سے اپنے سلام کا جواب سنیں۔ ہم آپ کو عریضہ ارسال کرتے ہیں جواب آتا ہے۔

لیکن اے کاش کہ ہم یہی عرضیاں اپنے گناہگار ہاتھوں سے آپ کی خدمت میں پیش کریں اور آپ کی تراشیدہ انگلیوں کو اپنی عرضیوں پر دستخط کرتا ہوا دیکھ سکیں۔

اس مختصر تحریر میں چند ایک گناہ گاروں نے مل بیٹھ کر اپنا دل چیرا اور آپ کے حضور پیش کر دیا۔ اچھا برا، صحت مند یا بیمار، اپنی ذات کا ہر رخ آپ کو دکھا دیا۔ ہر غم، پریشانی اور ہر عزم آپ کے حضور پیش کر دیا۔

آپ عج طبیب ہیں آقا، جہاں کمی رہ گئی ہو وہاں اشارہ فرمایئے جہاں کجی رہ گئی ہے وہاں ہدایت فرمایئے۔ جہاں تربیت کی ضرورت ہے وہاں ہماری تربیت کا انتظام کیجئے۔ آمین ثم آمین

ضمیمہ اول

قصیدہ روضہ پاک بی بی معصومہ قم

وقتی غمگین شدم به زیارت معصومه مشرف شدم

وقتی خوشحال شدم به مزار معصومه سلام کردم

وقتی نگران شدم به زیارتگاه معصومه نگاه کردم

وقتی ضعیف شدم از حرم معصومه قوت گرفتم

وقتی تنها شدم رفیق در آرامگاه معصومه پیدا کردم

وقتی عشق می خواستم به حرم معصومه خیره شدم

من خانه ای نداشتم، زندگی یک سرگردان و غریب،

تا اینکه در حرم معصومه مسکن را پیدا کرد

جدول 1: حصہ اول کے شرکاء تحقیق کے کوائف

کوڈ	عمر	جنس	تعلیم	پیشہ
ش1	56	عورت	پی ایچ ڈی	اسسٹنٹ پروفیسر
ش2	45	مرد	پوسٹ پی ایچ ڈی	ڈاکٹر
ش3 (اے پی)	35	عورت	ایم فل	اسسٹنٹ پروفیسر
ش4	75	عورت	ایم اے	ڈائریکٹر ریڈیو
ش5	42	مرد	ایم بی اے	عالم دین
ش6				
ش7	37	عورت	پی ایچ ڈی اسکالر	گھریلو
ش8	47	عورت	پی ایچ ڈی	(اے پی)
ش9	54	عورت	پی ایچ ڈی اسکالر	(اے پی)
ش10		عورت	ایم بی بی ایس	ڈاکٹر
ش11	43	عورت	پی ایچ ڈی	ریسرچر
ش12				
ش13	39	عورت	ایم اے	(اے پی)
ش14	39	عورت	ایم اے	(اے پی)
ش15	38	عورت	ایم اے	(اے پی)
ش16	---	عورت	--	گھریلو
ش17	50	عورت	پی ایچ ڈی	(اے پی)

جدول 2: حصہ دوم کے شرکاءِ تحقیق کے کوائف

کوڈ	عمر	جنس	تعلیم	پیشہ
م1	55	عورت	ایم اے	عالمہ
م2	45	مرد	بی اے	سرکاری ملازم
م3	36	مرد	گریجویٹ	ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ
م4	36	مرد	ایم اے	عالم
م5	35	عورت	میٹرک	گھریلو
م6	36	عورت	کالج	گھریلو
م7	51	مرد	بی اے	پاک فوج
م8	47	عورت	NA	گھریلو
م9	46	عورت	NA	گھریلو
م10	56	مرد	بی اے	سرکاری
م11	50	عورت	NA	گھریلو
م12	06	بچی	سکول	طالبہ
م13	12	بچی	سکول	طالبہ
م14	51	عورت	ایم اے	عالمہ
م15	52	عورت	گریجویٹ	گھریلو
م16	52	عورت	گریجویٹ	ایڈمن
م17	55	عورت	گریجویٹ	عالمہ
م18	57	عورت	گریجویٹ	گھریلو
م19	40	عورت	NA	گھریلو

م20	22	مرد	کالج	طالب علم
م21	19	عورت	کالج	طالبہ
م22	45	مرد	پوسٹ ڈاک	ڈاکٹر
م23	55	عورت	پی ایچ ڈی	(اے پی)
م24	64	مرد	ایم اے	ڈائریکٹر
م25	54	عورت	ایم فل	(اے پی)

Notes and Bibliography

i

سید محمد رضی الدین۔روح کا عالمی تصور

ii

Mark, J. J. (2020). The Vedas. Ancient History Encyclopedia.

Iii

Al Kafi, K. (2017) On Ruh, Qalb, Nafs and Aql: Creation of Ruh, Nafs, Qalb and Aql, their Behaviours. Published independently.

iv

Rajaei, A. L. (n. d) "Religious, cognitive-emotional therapy: A new form of psychotherapy. Iranian Journal of Psychiatry.

v

The Sophists (Ancient Greek). (n.d.) Internet Encyclopedia of Philosophy. Retrieved from iep.utm.edu/sophists on Novembet 5, 2020.

vi

Hume,D.(2007) An Enquiry Concerning Human Understanding.Edited with an introduction and notes by Peter Millican. Oxford University Press.

vii

Hume, D.(1757) Dialogues Concerning Natural Religions. In Natural History of Religion.

ix

Stanford Encyclopedia of Philosophy (2001) David Hume. Empiricist.

x

Stanford Encylooedia of Philosophy.(2003) Karl Marx. Retrieved from plato.stanford.edu/ on October 10, 2020.

xii

Stanford Encyclopedia of Philosophy (1995) Burtrend Russel.

xiii

Montessori, M. (1912) The Montessori Method: Scientific Pedagogy as Applied to Childhood Education in The Childhood Houses with editions and revisions by Author.

Translated by George, A. E. Newyork. Fredrick A. Stokes Company.

xiv

Nova, S. (2005) New study: Human hands, feet and forehead emit light. Current journal of photochemistry and ohotobiology.

xv

Rogers, C. (1961) On Becoming a Person: A Therapists View of Psychotherapy. London.

xvi

Dream: The Bible in the Middle Ages (n.d.). Retrieved from science.jrank.org/ pages on November 10, 2000.

xviii

Doufesh, H, et al (2014) " The Effects of Muslim Prayer (salat) on an Electroencephalography and its Relationship with Autonomic Nervous System Activity". Journal of Alternative and Complimentary Medicine.

xix

Ida, P. Rolf. Structural Integration, Gravity, an Unexplored Factor in a More Human use of Human Beings.

xxi

Chandler, J. (2012) The Last Laughing Death. The Global Mail.

xxii

Holub, M. (1989) Vanishing Lung Syndrome. Retrieved from Compleye-review.com on October 7, 2020

xxiii

Elizebeth, N. O. (2016) Spirituality of Psychology. University of Eastern Africa. Kenya.

xxiv

Blanke et al. (2004) Out of Body Experience and Autoscopy of Neurological Origin. Brain 127.

xxv

Koch, C. (2020) Tales of Dying Brain. Issue of Scientific American.

xxvi

New York Times. (Sept. 4, 1997.) Dr. V. E. Frankle of Vienna, Psychiatrist

of the Search for Meaning.

xxvii

ہمفرے کی یادداشتوں کے نام سے یہ کتاب 1980ء کی دہائی میں منظرعام پر آئی۔ یہ کتاب کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے عوام میں مقبول ہوگئی۔ البتہ آج یہ کتاب کم یاب ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں میں تفرقے کو ہوا دینے کے لئے لکھی گئی۔

I Emerson, R. (1960). From Empire to Nation. Beston. M A: Beacon Press .

ii Sanami, S.K. (2011). Memories of Hazrat Ali. Almustafa International Translation and Publication Centre. P. 21.

xxx

Huen, H. (1986). City of 10,000 Buddhas. Water Mirror Turning Back Heaven, Manjushri Boddhisatva. Vajra Bodhisea.

xxxi

Fogel, J. A. (gen.ed.) (2003). Buddhism, Diplomacy and Trade: The Realignment of Sino-Indian Relations, 600-1400. Association for Asian Studies and University of Hawai Press.

xxxii

Bhikku, D.M. (1914). A Pilgrimage to China. Bhikku Association Mahasthavir. Katmandu. (English tr. 1999).

xxxiii

Osborn, M. B. (2012). Chasmus in the Early Prajnapalam, Parallelism Connecting Criticism and Hermeneulismin an Early Mahayana Sutra. University of Hong Kong.

xxxiv

Jufy, L. (2002). The Sharp Sword of Prajna. Shambhala Sun. May 2002.

xxxv

The Tibetan Book of Dead. (2007). First Completed Translation by Padma Sambhava. Trasnslated by Gyurme Dorje. Penguin Books.

xxxvi

Jaini, P. S. et al (2001). Collected Papers in Buddhist Studies. Motilal Banarsidas Publications Private Limited.

xxxvii

James, M. (2017). Roots of Yoge. Penguins Book

xxxviii

مثال کے طور پر دیکھئے

Tournier, V. (2014). "Mehakasyapa, His Lineage, and the Wish for Buddhahood. Reading Aknew the Bodhgaya Inscriptions". Indo- Iranian Journal. 57 (1-2): 2-60.

xii

.Lagirarde, F. (2006). "The Nibbana of Mahakasyapa the Elder", in Leningard, F; Keonuntakoel, P. C (eds), Buddhist Legacies in Mainland Southeast Asia. Mentalities, Interpretations and Practices, Escale Fransaise dExtreme-Orient and Siridhorn Anthropology Centre.

Xiii

. Kim. S. (2011). "Awakened, Awaiting, or Meditating?: Readdressing a Silla Period Image from the Buddha Valley on Mount Nsm", Journal of Korean Studies, 16 (1): 119-150.

xiv

. Roerch, N. (1974). Altai Hmaliya. Church of Scientology of California Publications. Org. USA.

xl

Shao-Yun Yang (n.d.). Making Sense of Messianism. Buddhist Political Ideology in the Mahayana Rebellion and the Moon Light Child Incident of Early Sixth Century China.

xv

.Yin, M. (2012). The Future Chakravartan- Maitreyana Soteriology in Early Chins. M.S. Thesis. Lowa Research Online. University of China.

xvi

.Penguin (1959). Buddhist Scriptures Selected and Translated by Edward Conze. Penguin Harmondsworth. Reprint.

☆☆☆

حرف تحسین

ڈاکٹر عالیہ جواد جواب تک ایک مستند استاد کے طور پر پہچانی جاتی تھیں اب ہم ان کا نیا روپ دیکھ کر حیران ہیں ڈاکٹر صاحبہ کی کتاب "بین المذہبی تناظر میں روحانیت اور حسینیت" محبت اہل بیتؑ میں لکھی گئی ایک خوبصورت تحریر ہے۔ جس میں تحریر کے جدید معیار اور روزمرہ کی زندگی شانہ بشانہ چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کتاب میں جہاں فلسفہ اور مذاہب کا جائزہ لیا گیا ہے وہاں پر اسلام کا وسیع تناظر بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عالیہ جواد صاحبہ امیدِ نو کی پیامبر ہیں خدا کرے کہ ڈاکٹر صاحبہ درس و تدریس کے ساتھ روحانی تصانیف کی بھی شہ سوار ثابت ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد جاوید اقبال

ڈین سوشل سائنسز (ر) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

سوہنی پبلی کیشنز

کراچی۔ لاہور

سوہنی پبلی کیشنز
کراچی۔لاہور